پاکستانی انقلاب
کے مسائل

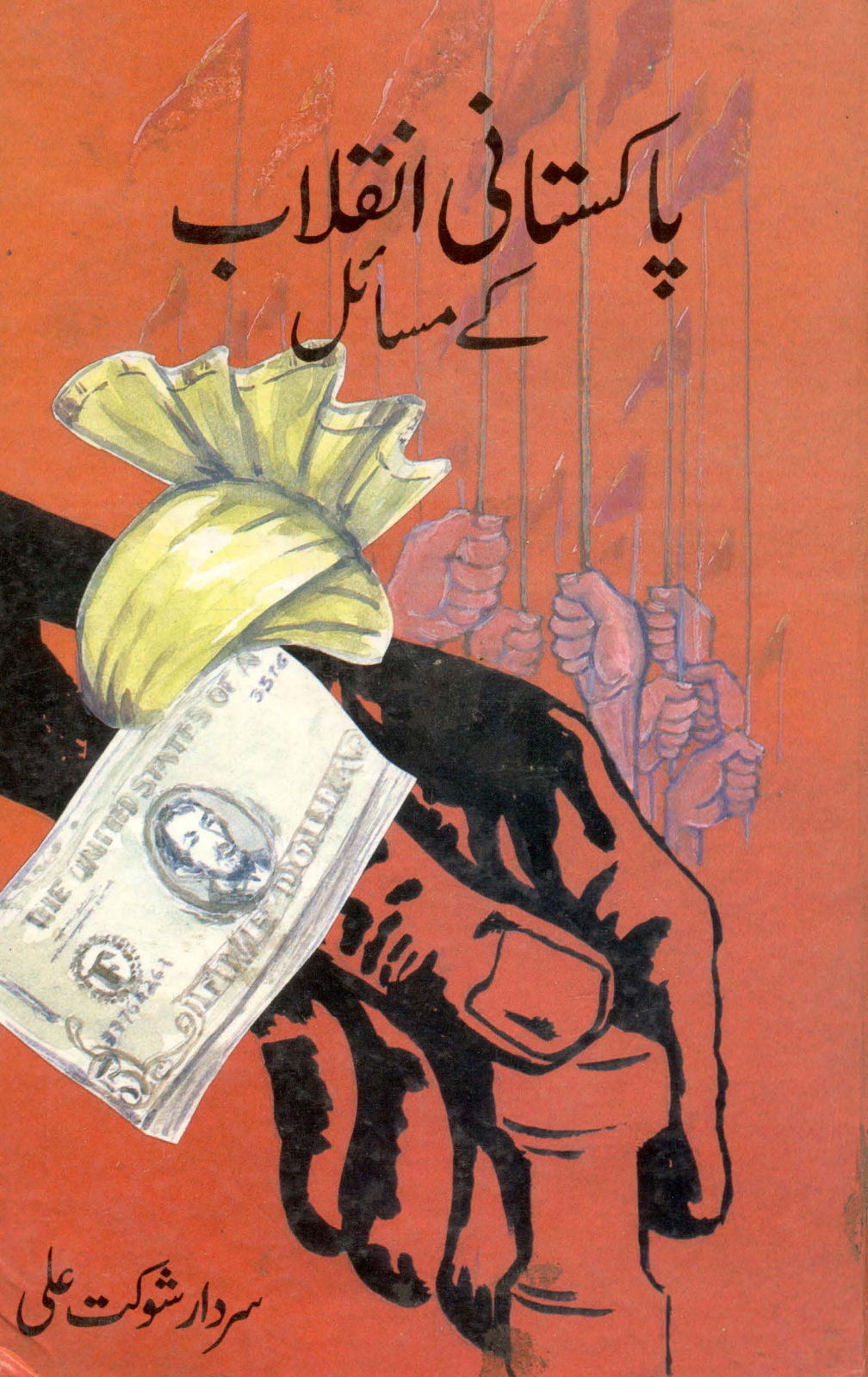

سردار شوکت علی

پاکستانی انقلاب کے مسائل

سردار شوکت علی

فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب = پاکستانی انقلاب کے مسائل

مصنف = سردار شوکت علی

پبلشرز = فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ' لاہور

فون : 7249218-7237430

پروڈکشن = ظہور احمد خاں/ رانا عبدالرحمٰن

معاون = ایم سرور

کمپوزنگ = فکشن کمپوزنگ سنٹر' لاہور

پرنٹرز = زاہد بشیر پرنٹرز' لاہور

سرورق = یوسف

اشاعت = 2002ء

قیمت = -/200 روپے

انتساب

ان سیاسی کارکنوں کے نام
جنہوں نے نہایت ہی نامساعد حالات میں
پاکستانی سماج کو بدلنے کے لئے
مقدور بھر قربانیاں دیں

فہرست

دیباچہ	7
پیش لفظ	11
پاکستانی سماج انقلاب کے کس دور میں ہے؟	19
عوامی جمہوری اور قومی جمہوری انقلاب کی اصطلاحیں	44
جمہوریت کا واحد راستہ	55
زرعی اصلاحات	154
زمینداری نظام کا خاتمہ کیوں ضروری ہے!	178
قوموں کے حق خودارادیت کا مسئلہ	201
موجودہ پاکستان میں قوموں کے مسائل کا حل	233
نیا عالمی نظام	236
"نیا عالمی نظام اور اوکلے کی وضاحتیں"	253
نئے عالمی نظام کے کردار سے پردہ اٹھتا ہے	264

تیسری دنیا کا مقدر 269
ضمیمہ : پینٹاگان کا نیا عالمی نظام 290
پاکستان میں ڈالر کی یلغار 291
نج کاری کیوں؟ 309

دیباچہ

میری اور میرے ہم خیال دوستوں کی ایک مدت سے دلی آرزو تھی اور ہم اکثر اس کا اظہار سردار شوکت علی سے کیا کرتے تھے کہ وہ نصف صدی پر محیط انسانیت کو درپیش مسائل کے بارے میں اپنی سوچ اور فکر کی روشنی میں مختلف اوقات پر شرح وبست کے ساتھ اظہار خیال کرتے رہے ہیں اور برصغیر اور خصوصی طور پر پاکستان میں ازادی سے پہلے اور آزادی کے بعد رونما ہونے والے واقعات اور حوادث کا تجزیہ کرتے اور ان سے پیدا شدہ نتائج کے لئے عوام کو بیدار اور متحرک کرتے رہے ہیں۔ وہ موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسا مفید اور قیمتی اثاثہ ہیں جن سے روشن خیالی' خرد مندی اور وسیع الامشربی کی روشنی سے اپنے عمل و فکر کی راہیں استوار کرنے میں گرانقدر استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔

مقام مسرت ہے کہ انہوں نے ہمارے اس دیرینہ مطالبہ اور خواہش کو پورا کرنے کے لئے اپنی ساری تحریروں کو یکجا کرکے کتابی شکل دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ ان کے اس مجموعہ افکار کے بارے میں بطور تعارف اپنی رائے کا اظہار کروں۔

زیر نظر اس مجموعہ گراں بہا پر رائے زنی کرنے سے پہلے میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں سردار شوکت علی کی شخصیت اور کردار کے بارے میں اظہار خیال کروں۔ کیونکہ ان کے ذہن اس کی ساخت اور پرداخت کے دیگر پہلو جانے بغیر ان کے افکار کی گیرائی' گہرائی اور اثر پذیری کو جانچا نہیں جا سکتا۔ اور ان کی افتاد طبع جو ان کے اپنے مسلک اور عشرب خلوص جان کی بیتابی اور تڑپ اور ان کے دل کے سوز و گرمی ان کی تحریروں پر نقش کئے ہوئے ہیں۔ اور میری خواہش کے مطابق دوسروں کو خاطر خواہ طریقے سے متاثر کریں۔ ان کے دل میں انسان کی آزادی آدمیت کے احترام اور سب کے لئے انصاف حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔ مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں ان کے بارے میں ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے میں جو آداب میری معاونت کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ان کا ذکر کروں۔

سردار شوکت علی ہمارے ضلع کے نہایت ہی معزز' شریف' باوقار اور عوام دوست آرائیں قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دنیاوی لحاظ سے قدرت نے انہیں وسائل رزق کی فراوانی سے نوازا ہے۔ انہیں جابر اور استحصالی قوتوں کے خلاف اپنی ذات کے لئے جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کہ وہ اپنی مادی ضرورتوں کی کفالت کے لئے ان کے خلاف نبرد آزما ہوتے یا سیاسی لحاظ سے روایتی انداز میں اپنا ذاتی قد بڑھانے میں کاوشیں کرتے۔ کیونکہ ان کا خاندان ضلع کی سیاست میں موروثی طور پر قابل قدر مقام پا لینے کے لئے ایک سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں اور میرے ایسے لاتعداد کارکن جو ضلع لاہور کے نچلے کسان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے' سر اونچا کرکے ان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ لیکن قدرت نے سردار شوکت علی کو ایک انقلابی فطرت سے نوازا تھا۔ وہ نہ صرف اس خطہ کے مجبور' محکوم' محروم اور مقہور طبقوں کے عوام کی ہر قسم کی غلامی کو ختم کرنے کی تڑپ رکھتے تھے اور عالمی سامراج اور اس کے ایجنٹوں میں برصغیر کی عوام کو جس طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ ان کو توڑنے اور عوام کو ان کے بنیادی حقوق دلانے کا ایک بے پناہ' جذبہ اور احساس رکھتے تھے۔ انہوں نے ایام جوانی میں قدم رکھتے ہی مردانہ وار جدوجہد کا آغاز کیا اور اپنے آپ کو انسانیت کی سربلندی کے لئے وقف سرفروشوں اور جان نثاروں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑا تھا۔ ان کے اس انقلابی عمل سے ایسے رویوں نے جنم لیا جن کے مطابق لازمی طور پر ایک نہایت ہی دلکش اور قابل اعتماد شخصیت کا روپ دھارتے چلے گئے۔ میرے ایسے لاتعداد کارکنوں کے نزدیک وہ ایک رول ماڈل کی حیثیت حاصل کرتے چلے گئے۔ اور آج کم و بیش 50 سال قبل ہمارا ان کے ساتھ ایک رومان پرور محبت اور احترام کا رشتہ قائم ہو گیا کسی انقلابی موقف پر دائمی طور پر قائم رہنا اور ہر نفع و نقصان سے بے نیاز ہو کر اس کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل رہنا اس موقف کی صداقت دلیل آخر ہوا کرتی ہے۔ سردار شوکت علی آج بدستور انہیں ابتدائی انقلابی افکار کے مطابق انسانیت کی نجات کی راہ پر رواں دواں ہیں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ان کی تحریروں سے سب کے قلوب و اذہان پر یہی نقش ثبت ہوں گے۔

سردار شوکت علی نے سیاست' معیشت' معاشرت' آئین اور اجتماعی عدل کے مسائل پر کتابیں اور کتابچے تحریر کئے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اس خطہ کے عوام کو درپیش مسائل پر وضاحت سے ذکر کیا ہے بلکہ پاکستان کی حکمران قیادتوں اور حکمران طبقوں کے ہاتھوں جس

طرح ہر گوشہ زندگی میں تضادات نے جنم لیا ہے اور تحریک پاکستان کے بنیادی مقاصد سے انحراف اور روگردانی کی وجہ سے پاکستان جن لاتعداد اذیت ناک بحرانوں سے دوچار ہوا ہے' ان تمام اثبات محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ وضاحت سے ان کے حل کی ناگزیر تدبیروں کی وضاحت کی ہے ان کو جانے بغیر کوئی بھی انسان دوست اور وطن پرور شہری اختلاف نہیں کر سکتا۔ ان کو یہ سیر حاصل تبصرے اور تجزیے اس لئے کرنا پڑے کہ حکمران طبقوں نے نہایت فریب کاری اور جانبازی سے عوام کو بنیادی سیاسی تصورات کے بارے میں ذہنی انتشار میں مبتلا کر رکھا تھا اور بدستور کر رکھا ہے جمہوریت اور انسانی آزادی کا وہ تصور جن سے ان کا اختیار اور اقتدار مستقل طور پر قائم رہے' ان کے جواز کے لئے کبھی اسلام کی سربلندی اور عوام کی حکمرانی کا گمراہ کن نظریہ پیش کیا ہے۔ آزادی کے اول روز سے نسل' قبیلہ' رنگ' زبان' عقیدہ اور علاقہ کی تفریق پر جاگیرداروں' وڈیروں' گماشتہ سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں نے عالمی سامراج کی غلامی کا راستہ اختیار کیا اور ان کی مدد سے قومی وسائل دولت کو لوٹا۔ جمہوری قدروں کو پامال کیا۔

عدلیہ' مقننہ اور انتظامیہ کے اداروں کو تباہ برباد کیا---- اور انہیں مطلق العنان شاہی سے جبر' شدت اور بے انصافی کے ذریعے عوام کو ان کی انسانیت سے محروم کیا۔ سردار شوکت علی نے عملی جدوجہد کے ذریعے وکیلوں' دانشوروں' محنت کشوں اور سامراج مخالف قومی اور بین الاقوامی تنظیموں سے اشتراک عمل کرکے ان انسان دشمن عناصر کے خلاف مسلسل اور متواتر جدوجہد کی ہے کوئی بھی پاکستانی شہری جس کو قدرت نے اپنی عزت نفس کے احساس سے بہرہ ور کیا ہے ان تمام انسانوں کی آزادی کا جذبہ موجزن ہے وہ ہر باطن قوت سے حق کی حکمرانی قائم کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور تمام انسانوں کو ہر تفریق سے بالاتر ہو کر یکساں طور پر احترام کا مستحق سمجھتا ہے' وہ سردار شوکت علی کے اس قابل فخر کردار سے نیا حوصلہ اور نیا زندگی بخش پیغام حاصل کرے گا۔

یہ بھی خوشی کا مقام ہے کہ سردار شوکت علی نے اپنی تخلیقات کے اس مجموعے کو خود طبع کرانے کا قدم اٹھایا ہے یقینی طور پر ان کی ہر خدمات خاطر خواہ نتائج پیدا کریں گی۔

یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی جاننا چاہے اور ایسا جانے بغیر کوئی شخص روشن خیال' ہوشمند اور حقیقت شناس نہیں ہو سکتا کہ اسے ان حقائق کا ادراک کرتا ہوگا کہ پاکستان کی تحریک آزادی کے بنیادی اسباب کیا تھا۔ ان مقاصد کے مطابق پاکستان کو تعمیر کرنے

کی تدابیر کیوں نہ اختیار کی گئیں۔ کن برسراقتدار عناصر نے عوام کی حکمرانی اور قانون کی بالادستی سے انحراف کیا' ان کے مفادات کیا تھے۔ انہوں نے اپنی حکمرانی کو دوام بخشنے کے لئے کون سے حربے اختیار کئے۔ عالمی سامراج نے پاکستان جیسے تیری دنیا کے ممالک کو اپنے اقتصادی سامراج کے ذریعے کس طریقے سے اپنی گرفت میں لیا۔ عوام کو کس طریقہ سے رعایا کے طور پر رکھا گیا۔ ان کو کس طریقہ سے فریب دیئے گئے۔ آج پاکستان سیاسی' اقتصادی' معاشرتی اور آئینی لحاظ سے کس طرح متفقہ وفاقی دستور 1973ء کے تقاضوں کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے ناقابل حل مسائل سے دوچار ہے۔ کس طرح معاشرہ کو اخلاقی دیوالیہ پن میں مبتلا کیا جا چکا ہے۔ ان حقائق سے آگاہی حاصل کئے بغیر انفرادی اور اجتماعی طور پر کوئی منصوبہ بندی کرنا ممکن نہیں ہے۔ لازمی طور پر یہ رہنمائی سردار شوکت علی کی تخلیقات سے حاصل ہو گی۔

معراج خالد

پیش لفظ

ہم تبدیلی کے ایسے ہیجان خیز دور میں رہ رہے ہیں کہ ایک تبدیلی کی ماہیت اور معانی ابھی سمجھ نہیں پاتے کہ نئی تبدیلی ظہور میں آ جاتی ہے۔ 91-1986ء کا دور سویٹ یونین میں گورباچوف کے عروج و زوال اور عالمی معاشی اور سیاسی نظام میں دور رس وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کا دور ہے۔ ان چند سالوں میں پرایسٹرائیکا اور گلاسناسٹ کے دو نئے الفاظ کا غلغلہ رہا ہے اور ان دو لفظوں کی گونج نے تمام براعظموں میں عظیم ہلچل مچائی ہے۔ ہر طرف گورباچوف کے نعرے تھے اور سامراجی ذرائع ابلاغ گورباچوف کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے اور ایک سویٹ حکمران کو امن کے نوبل پرائز کا حقدار قرار دیا جا رہا تھا۔ نج کاری کی پالیسیاں ترقی اور طاقت کے حصول کے لئے بنیادی قرار دی جا رہی تھیں۔ اور سویٹ یونین میں جہاں 73 سال تک درانتی ہتھوڑے والا سرخ پرچم نئی سماج کی بشارت کے نشان کے طور پر لہرا رہا تھا' پاؤں تلے روندا جا رہا تھا۔ اور شاہی روس کا جھنڈا جو دراصل نج کاری کا نشان ہے' جھلایا جا رہا تھا۔ عظیم انقلابی رہنماؤں لینن اور مارکس کے بت ریزہ ریزہ کئے جا رہے تھے۔ لیکن 1991ء کے آخر میں گورباچوف جو اپنا کردار ادا کر چکا تھا' کو نہایت ذلت آمیز طریقے سے عالمی سیاست کے سٹیج سے اتار دیا گیا اور اب ان کا کوئی نام لیوا نظر نہیں آتا ہے۔ عالمی سرمایہ دار طاقتوں نے جو کل تک اس کے قصیدے گا رہی تھیں' چپ سادھ لی ہے اور یلسٹن کے ساتھ رابطے استوار کرنے میں مصروف ہیں۔ سویٹ یونین جو کل تک ایک عظیم طاقت تھی' آج کئی ریاستوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔

نج کاری کی ان کامیابیوں اور خلیج کی جنگ میں شاندار فتوحات کے ایک سال بعد صدر بش جاپانی وزیراعظم کے قدموں میں بے ہوشی کے عالم میں گرا ہوا بیس ہزار کاروں کی خریداری کے لئے التجا پیش کر رہا تھا۔ نجی تجارت اور نجی صنعت کے بڑے بڑے علمبردار امریکی سرمایہ دار اپنی ریاستی طاقت کو تجارت کے لئے استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ جو اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ نج کاری بھی ریاستی طاقت کے سہارے چلتی ہے۔

اب امریکہ نے اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے نئے حالات میں نئی پالیسیاں اختیار کر

لی ہیں۔ اور بنیاد پرستوں' جن پر جدید ہتھیاروں اور ڈالروں کی چند برس پہلے بارش کرتا رہا' سے مکمل طور پر ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

پاکستان میں افغانستان کے جہاد کو پس پردہ منظم کرنے والے پاکستان کے جرنیل گل حمید کو سرکشی اور حکم عدولی کی بنا پر فوج سے علیحدہ کیا جا چکا ہے۔ اور حکمت یار اور مولانا حسین احمد واویلا کر رہے ہیں کہ امریکہ افغانستان کے جہاد کو سابو تاژ کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ گویا کہ امریکہ مجاہدین کو جو ہتھیار دے رہا تھا اور مالی امداد فراہم کر رہا تھا وہ جہاد کی فتح اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے تھا اور اس کے اپنے استعماری مفادات نہیں تھے۔

جماعت اسلامی اور ضیاء کے دوسرے پیروکار اس بات پر بہت خوشیاں مناتے رہے ہیں اور اپنی فتح کے ڈنکے بجاتے رہے ہیں (حالانکہ وہ جلال آباد اور کابل میں داخل نہیں ہو سکے) کہ ان کے جہاد نے ایک سپرپاور کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کم سمجھی کی وجہ سے امریکی امداد سے ایسے حالات پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی جس کی وجہ سے روس (سابق سویٹ یونین) جس نے 1967ء کی عربوں کے خلاف اسرائیلی جنگ کی وجہ سے اسرائیل سے سفارتی تعلقات توڑ لئے' از سرنو اسرائیل سے سفارتی تعلقات بحال کر لئے ہیں اور چین نے بھی اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے۔ دراصل مولانا حسین احمد اور حکمت یار امریکہ کے عالمی مفادات کی جنگ لڑتے رہے ہیں۔

اور اب امریکی سی آئی اے کی خفیہ دستاویزات منظر عام پر آنے پر چونکا دینے والے حقائق اور سازشوں کے انکشافات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ امریکی سی آئی اے' کس قدر کائیاں' کس قدر منظم اور عیار و ہوشیار ہے۔ اس نے حسین احمد اور حکمت یار کا جہاد اپنے مفادات کے حصول کے لئے منظم کیا۔ اور برس ہا برس کی کاوش اور کثیر خرچ کے بعد پہلے پولینڈ اور مشرقی یورپ اور آخر میں سویٹ یونین کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اس نے نہ صرف گورباچوفوں یلسٹینوں اور حکمت یاروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے نچایا۔ بلکہ ریگن نے پوپ پال کے ذریعے اربوں ڈالر پولینڈ میں سالیڈیرٹی کی تحریک کو کامیاب کرنے کے لئے صرف کئے اور جونہی اس کے عزائم پورے ہوئے ان کی پذیرائی چھوڑ دی اور انہیں بے یار و مددگار اور نہتا کر دیا۔

امریکہ نے جو کسی وقت پاکستان کا اس بات پر ممنون تھا کہ اس نے امریکہ اور چین کے درمیان سویٹ یونین کے خلاف پل کا کام دیا تھا' مکمل طور پر اپنی حکمت عملی بدل لی ہے اور پاکستان سے منہ موڑ کر ہندوستان سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ دفاع کے

میدان میں تعلقات قائم کر رہا ہے اور اس کی مالی امداد بڑھانے کے منصوبے بنا رہا ہے اور دوسری طرف پاکستان کی امداد اور قرضے بند کر کے اس کے خلاف ویسی ہی سازش کر رہا ہے جیسی اس نے سوویت یونین اور سوشلسٹ بلاک کے خلاف کی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ پاکستان' ایران اور چین کے خلاف محاذ بنانے کی تگ و دو کر رہا ہے یہ ہیں بانجھ اور خود دشمنی کی پالیسی کے نتائج کہ کوتاہ نظر بنیاد پرست اپنے ہی خیالات کے اسیر ہیں۔ اور اپنے ارفع نظریات کی کھوکھلی اور بے مقصد اور سطحی تاویلیں کرتے نہیں تھکتے۔

باوجود محدود ٹیکنیکل ترقی اور ششدر کرنے والی ایجادات کے مغربی تہذیب کا مرکز آج بھی مشرق وسطیٰ کے ریگستانوں اور صحراؤں میں ہے جہاں اس تہذیب کی آبیاری کرنے والا سیاہ سونا زیر زمین بہہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے امریکہ اپنی جدید ترین فوج کی کثیر تعداد مشرق وسطیٰ میں رکھنے پر مصر ہے۔

قصہ کوتاہ دنیا میں مختلف طاقتیں اور قومیں اس نئے دور میں نئے تعلقات اور نئے بلاک بنانے کے راستہ پر چل رہی ہیں۔

ایک طرف سویٹ یونین' جس نے سرمایہ داری کی خلیج کو ایک ہی چھلانگ میں عبور کرنے کی کوشش کی تھی' بکھر گیا ہے تو دوسری طرف نہایت ہی ترقی یافتہ مغربی یورپ کے ممالک تاریخی منازل طے کرتے ہوئے حتمی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں اور نئے معاشی' سیاسی اور ثقافتی اتحاد کی بنیاد رکھ چکے ہیں۔ اور عالمی سماج کے ارتقا کی اگلی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

دنیا کی یہ نئی تقسیم' شمال اور جنوب' نہایت ہی ترقی یافتہ صنعتی ممالک اور تیسری دنیا کے پس ماندہ ممالک کے درمیان ہو رہی ہے۔ ایک طرف پس ماندہ ممالک کے لئے ترقی کے نئے در وا ہوئے ہیں' لیکن دوسری طرف ان ممالک کے حالات نہایت ہی الجھ گئے ہیں اور ان کے لئے بے پناہ مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کے پاس نہ تو اپنے وسائل کو ترقی دینے اور خود کفالت کے تمام دعوے سراب دکھائی دیتے ہیں۔ اور بے معنی معلوم ہوتے ہیں اس تاریخی جبر کی پرچھائیوں میں پاکستان کے ناعاقبت اندیش حکمران طبقے اپنے عوام کی اندھی لوٹ اور استحصال میں مگن ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے وسائل اور ذرائع کو "لوٹ سیل" پر لگا دیا ہے۔ وہ اپنے بچاؤ اور ترقی کے لئے ہاتھ میں کشکول لئے ہر دروازے پر قرضوں کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

عالمی سماج' ترقی کے اس عظیم الشان دور میں گھناؤنی بے راہرویوں' بھیانک رشوت

ستانی' قاتل ہیروئن اور کلاشنکوف' بے مروتی اور نسلی نفرتوں کے خونخوار پنجوں میں گرفتار ہے۔ ایڈز کا موذی مرض اور ماحول کی روز بروز بڑھتی ہوئی آلودگی انسانی زندگی کے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔

امریکی سامراج کی رہنمائی میں نئے عالمی نظام کی کامیابیوں کے لئے دنیا بھر کے اجارہ دار' سرمایہ داروں کے نمائندے اپنی نئی حکمت عملی اور طریقہ کار وضع کرنے کے لئے عالمی کانفرنسیں کر رہے ہیں ہیں۔ لیکن انہیں قدم قدم پر ایک نئی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ مزاحمت ان ترقی یافتہ ملکوں کے روز بروز بے روزگار ہوتے ہوئے کارکنوں' اور طویل جدوجہد کے ذریعے سرمایہ داروں سے حاصل کی ہوئی معاشرتی رعائتوں میں ہوتی ہوئی کمی کے خلاف بین الاقوامی سطح پر مورچہ بند ہو رہی ہے۔ اور سیٹل کے مقام سے لے کر جہاں جہاں بھی اجارہ داروں کے نمائندوں کی کانفرنسیں ہوئیں لاکھوں کی تعداد میں مغربی ملکوں کے باشعور کارکنوں نے مزاحمتی مظاہرے کئے اور ان کانفرنسوں کو مکمل طور پر کامیاب نہیں ہونے دیا۔ بلکہ انہیں مجبور کر دیا کہ وہ بے روزگاری کا سد باب کریں۔ زندگی کے گرتے ہوئے معیار کو روکیں۔ چنانچہ امریکی سامراج کے اس نئے عالمی نظام کے ساتھ ہی ایک نئی عالمی مزاحمتی تحریک نے بھی جنم لیا ہے اور وہ نہایت ہی بھرپور انداز سے جدوجہد کر رہی ہے۔ اجارہ دار' سرمایہ داروں کے ذہن نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کے اس گٹھ جوڑ کے خلاف محنت کش اس طرح متحد اور منظم جدوجہد کریں گے۔ اور انسانیت کی بہتری کے لئے جدوجہد کرتی ہوئی مختلف ملکوں کی تنظیمیں اتنی جلدی متحد ہو جائیں گی اور ان کے خوبصورت الفاظ میں لپٹی ہوئی محنت کشوں کے خلاف سازشوں کو بے نقاب کر دیں گے۔ یہ اسی بات کی غمازی کرتی ہے کہ عالمی سطح پر دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے جو آخر ایک نئی انسانی سماج کو تشکیل دے گی۔ جس سماج کی آزادی جب سے سماج طبقوں میں تقسیم ہوئی ہے' مظلوم اور محروم طبقوں کا آدرش بنی رہی ہے اور ان کے خوابوں میں بسی رہی ہے۔ یقیناً وہ دن دور نہیں جب یہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔

پاکستانی سماج میں رونما ہونے والی مسلسل تبدیلیوں کے پیچیدہ سیاسی عمل اور بین الاقوامی سطح پر سوشلزم کی تحریک کی وقتی پسپائی نے آج بائیں بازو کے اکثر سیاسی کارکنوں کو گوناگوں نظریاتی الجھنوں میں مبتلا کرکے بے عملی اور تذبذب کا شکار بنا رکھا ہے اور انہیں کوئی راہ عمل سجھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ بائیں بازو کے انقلابی نوجوان اپنے گردوپیش کے واقعات اور قومی اور بین الاقوامی پس منظر میں گہرا اور سنجیدہ مطالعہ کریں اور

سماجی تبدیلیوں کے اسباب و علل کا حقیقی شعور حاصل کریں۔ اور معاشرے میں اپنا صحیح مقام متعین کرکے آگے بڑھیں تاکہ تذبذب اور بے عملی کی بے مصرف زندگی گزارنے کی بجائے روشن مستقبل کے راستے پر پرامید ہو کر گامزن ہوں۔ اس مقصد کے لئے انہیں ملکی حالات کے مطابق صحیح خطوط پر لکھا ہوا نظریاتی لٹریچر فراہم کیا جانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

سویٹ یونین کے مضبوط فوجی بلاک کی شکست و ریخت کے باوجود اسلحہ کی تیاری کی دوڑ حتمی طور پر ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ مہلک ہتھیار پہلے سے زیادہ پھیل گئے ہیں چنانچہ پس پردہ جدید ترین اسلحہ بنانے کے منصوبے بدستور بنائے جا رہے ہیں۔ اور مستقبل کے دشمنوں کے متعلق اندازے اور تخمینے لگائے جا رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں ہتھیاروں کے انبار لگائے جا رہے ہیں۔

ہندوستان نے اپنے فوجی بجٹ میں 7 فیصدی اضافہ کر دیا ہے اور فوجی شعبے میں جدید ترین ٹیکنالوجی سے سٹار وار پروگرام میں شمولیت کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نئے عالمی نظام میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ دنیا کے اندر ہر شے اور ہر مظہر کے منفی اور مثبت پہلو ہوتے ہیں۔ اور انہیں سے زندگی ترقی کی طرف گامزن رہتی ہے۔ نئے عالمی نظام کے بھی مثبت پہلو موجود ہیں۔

عالمی تاریخ کے اس نئے دور میں دنیا بھر میں آزادی اور جمہوریت' انسانی حقوق کی بازیابی' عورت کی آزادی اور تحفظ اور برابری کے حقوق اور بچوں کی حفاظت کے لئے جدوجہد جاری ہے۔ پچھلے پانچ سو سال سے امریکہ میں ریڈ انڈینز اور پچھلی دو صدیوں سے آسٹریلیا کے پس ماندہ قبائل بھی انسانی حقوق اور قومی آزادی کے لئے بیدار ہو رہے ہیں۔ کولمبس کی امریکہ کی دریافت کی پانچ سو سالہ تقریبات مناتے ہوئے پہلی بار ریڈ انڈینز کے نمائندوں نے واہ واہ کے ڈونگرے برسانے کی بجائے اس دریافت کو نئے رنگ میں پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ پانچ سو سال انسانیت کشی کے سال تھے۔ اسی طرح آسٹریلیا کے اصلی لیکن پس ماندہ قبائل نے پارلیمنٹ کی عمارت پر قبضہ کر کے اعلان کیا کہ یہ پارلیمنٹ ان کی ہے۔ گو بعد میں ان کو وہاں سے نکال دیا گیا لیکن ظاہر ہے کہ انسانیت کشی اور قبائل کے خاتمہ کی پالیسیوں کے خلاف عوام جاگ اٹھے ہیں۔

صدیوں سے مروج عورت کی دوہری غلامی' اس کے جسم و جان کے خلاف بہیمانہ تشدد اور اس کے ساتھ غیر انسانی سنگدلانہ برتاؤ اور سماجی کمتری کے خلاف بھی دنیا بھر میں تحریکیں سرگرم عمل ہو گئی ہیں۔ اور اس کی بہتری اور بہبود اور تحفظ کے لئے سرگرم عمل ہیں اور

نت نئی کامیابیاں حاصل کر رہی ہیں۔
رنگ و نسل کے امتیاز کو مٹانے کے لئے حالات سازگار ہو رہے ہیں۔ اور اس کا ثبوت رنگ و نسل کے امتیاز کے آخری قلعہ..... جنوبی افریقہ..... میں دور رس تبدیلیوں سے ظاہر ہے۔
عرب ملکوں میں شہنشاہیت اور مذہبی آمریت کے قلعے میں بھی شگاف پڑتا نظر آتا ہے اور سعودی حکومت کو اعلان کرنا پڑا ہے کہ وہ ایک مجلس شوریٰ قائم کر رہی ہے۔ گو یہ مجلس شوریٰ نامزدگی پر مبنی ہو گی لیکن پھر بھی یہ اقدام جمہوریت کی طرف پہلا قدم ثابت ہو گا۔
ہر امن کی تحریک بھی ملک میں از سرنو نئی بنیادوں اور نئی جہتوں سے منظم ہو رہی ہے۔ اور سارے ایٹمی ہتھیار تباہ کرنے کے لئے مطالبہ زور پکڑ رہا ہے۔
نئے حالات میں اقوام متحدہ کی تشکیل نو کے لئے بھی آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور اس کے آئین میں ایسی ایسی ترامیم کی تجاویز سامنے آ رہی ہیں۔ جو موجودہ حالات میں اقوام متحدہ کی ہیئت کی صحیح عکاسی کر سکے۔
گو اسرائیلی حکومت اپنی ہٹ دھرمی اور جارحیت سے باز نہیں آ رہی لیکن مسئلہ فلسطین عالمی سطح پر حل طلب مسائل میں سرفہرست ہے اور اسے حل کرنے کے لئے تگ و دو جاری ہے۔
کشمیری عوام کی بیداری اور قربانیوں نے اس مسئلہ کو نہ صرف زندہ کر دیا ہے بلکہ ایک بار پھر ان مسائل میں شامل ہو گیا ہے۔ جو ابھی حل طلب ہیں اور یقیناً اقوام متحدہ میں بھی اسے شامل کر لیا جائے گا۔
ادھر گورباچوف کو' جسے نئی پرامن جمہوری زندگی کے قیام کے لئے رہبر کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا اپنے ہی ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور ملک بھر میں بھوک اور بے روزگاری کو جنم دینے والا اور غدار وطن کے القاب سے پکارا جا رہا تھا۔ اور وہ بے روزگاری کا شکار ہو کر اقتدار کی چوٹی سے گر کر ذلت کے گڑھے میں گمنامی کی زندگی گذار رہا ہے۔
حیرت ہے کہ وہ اس قدر جلد اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اور اس کا کوئی نام لیوا نہیں رہا۔
یلسٹن جسے جمہوریت کے نڈر اور بے باک جرنیل کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا' اپنی ہردلعزیزی کھو چکا ہے۔ ایک طاقتور تحریک اس کے خلاف ابھر رہی ہے۔ جو اسے کھلے طور پر غدار وطن قرار دے رہی ہے اور وہ مستعفی ہو چکا ہے۔
تمام نامساعد حالات کے باوجود کیوبا میں کاسٹرو اپنے سوشلزم کے نظریات پر ڈٹا ہوا ہے

اور کیوبا کے عوام نے سیاسی' ثقافتی' معاشی و سماجی میدان میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہے۔

شمالی کوریا' ویٹ نام اور چین بھی نئے حالات میں نئی لچکدار پالیسیوں کے ذریعے سوشلسٹ تحریک کو نہ صرف قائم رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس کی ترقی کے لئے نئی سمتیں اور جہتیں دریافت کر رہے ہیں۔

ہندوستان کی دونوں بڑی کمیونسٹ پارٹیوں نے' جنہوں نے جمہوری انتخابات میں حاصل شدہ کامیابیوں کو ابھی تک قائم رکھا ہوا ہے صنعتوں کی پرائیویٹائزیشن کی پالیسیوں کا پورے زور سے مقابلہ کر رہی ہیں۔

اس بین الاقوامی تناظر میں پاکستان کے اندر جو بنیاد پرستی کی زبردست لہر آئی تھی اب اس کا مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اور وہ باوجود بلند بانگ دعوؤں کے ناکامیوں سے دوچار ہے اور تنہا ہو رہی ہے۔ اور آئین میں ضیا کی رجعت پسند آٹھویں ترمیم کے خلاف جدوجہد کے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں لیکن نئے عالمی نظام میں پاکستان کو ابھی بے شمار خطرات کا سامنا ہے جن کا مقابلہ کرنے اور ملک کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لئے دور اندیشی اور تدبر پر مبنی پالیسیوں کی ضرورت ہے۔

آخر میں ہم پھر جمہوریت اور زرعی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں کیونکہ یہ دونوں مسائل آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ جمہوریت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک سامراجی قرضوں سے چھٹکارا حاصل نہ کر لیں اور جاگیرداری اور زمینداری نظام کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکیں۔

زرعی مسئلہ پاکستان کے اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے۔ پاکستان کی آزادی اور سالمیت اور جمہوریت' ترقی اور خوشحالی اسی مسئلہ کے حل کے ساتھ وابستہ ہے۔ پچھلے 25 برس سے یہ مسئلہ حل نہیں کیا جا سکا۔ کیونکہ مختلف حکومتوں کے ذریعے جاگیردار طبقہ ہمیشہ برسر اقتدار رہا۔ 1958ء میں سرمایہ دار طبقہ بھی حکومت میں ساجھے دار ہو گیا لیکن ایک چھوٹے حصہ دار کی طرح۔ فوجی حکمران خود جاگیردار بننے کی دوڑ میں لگے رہے۔ اور ساتھ ساتھ ملک کی ترقی کے لئے امریکی سامراج کی امداد کے ذریعے سرمایہ دارانہ ترقی کا راستہ اختیار کیا۔ نتیجتاً" پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اب زرعی مسئلہ کے حل کے لئے زراعت میں سرمایہ دارانہ طریق کاشت رائج کرنے کے لئے دوڑ دھوپ جاری ہے۔ یقیناً یہ طریقہ دقیانوسی زرعی طریقوں سے ترقی کی طرف اقدام ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ

راستہ زرعی مسئلہ اور قومی مسائل کو حل کرنے کی بجائے بھوک اور بے روزگاری کے مزید مسائل کھڑے کر دے گا۔

اس کتاب میں، ہم نے پاکستان میں زرعی مسئلہ کی نوعیت، مختلف ادوار میں اسے حل کرنے کی کوششوں اور بھٹو کی زرعی اصلاحات کا جائزہ لیا ہے اور پاکستانی عوام کے سامنے اس کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے مؤقف کو پیش کرنے کے لئے مختلف حکومتوں کے فراہم کردہ زرعی اعداد و شمار کو استعمال کیا ہے۔ صدر بھٹو کی زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں حکومت نے جو پہلے اعداد و شمار دیئے تھے انہیں اس کتاب میں درج کیا گیا تھا۔

لیکن 17- دسمبر 1972ء تاریخ کو پاکستان کی حکومت کے ترجمان نے نئے اعداد دیئے ہیں۔ ان کے مطابق پاکستان میں 600 زمینداروں کے پاس 71 لاکھ ایکڑ رقبہ تھا اور یہ رقبہ 30 چھوٹے مالکوں کے رقبہ کے برابر تھا۔ حکومت کو پنجاب میں 19,36,488، سندھ میں 10,60,737، سرحد میں 298,890، بلوچستان میں 7,68,833، ایکڑ اراضی مزارعین میں تقسیم کے لئے دستیاب ہو گی۔ لیکن ان میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس زمین میں سے زمینداروں سے کس قدر رقبہ ملے گا۔

بہرحال پچھلے 25 برس میں جاگیرداروں اور زمینداروں کی اقتصادی اور سیاسی طاقت متواتر کمزور ہوتی چلی گئی ہے اور سرمایہ دارانہ نظام متواتر ترقی کرتا رہا ہے۔ لیکن پاکستانی عوام کے مسائل حل ہونے کی بجائے پیچیدہ ہوتے چلے گئے ہیں۔ بلکہ ملک دو ٹکڑے ہو چکا ہے اور باقی پاکستان کی سالمیت بھی خطرے سے دوچار ہے۔ پاکستان کے زرعی مسئلہ کا ایک ہی صحیح حل ہے اور اسے ہم نے اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

پاکستانی سماج انقلاب کے کس دور میں ہے؟

آج پاکستان کے انقلابیوں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ وہ اس بات کا تعین کریں کہ پاکستانی سماج انقلاب کے کس دور میں ہے؟

تمام سیاسی عمل اور جدوجہد یعنی انقلاب کی حکمت عملی اور طریق کار کا دار و مدار اس سوال کے جواب میں ہے۔ انقلابی کارکنوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پاکستانی سماج میں مسلسل تبدیلیوں کا گہرا مطالعہ کریں اور اس سوال کا صحیح جواب تلاش کریں۔ اس سوال کا صحیح جواب تلاش کرنے کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ ثقافتی انقلاب کی پرچھائیوں تلے بے سروپا نعرہ بازی' بے ہنگم ہلڑ بازی اور مہم جوئی نے (جو پیٹی بورژوا ذہن کی پیداوار ہوتی ہے) معروضی حالات پر پردے ڈال رکھے تھے لیکن ترقی یافتہ سوشلزم اور سامراج کی باہمی کشمکش اور ایرانی انقلاب' رد انقلاب اور انقلاب ثور پولینڈ میں بین الاقوامی رجعت پسندی کی راہنمائی میں چلنے والی مزدور تحریک' کمپوچیا میں سوشلزم کی تعمیر کے نام پر انسان کشی' ایتھوپیا کے انقلاب نکاراگوا میں انقلابی جمہوری تحریک کی کامیابی' اور ناکامی السلویڈار میں مسلح تحریک آزادی' اور کولمبیا میں اس کی کامیابی جنوبی افریقہ میں روز بروز تیز ہوتی ہوئی نسلی امتیاز کے خلاف آزادی کی تحریک اور 9 سال کے طویل مارشل لاء کے دور اور عدم جمہوریت اور اس کے خلاف بے نتیجہ جدوجہد نے حالات بدل دیئے ہیں۔ مستعار لئے ہوئے کھوکھلے نعروں کے غبارے پھٹ رہے ہیں۔ جھوٹی امیدیں' خیالی منصوبے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے خواب ٹھوس پاکستانی حقائق سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے ہیں اور تمام سنجیدہ انقلابی کارکن سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اس سوال کا صحیح جواب اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس سے ہم یہ سمجھ سکیں کے انقلاب کے موجودہ دور میں پاکستانی سماج کے مختلف طبقات کا کردار کیا ہے اور آج کے مخصوص حالات میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے متعلق انقلابی کارکنوں کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ یہ سمجھ کر ہی ہم ان کے متعلق اپنا رویہ متعین کر سکتے ہیں۔ ان کے خلاف جدوجہد کر سکتے ہیں یا متحدہ محاذ بنا سکتے ہیں یا انہیں غیر جانبدار بنانے کی پالیسی اختیار کر سکتے

ہیں۔ چونکہ پاکستانی سماج ایک ترقی پذیر سماج ہے اس لئے اس میں مختلف طبقات نت نئے چولے بدل رہے ہیں۔ پرانے طبقات نئے روپ دھار رہے ہیں' نئے طبقات جنم لے رہے ہیں۔ ہمیں ان کے بدلتے ہوئے اور تغیر پذیر کردار کو بھی سمجھنا ہے۔

آیئے ہم دیکھیں کہ پاکستانی سماج انقلاب کے کس دور سے گزر رہا ہے؟

کیا پاکستان میں جمہوری انقلاب پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور ہم سوشلسٹ انقلاب کے دور میں داخل ہو چکے ہیں؟ یا ابھی پاکستانی سماج جمہوری انقلاب کے دور سے ہی گزر رہا ہے؟ ان سوالات کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ جمہوری انقلاب اور سوشلسٹ انقلاب کا مطلب کیا ہے؟

جمہوری انقلاب عبارت ہے زمیندارانہ' جاگیردارانہ نظام کے خاتمے سے' جاگیرداری عہد کے پیداواری رشتوں پر سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں کی فتح اور اس کے ساتھ ہی اس کے اوپری ڈھانچہ کے آمرانہ اور غیر جمہوری اداروں کے خاتمے سے۔ جمہوری انقلاب عبارت ہے سرمایہ دار طبقہ کی جاگیردار طبقہ پر مکمل فتح سے۔ شاہی مطلق العنانی کی شکست اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کی فتح سے جاگیرداری عہد کی ثقافت تہذیب و تمدن' عادات اور خصائل کی بیخ کنی اور سرمایہ دارانہ تہذیب و تمدن کی کامیابی سے جاگیرداری عہد کی خود کفالت' جمود اور علیحدگی کی پسپائی اور اتحاد اور نئے قومی تشخص کی نشوونما سے' جمہوری انقلاب سرمایہ دار طبقہ کی رہنمائی میں برپا ہوتا ہے اور مطلق العنانی کو ختم کر کے سرمایہ دارانہ جمہوریت کو قائم کرتا ہے۔

جمہوری انقلاب برطانیہ' فرانس اور دوسرے مغربی ممالک میں سترہویں' اٹھارویں اور انیسویں صدی میں پایہ تکمیل کو پہنچ گیا اور ان ممالک میں زمیندارانہ پیداواری تعلقات کا خاتمہ کر کے سرمایہ دارانہ پیداواری تعلقات کے غلبہ کے لئے راستے کھل گئے اور اوپری ڈھانچہ میں مطلق العنان حکمرانوں کی جگہ جمہوری اداروں کی نشوونما شروع ہو گئی برطانیہ میں جہاں مخصوص حالات کی وجہ سے سرمایہ دارانہ پیداواری تعلقات نے سب سے پہلے نشوونما پائی 1649ء میں جمہوری انقلاب کے نقیبوں نے چارلس اول کو شکست دی اور برطانوی جمہور نے ایک مطلق العنان بادشاہ جو ظل الٰہی کہلاتا تھا کو چوراہے میں پھانسی پر لٹکا دیا اور ریاستی اقتدار پارلیمنٹ کے سپرد کر دیا۔ فرانس میں 1779ء میں عظیم جمہوری انقلاب آزادی' مساوات اور بھائی چارے کے جھنڈے جھلاتا زلزلے کی طرح تمام یورپ کے پرانے نظام کی

چولیں ہلا گیا۔ سویٹ یونین میں جمہوری انقلاب فروری 1917ء میں برپا ہوا جس نے مخصوص تاریخی حالات میں اکتوبر سوشلسٹ انقلاب کے لئے زمین ہموار کر دی اور دنیا میں پہلا سوشلسٹ انقلاب برپا ہوا جس نے انسانی سماج کے ایک نئے غیر طبقاتی دور کے آغاز کی بشارت دی۔

یورپ کے جمہوری انقلاب کا نشانہ جاگیرداری عہد کے پیداواری رشتے اور ان رشتوں پر قائم ایک مطلق العنان بادشاہت کا ڈھانچہ تھا' وہ تمام خیالات اور نظریات جن کی رو سے بادشاہ زمین پر ظل الٰہی سمجھے جاتے تھے تہس نہس ہو گئے اور سلطانی جمہور کا غلغلہ ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہو گیا۔ خیالات کی دنیا جو جمود کے پنجے میں مقید تھی اور جس کی ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں' مسمار ہو گئی اور تجسس اور دریافت اور دلائل کی روشنی میں نئی سماج نشوونما پانے لگی۔

جمہوری انقلاب کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس انقلاب کی رہنمائی ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے نے کی اور ان تمام طبقوں (مزدوروں' کسانوں اور درمیانہ طبقہ) جن کے مفادات جاگیرداری نظام اور مطلق العنانیت کے خلاف تھے کی رہنمائی حاصل کی اور آزادی' مساوات' بھائی چارے اور انصاف اور قانون کی حکمرانی کے نعرے بھی اپنے پھریرے پر کندہ کئے اور پرانے نظام کے معاشی' سیاسی اور سماجی ڈھانچوں اور ان کے نظریات کے تقدس کو خاک میں ملا دیا۔ بڑی بڑی انفرادی اور کلیسائی جاگیرداریاں ختم کر دیں' کسانوں کو آزاد کیا شاہی نظام کا تختہ الٹ کر مطلق العنان بادشاہ کی جگہ سرمایہ دار طبقہ کی آمریت قائم کر دی' جسے جمہوریت کا نام دیا گیا پارلیمانی نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ بنیادی حقوق کو آئین کا حصہ بنایا گیا اور انسان کی آزادی برابری اور عظمت کو تمام قوانین کا سرچشمہ قرار دیا گیا۔ اور جاگیرداروں اور کلیساؤں کی نجی ملکیت کسانوں کو منتقل کر دی۔ کسانوں کو نہ صرف جاگیرداروں سے آزاد کرا دیا گیا بلکہ ان میں سے بیشتر اپنے ہل گھوڑے اور دوسرے آلات کشاورزی کی ملکیت سے بھی آزاد ہو گئے۔ اور نجی ملکیت کے کارخانوں میں اپنی محنت بیچنے کے لئے مجبور ہو گئے نجی ملکیت کا پرانا نظام ختم ہو گیا اور نجی ملکیت کا نیا نظام قائم ہو گیا۔ صرف اس کی شکل بدل گئی۔

اس کے برعکس سوشلسٹ انقلاب سے عبارت ہے ذرائع پیداوار میں نجی ملکیت کا خاتمہ اور تمام ذرائع پیداوار پر ریاستی ملکیت' کھیتوں میں اجتماعی اور ریاستی کھیتی باڑی اور

کارخانوں میں مزدور طبقے کی انقلابی پارٹی اور ٹریڈ یونینوں کی رہنمائی میں کام کے مطابق اجرت کے اصول پر مبنی پیداواری عمل اور سرمایہ دار طبقہ کی جگہ مزدور طبقہ کی ڈکٹیٹرشپ یعنی سرمایہ دارانہ جمہوریت کی جگہ مزدوروں کی جمہوریت۔ سرمایہ دارانہ تمدن اور تہذیب اور اخلاق اور قوانین کی جگہ سوشلسٹ تمدن اور تہذیب اور اخلاق اور قوانین کے نفاذ سے سوشلسٹ انقلاب مزدور طبقہ اور اس کی انقلابی پارٹی کی رہنمائی میں برپا ہوتا ہے اور وہ تمام طبقے جن کے مفادات نجی ملکیت کے خلاف ہیں پرولتاری پارٹی کی رہنمائی میں منظم ہو کر اسے کامیابی سے ہمکنار کرتے ہیں اور ریاست کی طاقت اور دبدبہ سرمایہ دار اور جاگیردار طبقوں کے خلاف اور محنت کشوں کے حق میں استعمال ہوتی ہے۔

یورپ میں بورژوا جمہوری یا سرمایہ دارانہ انقلاب نے پرانے استحصالی نظام۔ جاگیرداری عہد کا خاتمہ کر کے ایک نئے نظام---- سرمایہ داری نظام---- کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ان حالات میں یقیناً یہ نظام ترقی پسند تھا اور اس نے انسانی سماج کے ارتقاء میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا۔ پیداواری ذرائع میں دور رس تبدیلیاں کر کے اس نے انسان کے مفاد میں قدرت کی تسخیر کے لئے بے پناہ مواقع فراہم کر دیئے۔ اور پیداوار میں بے پناہ اضافہ کا موجب بنا۔ اور آج تک سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کی زنجیروں کے باوجود پیداوار بڑھانے کے نت نئے راستے ایجاد کر رہا ہے۔ اس نئے نظام نے نئے جمہوری سیاسی ڈھانچے وضع کئے۔ عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نظریات کو فروغ دیا۔ لیکن چونکہ یہ نظام بھی ذرائع پیداوار میں نجی ملکیت کی بنیادوں پر قائم تھا اور محنت کشوں کا استحصال اس کا خاصہ تھا اس لئے جلد ہی اس کا ترقی پسندانہ کردار محدود ہو گیا اور آخر اس نے رجعت پسندی اور ظلم کا چولا پہن لیا۔ اور آزادی اور مساوات کے خوبصورت نعروں کی اوٹ میں محنت کشوں کی پیدا کردہ قدر زائد کے بیشتر حصہ کو ہتھیانے کے لئے نئے نئے طریقے اپنانے اور سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کے نظام کو قائم رکھنے' اسے فروغ دینے اور بڑھانے کے لئے اس نے ایک نئی شکل اختیار کر لی جو اس کی انتہا تھی' جسے ہم سامراج کہتے ہیں اس نظام کے تحت ترقی یافتہ سرمایہ دار مغربی ممالک اور جاپان نے ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کے پس ماندہ ممالک پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا اور کروڑوں عوام کے استحصال سے سامراجی نظام کو مضبوط اور توانا بنانے کی کوشش میں جٹ گیا۔ اس لوٹ مار کے ذریعے برطانوی سامراج نے ہندوستان کو جو کبھی سونے کی چڑیا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا' بالکل کنگال بنا دیا۔ امریکی سرمایہ داری نظام کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے دس کروڑ

افریقی باشندوں کا شکار کیا گیا۔ ان میں سے بیشتر اس عمل کے دوران مارے گئے اور جو بچ گئے انہیں امریکی زراعت اور صنعت کو فروغ دینے کے لئے اس ترقی یافتہ عہد میں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ سامراجی طاقتوں نے اپنی لوٹ مار کو پائیدار بنانے کے لئے اپنے ملک کے محنت کشوں میں بھی محکوم ممالک کی لوٹ مار کا کچھ حصہ تقسیم کیا۔ اور انہیں اپنی جارحانہ پالیسیوں کا ہمنوا بنایا۔ گورے انسانوں کی کالے انسانوں پر قدرتی فوقیت کے نظریے کو جنم دیا اور اس نظریہ کا پرچار کیا کہ قدرت نے گورے انسانوں کو بہتر صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اور ان صلاحیتوں کی وجہ سے کالے انسانوں کی پسماندگی غربت اور جہالت کو دور کرنے اور ان کی اندھیری زندگیوں کو منور کرنے کا بوجھ گورے انسانوں پر ڈال دیا گیا ہے اور اس طرح ایک عرصہ تک ان شاطرانہ نظریات کے دبیز پردوں میں سامراجی لوٹ اور استحصال کو چھپانے کی کوشش کی گئی۔ سامراجی ممالک کو پسماندہ ممالک پر فتح ان کے نئے ترقی یافتہ پیداواری اوزاروں اور ان پر مبنی سماجی اور سیاسی نظام کی وجہ سے ہوئی۔ اور پسماندہ ممالک اپنے دقیانوسی اور پسماندہ پیداواری اوزاروں اور ان پر قائم سماجی اور سیاسی نظام کے باعث باوجود تعداد میں زیادہ ہونے کے حملہ آوروں کے سامنے نہ ٹھہر سکے چنانچہ پسماندہ محکوم ممالک دوہری لوٹ---- سامراجی اور جاگیرداری لوٹ---- کے پاٹوں تلے پسنے لگے۔

پس ماندہ محکوم ممالک میں جمہوری انقلاب کا نشانہ

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کس طرح یورپ میں پیداواری قوتوں کی کوکھ سے جمہوری انقلاب نے جنم لیا اور کس طرح ان قوتوں نے جاگیرداری نظام اور بادشاہت کے خلاف یلغار کی اور ایک نئی سماج جسے جمہوری سماج کے نام سے نوازا گیا' قائم کیا۔

لیکن محکومی کے حالات میں ایشیاء اور افریقہ کے پسماندہ محکوم ممالک میں جمہوری انقلاب کا نشانہ محض بادشاہت اور جاگیرداری نظام ہی نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان ممالک کے قدرتی سماجی ارتقاء کو سامراج کے غلبہ نے مسخ کر دیا تھا۔ برصغیر ہند' پاکستان' بنگلہ دیش اور بھارت میں بھی عین اس وقت جب جاگیرداری عہد کی کوکھ میں سرمایہ داری نظام کی پیدائش کے لئے حالات وجود میں آ رہے تھے برطانوی سامراج نے تفنگ و تلوار' عیاری اور سازش اور اپنی ترقی یافتہ پیداواری قوتوں اور ان پر مبنی سماجی اور سیاسی نظام کے بل بوتے پر قبضہ کر لیا۔ اور ان ملکوں کے عوام کی بے پناہ کھلی لوٹ سے ایک طرف اپنے نئے سرمایہ دارانہ

جمہوری نظام کی نشوونما کی اور نہایت ہی ارفع قسم کے جمہوری ادارے قائم کئے اور دوسری طرف ان ملکوں کی سماج کی کوکھ میں نشوونما پانے والی نئی پیداواری قوتوں کو اپنی استحصالی پالیسیوں کے ذریعے تباہ و برباد کر دیا اور عوام پر جاگیرداری استبداد کے ساتھ ساتھ سامراجی استبداد کو قائم کیا۔ سامراج نے اپنے نظام کی آبیاری کے لئے ان خطوں کی نشوونما' کچا مال' پٹ سن' کپاس' چائے وغیرہ پیدا کرنے اور برطانوی مصنوعات کے لئے منڈی کے طور پر کی۔ اس نئے نظام کو قائم رکھنے کے لئے برصغیر میں برطانوی دور کے پیدا شدہ جاگیردار اور افسر شاہی سامراج کے سب سے بڑے حلیف بن گئے اور انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں اور طاقت کو زمینداری نظام قائم رکھنے اور سامراجی برطانوی راج کے دوام کے لئے صرف کر دیں۔

چنانچہ برصغیر میں جمہوری انقلاب قومی جمہوری انقلاب بن گیا۔

قومی اس لئے کہ برطانوی سامراج سے آزادی اس کا اولین نشانہ تھا اور جمہوری اس لئے کہ فرسودہ جاگیرداری نظام جو سامراج کا حلیف بھی تھا اور جمہوری انقلاب کے راستے میں رکاوٹ بھی' کو ختم کرنا بھی اس کا نصب العین تھا۔

برطانوی سامراج نے اپنے جمہوری نظام کی آبیاری اور سامراجی مفادات کے لئے برصغیر میں ریلوں اور نہروں کا جال بچھایا' کانوں اور تیل کے کنوؤں کو حسب ضرورت ترقی دی' ریلوے کی ورکشاپیں' چھوٹی چھوٹی جیننگ فیکٹریاں پٹ سن اور کاغذ کے کارخانے چینی اور لوہے کا معمولی سامان بنانے کے کارخانے بنائے اور گودیوں اور ہوائی اڈوں اور ڈاک اور تار اور ٹیلی فون کے نظام کو ترقی دی اور بڑے بڑے شہروں اور وسیع علاقوں کو سڑکوں کے ذریعے بندرگاہوں سے ملایا۔ گو یہ سب کچھ متحدہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کے مفادات کو حاصل کرنے کے لئے کیا گیا تھا لیکن ان اقدامات کے کچھ مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے---- محکوم و سرمایہ داری نظام کی نشوونما کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار' مزدور اور درمیانہ طبقہ نے بھی جنم لیا اور پرورش پائی۔

1857ء اور اس کے بعد برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی تحریک نے جنم لیا جس نے کانگرس' کمیونسٹ' سوشلسٹ پارٹیوں' مسلم لیگ' مزدور انجمنوں' کسان سبھاؤں اور طلباء کی انجمنوں کی شکل اختیار کی۔ برصغیر کے مخصوص حالات کی وجہ سے سویٹ یونین میں 1917ء کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد بھی برطانوی سامراج کے خلاف تحریک کی رہنمائی سرمایہ

داروں تاجروں اور روشن خیال زمینداروں کے ہاتھ میں رہی ایک طویل اور کٹھن جدوجہد اور ان گنت قربانیوں کے بعد آخر 1947ء میں برطانوی سامراج برصغیر ہند و پاکستان کو آزادی دینے پر مجبور ہوا۔

چونکہ تحریک آزادی کی راہنمائی سرمایہ داروں' تاجروں اور روشن خیال زمینداروں کے ہاتھ میں تھی جو کانگرس اور مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں پر چھائے ہوئے تھے اور محنت کشوں کی پارٹیاں کمزور تھیں اور 1917ء کے سویٹ سوشلسٹ انقلاب کے بعد ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جن سے سرمایہ داری نظام کے علمبرداروں کو اپنے مفادات کے خاتمہ کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ لہٰذا وہ تحریک آزادی کو اس قدر آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے جس کے نتیجے میں تحریک کی رہنمائی ان کے ہاتھوں سے نکل کر انقلابیوں کے ہاتھ میں چلی جائے اس لئے جونہی ہندوستانی فوج میں بغاوت کے آثار نمودار ہوئے اور جہازیوں اور ہوائی فوج اور پولیس نے بغاوت کا راستہ اختیار کرنا شروع کیا اور ہندوستان بھر کے محنت کشوں میں ایک لڑاکا تحریک ملک کے کونے کونے میں پھیلنے لگی' کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے برطانوی سامراج کے ساتھ سمجھوتے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ آخر اس سمجھوتے کے نتیجے میں پاکستان اور ہندوستان کو آزادی ملی۔ لیکن قومی جمہوری انقلاب تشنہ تکمیل رہ گیا۔

نامکمل جمہوری انقلاب

برطانوی سامراج سے سیاسی آزادی تو حاصل ہو گئی لیکن دولت مشترکہ کی تنظیم اور شاہی ترجیحات (جس اصول کے ذریعے تجارت میں برطانیہ کو خاص مراعات حاصل تھیں) جیسے مختلف معاشی بندھنوں کے ذریعے سے محدود کر دیا گیا۔ برطانوی سامراج کی معاشی لوٹ بدستور قائم رہی۔

برطانوی سامراج جب رخصت ہوا تو پاکستان کا سیاسی' معاشی اور سماجی نقشہ عجیب و غریب صورت حال پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف نہایت ہی پسماندہ جاگیرداری اور قبائلی نظام تھا اور دوسری طرف ترقی یافتہ نوکر شاہی اور جدید فوج اور متحدہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کی ضروریات اور متحدہ جمہوری تحریک کی عکاسی کرتے ہوئے نمائندہ حکومتی ادارے تھے متحدہ ہندوستان میں برطانوی عہد کے دوران کانگرس' کمیونسٹ اور سوشلسٹ جماعتوں' ٹریڈ

یونینوں طلباء اور کسانوں کی جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں جو جمہوری ادارے وجود میں آئے تھے، تقسیم کے بعد پاکستان میں قبائلی اور جاگیرداری نظام ان کو کوئی بنیاد فراہم نہیں کر سکتا تھا ہندوستان کے وہ علاقے جن میں سرمایہ داری نظام نے نشوونما پائی تھی وہ پاکستان میں شامل نہ تھے اس لئے پاکستان میں سرمایہ دار طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ متحدہ ہندوستان میں 14569 ایسے کارخانے اور فیکٹریاں تھیں جن میں بیس مزدوروں سے زائد مزدور کام کرتے تھے اور مزدوروں کی کل تعداد 3142000 تھی، پاکستان کے حصہ میں صرف 1406 فیکٹریاں آئیں جن میں 206000 مزدور کام کرتے تھے ان میں سے بھی زیادہ تر برطانوی سامراجی حکومت کی ملکیت تھیں یا ہجرت کرنے والے ہندوؤں کی، پاکستان کے اندر تو تجارتی سرمایہ دار طبقہ بھی بہت کمزور تھا اور حکومتی سطح پر افسر شاہی اور جاگیردار حکمرانوں کے رحم و کرم پر تھا اندرون ملک ابتدائی سرمایہ کے ارتکاز کے لئے وسائل بالکل محدود تھے اور پرانا جاگیرداری نظام اس کے راستہ میں حائل تھا 51_1950ء میں کوریا کی جنگ نے جسے امریکی سامراج نے چھیڑا تھا۔ پہلی بار پاکستان میں تجارتی سرمایہ داروں کی نشوونما کے لئے مواقع فراہم کئے۔ چونکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی سامراج کا دیوالہ نکل چکا تھا اس لئے امریکی سامراج نے صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کی معاشی زندگی کو "امداد" اور قرضوں کے ذریعے اپنے معاشی اور سیاسی چنگل میں جکڑ لیا۔ بلکہ حال ہی میں ان ایام کے متعلق امریکی حکومت کی پاکستان کے متعلق پالیسی کے سلسلے میں جو دستاویزات چھاپی گئی ہیں ان سے عیاں ہے کہ سامراجی نظام کو قائم رکھنے کی خاطر برطانوی حکومت اور اس کی پروردہ افسر شاہی نے امریکی سامراج کے لئے خود پاکستان میں قدم جمانے کے لئے میدان ہموار کیا تھا۔

امریکی سامراج کی ماتحتی میں سرمایہ دارانہ ترقی کا راستہ

نئے حالات میں نئی سطح پر پھر سے وہی عمل دہرایا گیا۔ یعنی پاکستان کی معاشی نشوونما کے ارتقاء کو مسخ کر دیا گیا۔ جلد ہی پاکستان کے جاگیردار حکمرانوں افسر شاہی اور فوجی جنتا میں گہرا تعاون قائم ہو گیا۔ اس اتحاد میں پہلے سول افسر شاہی کو چند سالوں کے لئے بالادستی حاصل رہی اور آخر 1958ء میں فوجی جنتا نے تمام اختیار سنبھال لئے۔ فوجی اور سول افسر شاہی کی رہنمائی میں ابھرتے ہوئے تجارتی سرمایہ دار طبقہ نے ملک کے اندر پیداوار کے جاگیری

رشتوں کو قائم رکھتے ہوئے امریکی سامراج کی مشروط اور قرضوں سے گماشتہ سرمایہ دارانہ ترقی کا راستہ اختیار کیا۔ امریکی سامراج نے نہایت ہی کروفر سے برطانوی سامراج کی جگہ لے لی۔ برطانوی سامراج کو بوریا بستر اٹھا کر پاکستانی سٹیج سے ہٹنا پڑا۔ برطانوی سامراج کی گرفت سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے امریکی نواز ٹولہ نے لیاقت علی وزیراعظم پاکستان کا خونیں ڈرامہ رچایا۔ اور امریکی سامراج کی آمد کے لئے تمام دروازے کھول دیئے۔ امریکی سامراج کی آمد کا اعلان "امریکہ تیرا شکریہ" کی تختیاں ان اونٹوں کے گلے میں پہنا کر کیا گیا جو پاکستان جیسے زرعی ملک میں (جس نے کوریا کی جنگ میں 50 ہزار ٹن گندم امریکی فوجوں کی امداد کے طور پر بھیجی تھی') مصنوعی قحط کو روکنے کے لئے کراچی کی بندرگاہ سے امریکی گندم گاڑیوں میں لاد کر لا رہے تھے۔ اس کے بعد امریکی قرضوں سے قائم شدہ یہی امداد کے محکمہ کے کارکنوں کے سینوں پر یہی بیج سجائے گئے۔ اس طرح ایک طرف پاکستان کی معاشی' سیاسی اور ثقافتی غلامی کا نیا نوآبادیاتی دور شروع ہو گیا اور دوسری طرف فوجی اور سول افسر شاہی کی ریشہ دوانیوں اور جاگیردار طبقہ اور ابھرتے ہوئے تجارتی سرمایہ دار (جو صنعتی سرمایہ داری میں قدم رکھنے کے لئے پر تول رہے تھے) کی باہمی کشمکش کے نتیجے میں 1951ء سے 1958ء تک کے مختصر عرصہ میں چھ مرکزی وزارتیں یکے بعد دیگرے قائم ہوئیں اور آخر اکتوبر 1958ء میں ایوب خاں نے مارشل لاء نافذ کر کے فوج کی بالادستی قائم کر دی۔ اور 1956ء کے آئین کو جس کے تحت انتخابات ہونے والے تھے کالعدم کر دیا۔

مشروط قرضوں اور امداد نے پاکستان کو غلامی کی نئی زنجیروں میں جکڑ دیا جس کے نتیجے میں پشاور میں سویٹ یونین کے خلاف جاسوسی کرنے کے لئے بڈابیر کا اڈہ تعمیر ہوا۔ پاکستان بغداد پیکٹ سیٹو اور سنٹو کا ممبر بنا۔ غرضیکہ امریکی سامراج کی عالمی حکمت عملی کا ایک مہرہ بن گیا اور پاکستانی حکومت کے تمام اہم شعبے امریکی مشیروں کی زیر نگرانی دے دیئے گئے اس طرح پاکستان کی آزادی کو ڈالر کے عوض گروی رکھ دیا گیا۔

اس دور کی بنیادی پالیسی سامراجی امداد اور مشروط قرضوں کی مدد سے پاکستان میں بین الاقوامی سامراجی نظام کی محتاج سرمایہ دارانہ معیشت کی نشوونما کرنا تھی۔ محتاج سرمایہ دارانہ ترقی کے لئے بھی اندرون اور بیرون ملک منڈی کو وسیع کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ اس نئی معیشت کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کمزور سی زرعی اصلاحات کا قدم اٹھایا گیا۔ یہ اصلاحات نہ تو بنیادی ملکیتی رشتے ختم کر سکیں اور نہ ہی ملکی منڈی کو زیادہ وسیع بنانے میں

کامیاب ہوئیں لیکن ان کے نفاذ اور پراپیگنڈہ نے سرمایہ دارانہ طریق کاشت کی طرف رجحان ضرور پیدا کر دیا۔ نیز انہوں نے ایک حد تک ذاتی ملکیت کے جاگیرداری نظام کے تقدس پر بھی ضرب لگائی۔ زراعت میں سرمایہ دارانہ طریق کاشت پر زور دیا گیا۔ ٹریکٹر' ٹیوب ویل' نئے بیج' مصنوعی کھاد' کیڑے مار دوائیوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے منصوبے بنائے گئے' سڑکیں بنائی جانے لگیں' بجلی مہیا کرنے کے منصوبے بنائے گئے۔ کاشتکاروں کو قرضے دیئے گئے۔ اس پالیسی سے جو نتائج نکلے اسے سبز انقلاب کا نام دیا گیا۔ اس طرح زمین پر پرانے ملکیتی رشتے قائم رکھتے ہوئے زراعت میں سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی نشوونما ہونی شروع ہوئی۔

اس پالیسی کے تحت پاکستان میں بنیادی اور بھاری صنعت کے قیام کی مخالفت کی گئی۔ اور فولاد اور مشینیں بنانے کے کارخانے نہ بنائے گئے اور سارا زور ٹیکسٹائل اور اس قسم کی دوسری صنعتیں قائم کرنے پر صرف کر دیا گیا۔ انشورنس کمپنیاں تجارتی ادارے اور بنک وجود میں آئے۔ چنانچہ پاکستان ٹریکٹروں' موٹروں' ٹیکسٹائل مشینری مصنوعی کھاد کیڑے مار دوائیوں' زرعی آلات' کوکا کولا' چائے' سگریٹ' فاضل پرزوں' بسوں ٹرکوں اور سامان تعیش کے لئے منڈی کے طور پر نشوونما پانے لگا۔ اور سامراجی طاقتوں کے مال کی کھپت کے لئے منڈی وسیع ہونے لگی اور پاکستان کے دور افتادہ علاقے بھی نئی سڑکوں کے ذریعے عالمی اجارہ دار سرمایہ داروں کے منافعوں کی گرفت میں آنے لگے۔

چونکہ یہ ساری ترقی بھاری سودی اور مشروط سامراجی قرضوں کے ذریعے ہو رہی تھی اس لئے اس پالیسی نے نئے گماشتے' محتاج اور طفیلی سرمایہ دار طبقہ کو جنم دیا۔ جس کی ریڑھ کی ہڈی اس قدر کمزور تھی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکتا تھا بلکہ اسے ہر وقت سامراجی بیساکھیوں کی ضرورت تھی' چونکہ اس گماشتہ سرمایہ دار طبقہ نے نئے سامراج اور پرانے جاگیردار طبقہ کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے نشوونما نہ پائی تھی بلکہ سامراج کی امداد اور حفاظت نے جاگیرداروں کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھ رہا تھا اور آمریت کے سایہ تلے ترقی کر رہا تھا اس لئے قدرتی طور پر وہ ان کا حلیف بن گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس طبقہ کے بائیس خاندان ملک کے 80 فیصد اثاثوں پر قابض ہو گئے ان حالات میں آمرانہ حکومت ہی اس کے مفادات کی حفاظت کر سکتی تھی۔ چنانچہ یہ طبقہ ایوب حکومت یعنی اپنے خالق کا سب سے بڑا علمبردار بن گیا۔ اور ملک کے اندر قومی جمہوری انقلاب کی جدوجہد کو آگے بڑھانے

کی بجائے وہ غیر جمہوری حکومت کا ستون بن گیا اور سامراجی مفادات کے محافظ کا کردار ادا کرنے لگا۔

سامراجی ذرائع ابلاغ نے پاکستان میں ترقی کے اسی راستے کو ترقی پذیر ممالک کے لئے نمونے کے طور پر پیش کیا اور دنیا بھر میں پاکستان کی مثالی ترقی کے گیت گائے جانے لگے۔

ایوب حکومت نے محتاج سرمایہ دارانہ ترقی کی محدود کامیابیوں اور بے بنیاد طاقت کے بل بوتے پر نئی سیاسی کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے خفیہ طور پر کشمیر میں چھاپہ مار اس مفروضے پر داخل کر دیئے کہ یہ جنگ کشمیر کے علاقہ تک ہی محدود رہے گی۔ لیکن بھارت نے اپنی فوجوں کو بھارت اور پاکستان کی بین الاقوامی سرحد عبور کرنے کا حکم دے دیا۔ اس طرح 1965ء کی پاک ہند جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ نے ترقی و تعمیر کی پالیسیوں کے کھوکھلے پن کو ننگا کر دیا۔ سبز انقلاب اور امریکی سامراج کی دوستی کا بھانڈ چوراہے میں پھوٹ گیا۔

بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کے انحطاط اور سوشلزم کی ترقی کے اس دور میں خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آزاد' پسماندہ' ترقی پذیر ممالک میں معاشی ترقی کے لئے ایک نیا عنصر سامنے آیا۔ یہ تھا ترقی کے لئے منصوبہ بندی کا راستہ اور پبلک سیکٹر کا قیام۔ آزاد سرمایہ دارانہ معیشت میں منصوبہ بندی' ریاستی مداخلت اوز پبلک سیکٹر کا کوئی تصور نہ تھا۔ بلکہ معیشت کے میدان میں ہر قسم کی ریاستی مداخلت کو آزاد سرمایہ دارانہ معیشت کے لئے زہر قاتل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن 30-1929ء کے شدید ترین عالمی بحران کے دوران مجبوراً" ریاستی مداخلت اور منصوبہ بندی میں نجات کا راستہ ڈھونڈنا پڑا۔ برصغیر میں اس سے پہلے بھی سامراجی مفادات کے حصول کے لئے ریل' تار' ٹیلی فون' بجلی گھر' تیل کوئلے نمک اور دوسری معدنیات' اسلحہ کے کارخانوں' گودیوں' ہوائی جہازوں' بنکوں اور اس قسم کے دوسرے اہم شعبوں کو ریاستی ملکیت میں ہی قائم کیا گیا تھا۔ لیکن موجودہ دور میں جبکہ معاشی میدان میں کمر توڑ مقابلہ تھا اور عالمی سطح پر سوشلسٹ معیشت بھی سرمایہ داری نظام کے پہلو بہ پہلو ترقی کر رہی تھی اور اس کے اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور خود سرمایہ داری نظام اپنی پختگی کی آخری منازل میں داخل ہو کر انحطاط پذیر تھا' ریاستی مداخلت اور مدد کے بغیر معاشی ترقی ناممکن نظر آتی تھی۔ چنانچہ نو آزاد پس ماندہ ممالک میں خواہ وہ آزاد قومی سرمایہ داروں کی رہنمائی میں یا گماشتہ اور طفیلی سرمایہ داروں کی راہنمائی میں

ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے' ریاستی مداخلت' منصوبہ بندی اور پبلک سیکٹر کا قیام ضروری عنصر قرار پایا' پبلک سیکٹر کے قیام کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ نجی شعبہ کی نشوونما کے لئے ضروری تھا۔ ایک طرف بجلی' ریل' تار' ٹیلی فون' ڈاک' گودیوں' ہوائی پروازوں' گیس اور تیل کے بڑے بڑے منصوبے پبلک سیکٹر میں پروان چڑھ رہے تھے اور نجی شعبے کو سستی بجلی' تیل' گیس اور خدمات مہیا کر رہے تھے اور دوسری طرف پبلک سیکٹر میں صنعتیں قائم کر کے جب منافع کے قابل ہو جاتیں تو نجی شعبہ کو منتقل کر دی جاتیں۔ اس طرح جہاں اس قسم کی ریاستی سرمایہ داری پبلک کو کچھ سہولتیں مہیا کرتی ہے' وہاں سرمایہ داروں کو بھی رعائتی خدمات مہیا کرتی ہے۔

ریاستی سرمایہ داری جو سرمایہ داری نظام کا آخری زینہ ہے اور اس سے اگلا قدم اٹھانے کا مطلب سوشلزم میں داخل ہوتا ہے اس زمانہ میں موجودہ دور کی مجبوریوں اور ضروریات اور عوام کے دباؤ کی وجہ سے وجود میں آ جاتی ہے اور یہ سماجی ترقی کے میدان میں ایک قدم آگے کی طرف ہے۔ حالانکہ پرانی طرز کی آزاد سرمایہ دارانہ معیشت کے مفادات قطعاً" اس کے مخالف ہیں۔ یہ عنصر بالکل ایک نیا عنصر ہے اور اس عہد کی پیداوار ہے جب یورپ کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں نے محنت کشوں' کسانوں اور درمیانہ طبقہ کی رہنمائی حاصل کر کے جمہوری انقلاب برپا کئے اس وقت یہ عنصر قطعاً" موجود نہ تھا۔ اس عنصر کو عالمی سرمایہ داری کے انحطاط اور سوشلزم کی ترقی کے اس دور نے جنم دیا ہے اور تاریخی ارتقاء میں پس ماندہ ممالک کی ترقی کے راستے پر ایک نئی منزل کے طور پر سامنے آیا ہے۔ لیکن اس دور میں محتاج اور طفیلی سرمایہ داروں کی نشوونما کے دوران پیداواری قوتوں کی ترقی کی وجہ سے سامراج' جاگیردار طبقہ' نوکر شاہی اور فوجی جنتا کا ایک نیا حلیف طبقہ وجود میں آیا۔ یہ گماشتہ اور افسر شاہی سرمایہ دار طبقہ جس کا خمیر ملک کے اندر جاگیرداری اور قبائلی پیداواری قوتوں کے خاتمے اور سامراجی مفادات کا قلع قمع کرنے کی جدوجہد کے دوران نہ اٹھا تھا بلکہ اس نے سامراجی اور مشروط قرضوں اور جاگیردار طبقہ سے مفاہمت کی پالیسی سے نشوونما پائی تھی۔

اس ترقی کے دوران جدلی عمل نے دوسری طاقتوں کو بھی جنم دیا۔ یہ طاقتیں صنعتی مزدوروں' چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں' شہروں اور دیہات میں پیٹی بورژوازی' امیر کسانوں' کھیت مزدوروں' دوکانداروں' سفید پوش ملازمین' گھریلو صنعتکاروں' مشینری مرمت کرنے والوں' چھوٹے اور درمیانے طبقے کے ماہرین' انجینئروں' ڈاکٹروں' دانشوروں اور وسعت پذیر

طلباء کے حلقوں پر مشتمل تھیں۔

چنانچہ جاگیرداری نظام کے پہلو بہ پہلو سامراجی "امداد" اور قرضوں سے طفیلی سرمایہ داری نظام نشوونما پاتا رہا اور پرانے جاگیرداری پیداواری تعلقات اور اس سماج کی کوکھ سے جنم لینے والے نئے سرمایہ دارانہ پیداواری تعلقات کے تضادات بڑھتے گئے۔ پاکستانی عوام تہری لوٹ کے پاٹوں تلے پسنے لگے۔ سامراجی لوٹ' جاگیرداری لوٹ۔ اور گماشتہ سرمایہ داری اور افسر شاہی سرمایہ داری کی لوٹ۔

بین الاقوامی سطح پر سرمایہ داری اور سوشلزم کی کشمکش' محکوم ممالک کی آزادی کی جدوجہد' پاکستان کے اندر جاگیرداروں اور ابھرتے ہوئے تجارتی اور گماشتہ سرمایہ داروں کی پس پردہ باہمی جنگ و جدل' نئے پیداواری تعلقات اور نئی پیداواری قوتوں سے جنم لینے والے نئے خیالات نئے نظریات اور نئے شعور نے جنم لیا اور تبدیلی اور بہتر زندگی' جمہوریت اور آزادی کے لئے خواہشات کو زبردست مادی قوت میں بدل دیا۔ ٹرانسسٹر نے یہ خیالات ہر چہار سو پھیلا دیئے۔ عوام کی تہری لوٹ نے گہری بے چینی پیدا کر دی اور پاکستان میں پہلی بار انقلابی صورت حال پیدا کر دی اور 69-1968ء میں عوام کی عظیم تحریک پھوٹ نکلی۔ اس تحریک کا رخ ان تینوں طاقتوں کے خلاف تھا۔ سامراجی بالادستی' جاگیرداری نظام اور گماشتہ و اجارہ دار سرمایہ دار۔ چونکہ گماشتہ اجارہ دار سرمایہ دار طبقہ کی گھناؤنی لوٹ کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس لئے اس تحریک کا اولین نشانہ وہی طبقہ بن گیا۔

بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک میں انتشار' پیٹی بورژوا مہم پسندی اور موقعہ پرستی' محنت کش طبقوں کی مضبوط اور منظم پارٹی کا فقدان اور پاکستان کے منتشر بائیں بازو کی نظریاتی تہی دامنی اور جدوجہد کے لئے پہل قدمی کے فقدان کی وجہ سے اس عظیم عوامی تحریک کی رہنمائی فیوڈل سوشلسٹ اور پیٹی بورژوا عناصر نے حاصل کر لی۔ لیکن ترقی پسند انقلابی قوتوں کے "رہنما" اپنے اندرونی انتشار' شخصی اور گروہی مفادات' ذاتی بے ایمانی' تذبذب' کوتاہ فطری' بزدلی اور غلط اندازوں کی وجہ سے عوامی تحریک کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے یا تو کنارے پر اپنے اپنے تھیسس بغل میں دبائے کھڑے رہے۔ یا جمہوریت کے نام پر جمہوری قوتوں کے خلاف قرآن جلا کر رجعت پسند مذہبی جذبات اور فتوؤں کا سہارا لینے والوں کے قافلہ میں شامل ہو کر اپنا تشخص کھو بیٹھے اور جب طوفان تھما تو وہ عوام سے بالکل الگ تھلگ تنہا کھڑے تھے اور قومی جمہوری انقلاب کو آگے بڑھانے کے لئے انہوں نے کوئی

قابل قدر کردار ادا نہیں کیا۔ البتہ سرحد' بلوچستان اور مشرقی پاکستان میں قومی جمہوری قوتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ ایوب حکومت ختم ہو گئی۔ اور ایک بار پھر ایک دوسرے فوجی سربراہ یحییٰ خاں نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس طرح ایک عظیم عوامی تحریک کے باوجود قومی جمہوری انقلاب تشنہ تکمیل رہ گیا۔

سرمایہ دار سماج میں مفلسی!

بورژوا اصلاح پرست اور ان کی پیروی میں سوشل ڈیموکریٹوں کی صفوں سے کچھ موقع پرست یہ کہہ رہے ہیں کہ سرمایہ دار سماج میں عوام کے اندر مفلسی نہیں پھیل رہی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مفلسی کی تھیوری' ٹھیک نہیں ہے۔ عوام کی خوشحالی' خواہ سست ہی کیوں نہ ہو بڑھ رہی ہے اور ملکیت رکھنے والوں اور نہ رکھنے والوں کے درمیان کا خلا کم ہو رہا ہے' وسیع نہیں ہو رہا---- مگر اس طرح کے تمام دعوؤں کا جھوٹ عوام کے سامنے دن بدن زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو کر آ رہا ہے---- گرانی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ مزدوروں کی انتہائی زور دار اور بہت ہی کامیاب ہڑتالوں کی جدوجہد کے باوجود مزدوروں کی اجرتیں بمقابلہ محنتی طاقت کے ضروری صرف میں اضافے کے کافی سستی سے بڑھ رہی ہیں اس کے ساتھ ہی سرمایہ داروں کی دولت سر چکرا دینے والی تیزی سے بڑھ رہی ہے-------- (لینن)

عوامی جمہوری انقلاب

ایوبی عہد کے دوران پاکستان کے معروضی حالات نے "پاکستانی انقلاب" کو (جسے قومی جمہوری انقلاب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا) عوامی جمہوری انقلاب میں بدل دیا۔

قومی جمہوری انقلاب کی اصطلاح کو بدلنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کی کچھ ٹھوس مادی وجوہات ہیں یا محض کسی بدیشی انقلاب کی نقالی ہے؟ یا قومی جمہوری انقلاب ہی کو عوامی جمہوری انقلاب کا نام دے دیا گیا ہے یا پھر سوشلسٹ انقلاب کو عوامی جمہوری انقلاب کہا جا رہا ہے؟ یہ ہیں وہ سوالات جو بائیں بازو کے کارکنوں اور رہنماؤں کے درمیان باعث نزاع بنے ہوئے ہیں اور ان سوالات کو پاکستان کے ٹھوس معروضی حالات کا تجزیہ کے بغیر محض ہوا میں تلواریں چلانے سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں پاکستانی انقلاب کے تبدیل ہوتے ہوئے رنگ اور بدلتی ہوئی طاقتوں اور طبقوں کو مختصراً" بیان کیا

ہے۔ اور جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں ان کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ بین الاقوامی اور قومی سطح پر رونما ہونے والی معاشی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے پیش نظر ہی ہم موجودہ دور میں پاکستانی انقلاب کو کوئی نام دے سکتے ہیں۔ ان حالات میں پاکستانی سماج کے حقائق اور عوام کی عملی جدوجہد سے ہی کوئی نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

1958ء سے 1985ء تک پاکستانی سماج کے حقائق

1968-69ء تک عام طور پر پاکستان کے بائیں بازو کے رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ پرانا فرسودہ اور دقیانوسی جاگیرداری نظام جوں کا توں قائم ہے اور پاکستان پہلے کی طرح ہی سامراجی غلامی کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ گویا کہ پاکستانی سماج اس دور میں ساکت و جامد تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں آ رہی تھی، کوئی حرکت نہیں تھی۔ اس میں کوئی نئی قوتیں جنم نہیں لے رہی تھیں۔ اگر کسی نے بدلتی ہوئی سماج اور اس کے بطن سے جنم لیتے ہوئے نئے طبقات اور نئے خیالات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش بھی کی (اور یہ کوشش کئی بار کی گئی) تو اس پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ اور جب 1968-69ء میں پاکستان بھر میں ایک عظیم انقلابی تحریک پھوٹ نکلی اور ایک نئی لیڈرشپ عوام کے انقلابی نعرے ان کے انقلابی جذبے چھین کر اور نئے حالات میں جدوجہد کے نئے والہانہ انداز لے کر سیاسی میدان میں آ گئی تو بھی حقیقی انقلابی قوتوں کے لئے مجرمانہ خود پسندی اور ہجوما دیگرے نیست کا رویہ اپنایا گیا اور کسی گہرے مشاہدے، مطالعے اور ادراک پر مبنی سائنٹیفک تجزیے کی ضرورت کو درخور اعتنا ہی نہ سمجھا گیا۔ یحییٰ خان نے گو ان انقلابی قوتوں کو وقتی طور پر مارشل لاء کے ڈھکنے تلے دبا دیا تھا لیکن مارچ 1969ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پنجاب کسان کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی عظیم الشان کسان کانفرنس نے اس بات کی نشاندہی کر دی کہ ایوبی دور میں پیدا ہونے والی یہ قوتیں سامراجی شکنجوں اور جاگیرداری نظام کے ملکیتی اور پیداواری رشتوں میں تبدیلی کی خواہشمند ہیں۔ یہ کانفرنس اگرچہ "نیپ بھاشانی" پنجاب کے رہنماؤں کی زیر قیادت منعقد ہوئی تھی لیکن اس میں بائیں بازو کے تقریباً تمام نئے اور پرانے مکتبہ فکر کے سیاسی کارکنوں مزدوروں اور دانشوروں نے شرکت کی تھی۔ اور اس طرح تمام ان قوتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا جو عوامی جمہوری تبدیلیوں کی رہنمائی کی نقیب تھیں۔ اس سے پہلے 1969ء میں جب جماعت اسلامی نے تفہیم

القرآن جلا کر ترقی پسندوں کے خلاف جہاد کا نعرہ لگایا تھا اس وقت بھی عوامی جمہوری قوتیں سارے اختلافات بھلا کر خود بخود متحد ہو کر جدوجہد کے میدان میں نکل آئی تھیں اور مخالفین کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ جنوری تا مارچ 1969ء کے دوران ملک کے طول و عرض میں صنعتی مزدوروں نے فیکٹریوں پر قبضے جمائے اور کئی کئی روز تک فیکٹریاں خود چلاتے رہے' بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں مکمل ہڑتالیں ہوتی رہیں اور لاکھوں لوگ جلوسوں میں شرکت کرتے رہے' 13 مارچ 1969ء کو لاہور میں ریلوے مزدوروں نے عظیم الشان جلوس نکالا جس میں ہر طرف سرخ پھریرے لہرا رہے تھے اور انقلابی نعرے فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ ان سبق آموز تاریخی واقعات کے باوجود بایاں بازو پہل قدمی کر کے آگے نہ بڑھ سکا اور نہ ہی ایوب حکومت کے خلاف جدوجہد کے دوران کوئی رہنمایانہ کردار ادا کر سکا اور نہ ہی 1970ء کے پہلے عام انتخابات میں کوئی لائحہ عمل اختیار کر سکا بلکہ بھیانک انتشار سے دوچار ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ 1968ء تک سماج کے بطن میں جن نئی قوتوں نے جنم لیا تھا' جدوجہد کے دوران انہیں کا اظہار ہو رہا تھا اور یہ قوتیں للکار للکار کر یہ اعلان کر رہی تھیں کہ پاکستان کا سماج ساکت و جامد نہیں بلکہ اس میں دور رس تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں' ان تبدیلیوں کا تجزیہ کرو' انہیں پرکھو اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرو اور ان سے پیدا ہونے والی قوتوں کی رہنمائی کرو' انہیں منظم کرو اور ان کی جدوجہد کا رخ صحیح طرف موڑو اور انہیں انقلاب کی منزل کی طرف لے جاؤ مگر بائیں بازو کے رہنماؤں نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی اگرچہ آج بھی بعض سکہ بند کمیونسٹ کہہ رہے ہیں کہ ایوب خاں کا دور محض جاگیردار طبقے اور سامراجی قوتوں کی حکمرانی قائم رکھنے کے لئے وجود میں آیا تھا اور یہ عالمی سرمایہ داری نظام کے ایک جزو کے طور پر پاکستان میں گماشتہ سرمایہ داری نظام کی نشوونما میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا مگر یہ نقطہ نظر حقائق سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے اور اگر کوئی شخص آنکھیں بند کر کے چلے تو خواہ وہ کتنا ہی سمجھدار اور ہوشیار کیوں نہ ہو کسی کھڈ میں گرنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

آخر وہ کیا تبدیلیاں تھیں؟ وہ کیونکر وقوع پذیر ہوئیں؟ اور ان سے کیا نتائج نکلے؟

اس تھیسس پر تو تقریباً سبھی متفق ہیں کہ پاکستان میں امریکی سامراج نے برطانوی سامراج کی جگہ لے لی اور پاکستانی معاشرہ کا سامراجی استحصال بدستور قائم رہا لیکن سمجھنے کی

بات یہ ہے کہ استحصال کرنے والی سامراجی طاقتوں نے بیسویں صدی کے نصف کے بعد لوٹ کی کون سی پالیسی اختیار کی؟ کیا پرانے استحصالی طریقے ہی استعمال کئے گئے یا بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئے طریقے استعمال میں لائے گئے۔ پرانے استحصالی طریقوں کے مطابق تو سامراج محکوم ممالک پر بزور شمشیر قبضہ کر کے کھلے بندوں بلا جھجک اور ہٹ دھرمی سے حکمرانی اور لوٹ مار کرتا تھا۔ لیکن عظیم سویٹ انقلاب کے بعد اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ طریقہ استعمال کرنا ممکن نہ رہا۔ کیونکہ اس پالیسی کو سویٹ یونین اور محکوم ملکوں کی آزادی کی تحریکیں قدم قدم پر چیلنج کر رہی تھیں۔ لہٰذا نئے حالات میں نئے استحصالی طریقے اختیار کئے جانے لگے۔ سماجیات کے سائنٹیفک مفکروں نے لوٹ کھسوٹ کے اس نئے نظام کو نئے نوآبادیاتی نظام کے نام سے موسوم کیا ہے اس نظام کا ایک پہلو تو غیر مساوی شرائط پر مبنی تجارت اور مشروط قرضوں کے ذریعے نوآزاد ممالک کی معیشت کو اپنے پنجوں میں جکڑنا تھا لیکن اس کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ دلفریب دھوکے کی ٹٹی تھا جس کے مطابق نوآزاد پسماندہ ممالک میں طفیلی اور گماشتہ سرمایہ داری نظام کی نشوونما تھی۔ اس پالیسی کے نتیجے میں ایک طرف محکوم اور محتاج معیشت نشوونما پاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ انداز میں ترقی ہوتی نظر آتی ہے اور ملکی معیشت میں تبدیلیاں بھی وقوع پذیر ہوتی ہیں لیکن ترقی کا یہ راستہ عالمی سرمایہ داری نظام کے اندر نوآزاد ممالک کی پسماندگی کو بھی ترقی دیتا ہے اور آزاد معیشت وجود میں نہیں آتی۔ بلکہ ایسے ممالک کی معیشت مکمل طور پر سامراجی ممالک کی محتاج ہو کر رہ جاتی ہے اور اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ اسے ہمیشہ سامراجی بیساکھیوں کی ضرورت رہتی ہے۔ ترقی کے اس راستے پر چلتے ہوئے بھاری اور بنیادی صنعتیں قائم نہیں کی جاتیں تاکہ وہ اپنی ضروریات کے لئے مشینری اور کل پرزے خود تیار نہ کرنے لگیں۔

اس نئے دور میں محض کچا مال، روئی اور پٹ سن وغیرہ ہی پسماندہ ممالک سے درآمد نہیں کی جاتی۔ بلکہ دھاگہ، کھدر، کپڑا اور اسی قسم کی دوسری اشیاء جن میں پسماندہ ممالک کے صنعتی مزدوروں کی سستی محنت صرف ہوئی ہوتی ہے بھی درآمد کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف ان ممالک میں ادویات اور مشروبات وغیرہ بنانے کے لئے براہ راست سرمایہ کاری کی جاتی ہے اور کئی گنا زیادہ قیمت وصول کی جاتی ہے۔ جب سے کثیر الاقوامی کمپنیاں وجود میں آئی ہیں وہ ان پسماندہ ممالک میں مختلف پرزے بنانے کے کارخانے بھی لگاتی ہیں اس طرح

مینو فیکچرنگ کے ابتدائی مراحل پسماندہ ممالک میں مکمل کئے جاتے ہیں اور ان مراحل کے لئے بھی سامراجی ممالک جو مشینری سپلائی کرتے ہیں وہ چند سالوں میں پرانی اور فرسودہ ہو جاتی ہے اور نئی ایجادات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ چنانچہ پسماندہ ممالک کو گردن توڑ مقابلہ کے لئے نئی مشینری خریدنی پڑتی ہے۔ اس طرح ترقی یافتہ سامراجی ممالک کی منڈی میں توسیع ہوتی رہتی ہے اور اس منڈی کو مزید وسیع کرنے کے لئے زراعت میں بھی سرمایہ داری نظام کی نشوونما کی جاتی ہے۔ اس عمل کے ذریعے پرانے پیداواری طریقوں کے کئی مراحل ختم ہو جاتے ہیں دیہات میں سرمایہ دار جاگیردار' امیر کسان اور پیٹی بورژوازی پیدا ہوتی ہے منڈی مزید وسیع ہوتی ہے لیکن بیروزگاری بھی بڑھتی ہے اور یہ بے روزگار شہروں کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح طفیلی صنعتوں کو سستے مزدور مہیا ہوتے ہیں اور یوں سرمایہ دارانہ نظام کی نشوونما کا عمل جاگیرداروں کے ساتھ مفاہمت کے ذریعے جاری رہتا ہے۔ سماج نہایت ہی سست رفتاری سے سرمایہ دارانہ ترقی کے ساتھ ساتھ عوام کے لئے بے پناہ مصائب و مشکلات اپنے جلو میں لئے ترقی کی منازل طے کرتا ہے' چند گھرانے دولت کے انبار لگاتے ہیں مگر عوام کی اکثریت بے روزگاری اور غربت کے گھیرے میں آ جاتی ہے۔

مگر یہ راستہ بے شمار مسائل کو جنم دیتا ہے اور عوام کے لئے نہایت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے آرزوؤں اور خواہشات کو بڑھاتا ہے' لیکن محرومیوں کو دوچند کرتا ہے اور ملکی معیشت کا یہی راستہ پاکستان کے حکمرانوں' چولا بدلتے ہوئے جاگیرداروں' گماشتہ سرمایہ داروں اور افسر شاہی (سول اور فوجی) نے پاکستان میں اختیار کر رکھا ہے۔

پرانے نوآبادیاتی نظام میں افسر شاہی اور جاگیردار سامراج کے درجہ اول کے اور بڑے معاون تھے۔ اب افسر شاہی (فوجی اور سول) اور گماشتہ سرمایہ دار اول درجہ کے بڑے معاون ہیں اور جاگیردار محض ان کے تابع مہمل ہیں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو سرمایہ دار جاگیردار بنانے کی سر توڑ کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور سامراج کے مہیا کئے ہوئے مشروط قرضوں کے ذریعے آہستہ آہستہ اس زینے پر چڑھ رہے ہیں۔ پہلے جاگیرداری نظام کو قائم رکھنا مقصود تھا مگر اب مقصد طفیلی سرمایہ داری نظام کی نشوونما ہے جس سے سامراجی طاقتوں کے لئے منڈی وسیع ہوتی ہے اور پسماندہ ترین علاقے بھی بین الاقوامی سرمایہ داری نظام کی منڈی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ پہلے صرف پسماندہ کسانوں کی لوٹ کی جاتی تھی۔ اب سستے صنعتی مزدوروں کی بھی لوٹ کی جاتی ہے۔ اس نظام میں دیہاتی سماج میں پرانے دقیانوسی غیر حاضر جاگیرداروں

کا سیاسی اثر و رسوخ قدرے کمزور ہوتا ہے اور تھانہ' تحصیل اور ضلع کی سطح پر نئے امیر کسانوں' آڑھتیوں اور نئے کاروباری لوگوں کا اثر و رسوخ بڑھتا ہے۔ جاگیردار خاندانوں اور عوام کے پرانے بندھن ٹوٹتے ہیں۔ دفاتر میں افسر شاہی سفارش اور ڈالیوں سے مرعوب نہیں ہوتی۔ سودا نقد بہ نقدی ہوتا ہے۔ سفارش کی جگہ رشوت لے لیتی ہے۔ افسر شاہی کے مقامی ٹاؤٹ اور خدمتگار وجود میں آ جاتے ہیں اور نودولتیوں کا ایک حصہ پرانے جاگیرداروں کی قدم قدم پر مزاحمت کرتا ہے۔ ان کی ہمہ وقت غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتا ہے اور پرانے رعونت بھرے' رویئے اور دبدبے کے طریقوں کو ختم کر کے افسر شاہی کے ساتھ براہ راست اثر و رسوخ قائم کرتا ہے پرانے جاگیرداروں کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کلجگ کا زمانہ آ پہنچا ہو جیسے قیامت برپا ہو رہی ہو۔ کیونکہ سماج کے تمام بندھن اور رکھ رکھاؤ بتدریج ختم ہوتے چلے جاتے ہیں اگرچہ ان کے معاشی حالات بھی پہلے سے قدرے بہتر ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن ان کی نئی بیداری اور خواہشات اور ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اس نظام میں سامراج کے مشروط قرضوں اور گماشتہ سرمایہ داری کی نشوونما کے لئے ایک طرف تو پاکستان کو اپنی سیاسی آزادی گروی رکھنی پڑی اور پاکستان کی سرزمین پر امریکی جاسوسی اڈے قائم ہو گئے اور دوسری طرف ملک میں آمرانہ حکومت قائم ہو گئی۔ دراصل موجودہ دور کے اس نظام میں سامراج اور آمریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور وہ ایک دوسرے کا سہارا لئے بغیر پنپ نہیں سکتے۔

ہم نے مندرجہ بالا بحث کے دوران پاکستانی سماج میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ دو نئے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ ایک عنصر تو ریاستی سرمایہ داری اور پبلک سیکٹر کا ہے جس کے متعلق ہم نے وضاحت کی ہے کہ وہ کیونکر وجود میں آیا اور وہ کس طرح گماشتہ سرمایہ داروں کی امنگوں اور آرزوؤں اور مفادات کے خلاف ہوتے ہوئے بھی ان کی مدد کر رہا ہے۔ دراصل پچھلے تین صد سال کے سماجی ارتقا کے دوران قومی سرمایہ داروں نے کبھی بھی پبلک سیکٹر کے قیام کے مطالبہ کا پرچم بلند نہیں کیا۔ البتہ 30-1929ء کے بعد ترقی یافتہ صنعتی سامراجی ممالک نے عالمی سرمایہ داری نظام کے ہمہ گیر اور گہرے بحران سے نپٹنے کے لئے معیشت میں نجی سرمایہ داری کی مدد کے لئے ریاستی مداخلت کو جائز قرار دیا اور کئی ممالک میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں نے اقتدار میں آنے کے بعد بنیادی

اور بھاری صنعتوں کو سرمایہ داری نظام کی ضرورت اور عوام کی بہتری اور مسائل کے حل کے لئے قومیایا ہے کیونکہ نئے سائنسی اور تکنیکی انقلاب نے ریاستی اجارہ دارانہ سرمایہ داری کو اس راستے پر مزید آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ خاص طور پر جنگی صنعت اور خلائی تسخیر کے شعبے ریاستی ملکیت اور نگرانی میں نشوونما پا رہے ہیں۔ لیکن پاکستان میں روز اول سے ہی معروضی حالات نے پبلک سیکٹر میں کچھ صنعتوں کا قیام ناگزیر بنا دیا ہے۔

دوسرے پاکستان میں سرمایہ دار طبقہ کے جسم پر جنم دن سے ہی گماشتہ اور طفیلی ہونے کے نشان لگے ہوئے ہیں۔ اس کی پیدائش ہی گماشتگی اور محتاجی میں ہوئی ہے جس نے اسے آزاد خیالی اور جمہوریت کے جذبات سے تہی دامن رکھا ہے۔ اس میں کس بل اور طاقت ہی نہیں کہ وہ سامراج سے گلو خلاصی اور دقیانوسی قبائلی اور جاگیرداری سماج کو انقلابی طریقوں سے بدلنے کے لئے جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہوئے رہنمایانہ کردار ادا کرتا۔ کیونکہ اس کا کردار محتاجی اور جی حضوری سے ہی پروان چڑھا ہے' اس لئے وہ قومی جمہوری انقلاب کی رہنمائی کرنے کی صلاحیتوں سے یکسر عاری رہا ہے۔ بلکہ وہ ہر نازک موقعہ پر اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے قومی جمہوری طاقتوں کے خلاف صف آرا رہا ہے۔ اور ان رجعت پسند طاقتوں کا ساتھ دیتا رہا جو ترقی پسند قوتوں کی زبان گدی سے کھینچ لینے کا اعلان کر رہی تھیں۔ اور پاکستانی معاشرے کو ایک منجمد' پسماندہ اور رجعتی معاشرہ بنانے پر تلی ہوئی تھیں اور نئے پیداواری تعلقات اور قوتوں نے جو نئے خیالات پیدا کئے تھے ان کی زبان بندی کرنے کے لئے پرچار کر رہی تھیں۔

ان دو بنیادی عناصر کی وجہ سے قومی جمہوری انقلاب' عوامی جمہوری انقلاب میں بدل گیا۔ لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ عوامی جمہوری انقلاب کا قومی جمہوری انقلاب سے کوئی تعلق یا ربط نہیں اور وہ قومی جمہوری انقلاب سے بالکل علیحدہ ہے اور کیا پاکستانی انقلاب قومی جمہوری انقلاب کی سٹیج عبور کر گیا ہے اور ہم ایک بالکل نئے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ دراصل عوامی جمہوری انقلاب کی اصطلاح ایک جامع اور وسیع اصطلاح ہے اور قومی جمہوری انقلاب اس وسیع اصطلاح کے مطابق عوامی جمہوری انقلاب کا ہی ایک حصہ ہے چونکہ اس دور میں پاکستانی انقلاب کی مخالف طاقتوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلے اس انقلاب کی مخالف طاقتیں۔ سامراج جاگیردار طبقہ اور افسر شاہی تھی مگر اب سامراج جاگیردار طبقہ اور افسر شاہی کا گماشتہ سرمایہ دار طبقہ بھی اس کا حلیف بن گیا۔ اور

وہ ایک مضبوط حلیف کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اور اب افسر شاہی (فوجی اور سول) نے جو خود سرمایہ دار اور جاگیردار بن رہی ہے۔ ان طبقوں کی رہنمائی حاصل کر لی ہے اور اس کی بالادستی مستحکم طور پر قائم ہو گئی ہے اس لئے عوامی جمہوری انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ سرمایہ دار طبقہ کے اس حصہ کو جو گماشتہ اور اجارہ دار ہے' اور سامراج اور افسر شاہی سرمایہ دار جاگیردار کے ساتھ مربوط ہے اور اس کی رہنمائی قبول کئے ہوئے ہے' بھی سامراج اور نئے اور پرانے جاگیرداری نظام کے ساتھ اپنا نشانہ بنائے۔ پہلے پبلک سیکٹر کا قیام انقلاب کا نشانہ نہ تھا' اب پبلک سیکٹر کا قیام اس انقلاب کے پروگرام میں شامل ہے۔ پہلے اس انقلاب کی رہنمائی سرمایہ دار طبقہ کو کرنی تھی۔ اب سرمایہ دار طبقہ اس انقلاب کی رہنمائی کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ اگرچہ اس کا ایک حصہ جو محب وطن اور جو سامراج کا گماشتہ نہ ہو' انقلابی قوتوں کی صفوں میں شامل ہو سکتا ہے لیکن وہ اس کی رہنمائی نہیں کرے گا۔

چونکہ پاکستانی انقلاب کے پروگرام میں پبلک سیکٹر کا قیام شامل ہے اور اس کی رہنمائی سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں نہ ہو گی۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عوامی جمہوری انقلاب سوشلسٹ انقلاب کا ہی دوسرا نام ہے یا یہ انقلاب سوشلسٹ انقلاب سے بالکل الگ تھلگ ہے اور علیحدہ ہے؟

عوامی جمہوری انقلاب نہ تو سوشلسٹ انقلاب ہے اور نہ ہی مکمل طور پر سوشلسٹ انقلاب سے علیحدہ ہے۔ بلکہ عوامی جمہوری انقلاب کا سوشلسٹ انقلاب سے ایک ربط بھی اور یہ اس سے علیحدہ بھی ہے اور سوشلسٹ انقلاب سے ربط اور علیحدگی کی یہ دونوں خصوصیات عوامی جمہوری انقلاب کی خصوصیات ہیں۔ یہ علیحدہ اس لئے ہے کہ اس کا اولین کام قومی جمہوری انقلاب کی تکمیل ہے اور اس کی تکمیل مزدور طبقہ اور اس کی پارٹی کی رہنمائی میں ہی ہو گی۔ لیکن ابتدائی مراحل میں اس کے حلیفوں کا دائرہ کار بہت وسیع ہو گا۔ ربط اس لئے ہے کہ پبلک سیکٹر کا قیام اس میں شامل ہے اور سرمایہ داری نظام میں پبلک سیکٹر کا قیام یعنی ریاستی سرمایہ داری اس نظام کی سیڑھی کا آخری زینہ ہے اور اس سے اگلا قدم سوشلزم کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ اگلا قدم اٹھانے کے لئے ملکیتی رشتے بدلنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ افسر شاہی انتظامیہ کی جگہ پرولتاری انتظامیہ کو ہی قائم کرنا ہوتا ہے۔ دوسرے عوامی جمہوری انقلاب کا سوشلسٹ انقلاب سے ربط اس لئے بھی ہے کہ گماشتہ اجارہ دار اور افسر شاہی (فوجی اور سول) سرمایہ دار جاگیردار طبقہ بھی اس کا نشانہ ہے۔

1969ء کے بعد سماجی ارتقاء

اس دور میں محتاج سرمایہ دارانہ ترقی اور آمرانہ حکومت کی وجہ سے قومی سوال جو پہلے صوبجاتی خود مختاری تک محدود تھا' کھل کر سامنے آ گیا۔ یحییٰ خان نے اپنی صدارت کو قائم رکھنے کے لئے اس امید سے کہ کوئی بھی سیاسی پارٹی اکیلی پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی ون یونٹ کو توڑ کر ملک میں پہلی بار غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کروائے۔ لیکن چونکہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے بھاری اکثریت سے کامیاب ہو کر بلا شرکت غیرے مرکز میں حکومت قائم کرنے کی طاقت حاصل کر لی اس لئے یحییٰ خان نے جرنیلوں جماعت اسلامی اور پیپلز پارٹی کی ملی بھگت سے انتقال اقتدار سے انکار کر دیا اور مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کا راستہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں پاکستان سے الگ ہو کر بنگلہ دیش وجود میں آ گیا۔

مشرقی پاکستان میں 1971ء کی ذلت آمیز شکست کے بعد' فوجی اور سول افسر شاہی (جس نے امریکی سامراج کی مدد اور اعانت سے جاگیردار طبقے اور گماشتے سرمایہ داروں پر مکمل بالادستی حاصل کر لی تھی) اپنا سارا وقار اور عزت کھو چکی تھی اور وقتی طور پر عوام کی نظروں میں ملک دشمن سمجھی جانے لگی تھی۔ اس سانحہ کے بعد عوام کی جمہوری قوتیں اور بھی بڑھ اور پھیل رہی تھیں۔ ان حالات میں امریکی سامراج کی اشیر باد کے ساتھ فوجی اور سول افسر شاہی نے طوعاً" و کرہاً" بچے کھچے پاکستان میں پیپلز پارٹی کے رہنما ذوالفقار علی بھٹو کو (جس نے اسلام ہمارا دین ہے' جمہوریت ہماری سیاست ہے' اور سوشلزم ہماری معیشت ہے اور اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں' کے نعرے اپنے منشور کی پیشانی پر درج کر رکھے تھے) اقتدار کے حصول میں مدد دی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے (جو ایک فیوڈل سوشلسٹ تھے اور جس نے ملتان میں بڑے بڑے زمینداروں کو ساتھ ملانے کے لئے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ سوشلزم کی راہ روکنے کے لئے آئے ہیں) کروڑوں محنت کش اور غریب عوام کے ابلتے ہوئے جذبات کی تسکین کے لئے دوبارہ زرعی اصلاحات کا اعلان کیا۔ پہلی بار تو مزارعین میں تقسیم کرنے کے لئے کوئی زمین ہی میسر نہ آئی۔ دوسری بار چند لاکھ ایکڑ اراضی بلا معاوضہ مزارعین میں تقسیم کر دی گئی دیہات میں پانچ مرلہ سکیم نافذ کی گئی۔ شہروں میں کچی آبادیوں کے مکینوں کو مالکانہ حقوق دینے کا اعلان کیا گیا۔ ریاستی ڈھانچہ کو مضبوط کرنے اور حریف گماشتہ سرمایہ

داروں کی طاقت کو توڑنے کے لئے بڑی بڑی صنعتوں اور بنکوں کو قومی ملکیت میں لے کے انہیں افسر شاہی کے کرپٹ انتظام میں دے دیا۔ اس کے بعد کئی چھوٹی چھوٹی صنعتوں۔ آٹے کی ملوں اور دھان کے کارخانوں اور جیننگ فیکٹریوں کو بھی قومیا لیا گیا۔ لیکن نہ تو سامراجی بنکوں کو چھوا گیا اور نہ ہی سامراجی سرمائے کو قومیایا گیا۔ زمینداری نظام کو ختم کرنے کی بجائے زرعی شعبہ میں سرمایہ دارانہ ترقی کے لئے مزید سہولتیں مہیا کی گئیں۔

1968-70ء کی جمہوری تحریک کے دباؤ نے اگرچہ 1973ء کے آئین کو جنم دیا جو اس بات کا مظہر تھا کہ جمہوری انقلاب ایک قدم آگے بڑھا ہے۔ لیکن جلد ہی فیوڈل ازم اور امریکی سامراج کے ہمہ گیر اثر و رسوخ نے (جسے قائم رہنے دیا گیا تھا) تمام پالیسیوں کا رخ رجعت پسند راستے کی طرف موڑ دیا۔

بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی مزدور تحریک کو دبانے کے لئے اعلان کیا کہ "سٹریٹ پاور---- (گلیوں کی طاقت) کو سٹیٹ پاور (ریاستی طاقت) سے کچل دیا جائے گا۔ چنانچہ عبرتناک درس دینے کے لئے کراچی کے نہتے مزدوروں پر اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی جس سے درجنوں مزدور جان بحق ہو گئے 1973ء کے آئین میں پیپلز پارٹی کی پارلیمنٹ میں اکثریت کے بل بوتے پر یک طرفہ طور پر غیر جمہوری ترامیم کر دی گئیں۔ قوم دشمن سرگرمیوں کو کچلنے کے نام پر چھوٹی قومیتوں کے حقوق سلب کر لئے گئے۔ لیاقت باغ میں اپوزیشن کے پرامن جلسے پر فائرنگ کر کے بے شمار جانیں تلف کر دیں۔ بلوچستان میں نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کی حکومت کو برطرف کر کے فوجی ایکشن کر دیا جس میں ساڑھے چار ہزار بلوچی اور چار ہزار فوجی کام آئے۔ خواجہ رفیق، محمد احمد خاں، ڈاکٹر نذیر اور مینگل کا بیٹا قتل کروا دیئے گئے۔ اپوزیشن کے سیاسی نظربندوں کی جیلوں میں بے عزتی کی گئی۔ معمولی سا اختلاف رکھنے والوں کے خلاف بھی ایسے ایسے اقدامات کئے گئے کہ جمہوریت کی روح کانپ اٹھی ملک میں جب تک پیپلز پارٹی کی حکومت رہی ہنگامی حالت قائم رہی 1973ء کے آئین کے باوجود دفعہ 144 سارے ملک میں نافذ رہی اور ان رجعتی اقدامات اور بھیانک واقعات پر پردہ ڈالنے کے لئے پیپلز پارٹی کے پیٹی بورژوا نعرہ باز عناصر حقائق کے برعکس بے سروپا کھوکھلے نعرے لگاتے رہے اور اپنی حرکات سے رجعت پسند طاقتوں کو مضبوط اور ترقی پسند قوتوں کو کمزور کرتے رہے، حتیٰ کہ 1977ء کے دوران چند نشستوں پر کھلی دھاندلی کی وجہ سے عوام کے ایک حصہ میں غم و غصہ کا لاوا پھٹ پڑا۔ 1968-70ء میں جمہوری تحریک نے ایک

قدم آگے بڑھایا تھا لیکن 1977ء میں وہ دو قدم پیچھے چلی گئی جس کے لئے یہ حالات پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں رجعتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی بجائے قائم رکھنے کی تگ و دو کی وجہ سے پیدا ہو چکے تھے۔

چنانچہ 5- جولائی 1977ء کو امریکی سامراج کی مدد سے ایک بنیاد پرست اور نہایت ہی رجعت پسند مارشل لاء ایک بار پھر نافذ کر دیا گیا۔

1973ء کے آئین کو نہایت ہوشیاری اور عیاری سے گہرا دفن کر دیا گیا۔ ہائی کورٹ کے اختیارات چھین لئے گئے بنیادی حقوق ختم کر دیئے گئے' فوجی اور شرعی عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ جمہوری نظریات اور خیالات کو بنیاد پرستی کی کند چھری سے ذبح کیا جانے لگا۔ امریکی سامراج اور بین الاقوامی رجعت پسندی کے ساتھ گٹھ جوڑ کو مضبوط کیا جانے لگا۔ پاکستان کی معیشت کو مکمل طور پر سامراج کی ماتحتی میں دے دیا گیا' جو صنعتیں قومی ملکیت میں لی گئیں تھیں وہ ایک ایک کر کے نجی شعبے میں منتقل کی جانے لگیں۔ پبلک سیکٹر کو بڑھانے کی بجائے کم کر دیا گیا۔ زرعی اصلاحات کو طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا۔ اور زراعت کے شعبہ میں ایک بار پھر تمام تر زور سرمایہ دارانہ طریق کاشت پر صرف کیا جانے لگا۔

مارشل لاء کو دوام بخشنے کے لئے پاکستان کی سرزمین کو ایک بار پھر امریکی سامراج کے بین الاقوامی مفادات کی حفاظت کے لئے استعمال کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی حتیٰ کہ 1985ء میں پاکستان کی سرزمین سے افغانستان شب خون مارنے والے "مجاہدین" کو سی آئی اے نے 450 ملین ڈالر فوجی اور غیر فوجی امداد بہم پہنچائی اور اس طرح پاکستان کو ایک غیر اعلان شدہ جنگ میں پھنسا دیا گیا۔ اور پاکستان کی آزادی اور یک جہتی کو خطرے میں ڈال دیا گیا۔ اس بنیاد پرست طویل ترین رجعتی مارشل لاء نے ایک بار پھر سندھ' بلوچستان' صوبہ سرحد میں قومیتوں کے سوال کو ایک حل نہ ہو سکنے والے مسئلے کی حیثیت سے لا کھڑا کیا۔ اور لوگوں کو کنفیڈریشن کا نعرہ لگانے پر مجبور کر دیا گیا۔

مارشل لاء کے ساڑھے آٹھ سال کے دوران پاکستان کی معیشت مشروط سامراجی قرضوں اور بیرون ملک گئے ہوئے محنت کشوں' کاریگروں اور ماہرین کی بھیجی ہوئی رقوم کی بیساکھیوں کے ذریعے قائم رکھ کر پاکستانی سماج میں گہرے تضادات کو جنم دیتی رہی اور 85-1984ء کے اختتام پر پاکستان تقریباً سوا دو صد ارب روپے کے مقروض ہو گیا اور اس کا تجارتی خسارہ 38 ارب تک پہنچ گیا۔ اس کے بجٹ کا 76 فیصدی دفاع اور بیرونی قرضوں کی ادائیگی پر صرف

ہونے لگا۔ پاکستان کی معیشت مکمل طور پر سامراجی شکنجے میں جکڑ دی گئی حتیٰ کہ پاکستان کے اندر پیدا ہونے والی اشیاء کی قیمتیں اور نرخ بھی عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ مقرر کرنے لگے۔ بیرونی بنکوں اور سرمائے کاری کے لئے دروازے کھول دیئے گئے اور اس نئے نظام معیشت کو قائم رکھنے کے لئے مارشل لاء کو 73ء کے یکسر ترمیم شدہ آئین کا نیا لبادہ پہنانے کے اقدامات کئے جانے لگے۔

عوامی جمہوری اور قومی جمہوری انقلاب کی اصطلاحیں

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ آجکل بائیں بازو کے مختلف حلقوں میں قومی جمہوری انقلاب اور عوامی جمہوری انقلاب کی اصطلاحتوں کے متعلق ایک زبردست بحث چل رہی ہے۔ لفظوں کی جنگ میں طعن و تشنیع کے تیکھے تیر ایک دوسرے پر چلائے جا رہے ہیں۔ بعض اوقات ذاتی اختلافات اور خود غرضی پر مبنی خواہشات کو نظریاتی اختلافات کی شکل دے دی جاتی ہے۔ جیسے اسلام کے نام لیواؤں میں سینکڑوں فرقے باہم دست و گریبان ہیں اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز بھی ادا کرنے کو تیار نہیں ویسے ہی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں سوشلزم کی تحریک نئی نئی کامیابیوں سے ہمکنار ہو رہی ہے اور مختلف ملکوں میں سوشلسٹ نظام اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ ریز ہو رہا ہے اور نئی نئی سہولتیں' آسائشیں اور رعائتیں مہیا کر رہا ہے نئے اخلاق اور بھائی چارے کی نشوونما کر رہا ہے' پاکستان میں سوشلزم کے علمبردار بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ اور لفظوں کے ہیر پھیر اور اصطلاحوں کے پیچ و خم میں گرفتار ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ شراب کی محفلوں میں اپنے دشمنوں سے تو جام ٹکرا سکتے ہیں۔ لیکن چائے کی پیالی پر اپنے ہم سفروں کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ انقلابی فکر کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے بحث مباحثہ اور نکتہ چینی خود تنقیدی کے انقلابی طریقے اپنانے کی بجائے ایک دوسرے کے خلاف من گھڑت اور جھوٹے الزامات تراشنے کے ماہر بن گئے ہیں۔ وہ نظریے کو عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے قائل نہیں رہے۔ بلکہ حقیقی عمل سے گریز ان کی سوچی سمجھی پالیسی بن گئی ہے۔ اور بے عملی اور بے حسی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ پاکستانی انقلاب برپا کرنے کے لئے دوربینی کی بجائے محض وقتی اور فوری مفادات کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور ایک دوسرے کی کاٹ کرنے کے دھندے کو اعلیٰ مقصد قرار دیتے ہیں۔ مختلف گروہوں میں یہ دوڑ لگی ہوئی ہے کہ روشنی کے مینار تک رسائی پہلے کون حاصل کرتا ہے اور کون اس محفل میں رونق افروز ہوتا ہے۔ چنانچہ کچھ انقلابیوں کا تو کام ہی صرف جھوٹے دعوؤں کی خوبصورت رپورٹیں تیار

کرنا اور عالمی سوشلسٹ تحریک سے تسلیم کئے جانے کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ گو اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان سب باتوں کے باوجود انقلاب کا فیصلہ پاکستانی عوام کو کرنا ہے اور وہ پاکستان کی سرزمین پر ہی برپا ہونا ہے اور اسے پاکستان کے سماجی حالات میں پایہ تکمیل تک پہنچنا ہے۔

پاکستان کے بائیں بازو کا ایک المیہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی بدلتی ہوئی پاکستانی حقیقتوں کا گہرا اور سنجیدہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس لئے وہ ان حقیقتوں کے تجزیے کی بناء پر اپنی پالیسی نہیں بنا پاتے' 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے حالات ہندوستان سے یکسر مختلف تھے لیکن پاکستان کے انقلابی ایک عرصہ تک ان حقائق کو نہ پہچان سکے جو تقسیم ہند کا موجب بنے اور اس کے بعد جو ریاست وجود میں آئی اس کا ادراک بھی سطحی طریقے سے ہی کیا گیا۔ وہ بین الاقوامی انقلابی تحریک کی عمومی لائن اور ہندوستان کی پارٹی کے تھیسس کو بغیر کوئی تبدیلی کئے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے رہے اور اس عمومی لائن کو پاکستان کے حالات کی روشنی میں عمل میں لانے کی بجائے جوں کا توں ہی رہنے دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کبھی بائیں بازو کی کج روی کا شکار ہوئے اور اپنی تباہی کا سامان کر ڈالا اور کبھی دائیں بازو کی کج روی کا شکار ہو کر اپنا تشخص کھو بیٹھے۔ ہندوستانی کمیونسٹ پہلے پروفیسر کوپ لینڈ کی زونل فیڈریشن کی سکیم کو (جسے قائداعظم نے تسلیم کر لیا تھا لیکن کانگرس نے نامنظور کر دیا تھا) برطانوی سامراج کی سازش قرار دے کر مخالفت کرتے رہے۔ پھر قوموں کے حق خود ارادیت کے نام پر تحریک پاکستان کی حمایت کرتے رہے اور جب پاکستان بن گیا تو اسے محض سامراجی سازشوں کا نتیجہ گردانے لگے۔ پاکستان میں مذہب کے کردار کے متعلق تو کبھی سوچا ہی نہیں گیا اور اگر کبھی سوچا بھی گیا تو بالکل منفی انداز میں۔ کسی مارکسی تجزیئے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی کہ اسلام کا تاریخی مادیت کی روشنی میں سماجی ارتقاء میں کیا کردار تھا وہ کیونکر اتنی جلدی اس قدر مقبول ہوا اور ہر چہار سو چھا گیا اور آج تک اپنے تمام تر انتشار کے باوجود کیوں اس قدر ہمہ گیر اور مضبوط ہے اور لوگوں کے ذہنوں کو مسخر کئے ہوئے ہے موجودہ حالت میں اس کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے' روایتی کبوتر کی طرح محض آنکھیں بند کر لینی چاہئیں یا براہ راست اسے تنقید کا نشانہ بنانا چاہئے یا کوئی تیسرا راستہ اختیار کرنا چاہئے اور اسے تاریخی مادیت کی روشنی میں پرکھنا چاہئے۔

پاکستان کے بائیں بازو کے بعض حلقے تو ہمیشہ میکانکی طریقے سے کام لیتے رہے ہیں' وہ

پاکستان کی معیشت اور سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعہ کی بجائے محض بین الاقوامی تحریک کی خوشہ چینی کرتے ہیں اور دوسرے ملکوں کی انقلابی تحریکوں کے متعلق لکھی جانے والی دستاویزات سے اقتباسات اکٹھے کر کے ان کے مطابق اپنا تھیسس ڈھال لیتے ہیں جہاں تک دوسرے ملکوں کی کامیاب انقلابی تحریکوں کے لٹریچر سے استفادہ حاصل کرنے کا سوال ہے' یقیناً وہ ضرور کرنا چاہئے' وہ ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے من و عن پاکستان کے حالات پر چسپاں کر دینا عقلمندی اور مارکسی عمل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دوسرے تاریخی حالات میں' دوسرے ممالک میں انقلابیوں کے مخصوص تجربات پر مبنی لٹریچر ہوتا ہے اور پاکستان کے مخصوص حالات میں ان تجربات کا من و عن نفاذ اپنے دامن میں بے شمار خطرات سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی انقلابی تحریک کی لائن' تمام پسماندہ ممالک کے متعلق---- ایک عمومی لائن کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ ہر ملک میں ہر حالت میں اسی لائن پر عمل کیا جائے بلکہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ہر ملک میں اس کے حالات کے مطابق چلا جائے قابل عمل لائحہ عمل مرتب کرنے کے لئے ہمیں ہر ملک کے ٹھوس حالات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے اور انہیں سمجھ کر اس کے مطابق عملی سیاسی لائن اختیار کرنی چاہئے۔ ہر ملک میں اس کی تاریخ' کلچر اور تہذیب کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے۔

اس سلسلے میں ماضی قریب کی انقلابی تاریخ سے ہی بہت سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ 1960ء کے عشرہ کے آخر میں پاکستان کے بائیں بازو کے چند گروہوں کی چینی ثقافتی انقلاب کی چکاچوند سے آنکھیں چندھیا گئیں اور انہوں نے اس کی روشنی سے چار سو چھائے ہوئے اندھیروں میں شمع روشن کرنے کی کوشش کی چین جیسے پسماندہ سماج میں پٹی بورژوا انقلابی نعروں کے ذریعے ایک ہی جست میں اونچ نیچ مٹا دینے کے اقدامات تیسری دنیا کے انقلابیوں میں بہت مقبول ہوئے۔ "ایشیا سرخ ہے" "سوشلزم آوے ہی آوے" "سوشل سامراج" "ترمیم پسندی" "نکسل باڑی' ہماری باڑی' تمہاری باڑی" "انقلاب بندوق کی نالی سے نکلتا ہے" "ہم لانگ مارچ کریں گے" اور اسی قسم کے کئی دوسرے نعرے اور اصطلاحیں گلی گلی کوچے کوچے میں مقبول ہوئیں۔ لیکن ان کا نتیجہ کیا نکلا۔ چین میں لاکھوں انقلابی اور معصوم لوگ جانیں گنوا بیٹھے۔ چین کی سماجی ترقی کئی سال پیچھے چلی گئی حتیٰ کہ آج ہم اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ چین میں بیسوائیں جسم فروشی کرتی ہیں' چینی کمیونسٹ پارٹی تہس نہس ہو گئی' بین الاقوامی اشتراکی تحریک میں پھوٹ پڑ گئی۔ ثقافتی انقلاب کا اولین نعرہ امریکی سامراج سے

بھرپور دشمنی تھا اور پرامن بقائے باہمی کے اصولوں کے مطابق گفت و شنید کے ذریعے معاملات کو حل کرنا ترمیم پسندی۔ لیکن نتیجہ آخر یہ نکلا کہ چینی قیادت امریکی سامراج کے خلاف جدوجہد کرنے کی بجائے اس سے شیر و شکر ہو گئی۔ متذکرہ بالا کئی نعرے اور اصطلاحیں سوشلسٹ تحریک کے نعرے اور اصطلاحیں ہیں اور ان کے اندر بہت بڑی سچائیاں پنہاں ہیں۔ لیکن ہر سچائی وقت اور مقام اور تاریخی اور سماجی حالات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ وقت اور موقع و محل سے بے نیاز ہو کر اسے ہر جگہ چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو اس کے نتائج بڑے بھیانک نکل سکتے ہیں کمیونسٹ مینی فیسٹو کا پہلا فقرہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ "ایک چھلاوے نے سارے یورپ کی نیندیں حرام کر دی ہیں..... کمیونزم کے چھلاوے نے" یہ الفاظ 1848ء میں لکھے گئے تھے۔ ان میں ایک ایسی سچائی پنہاں تھی جسے کارل مارکس کی زیرک نگاہ نے اس وقت دیکھ لیا تھا جبکہ سوشلزم کمیونزم کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ لیکن پچھلے ایک سو چالیس برس میں یہ سچائی آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی ہے، اور دنیا بھر میں اپنا سکہ جما رہی ہے کارل مارکس نے ایک اور حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے لکھا تھا "طاقت تاریخ کی دایہ ہے" لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر وقت' ہر جگہ تشدد کا استعمال ضروری اور جائز ہے۔ ایسی اصطلاحیں سماجی ارتقا کے ہمہ گیر اور عالمی عمل کے واسطے سے استعمال کی جاتی ہیں جزئیات کے تعلق سے نہیں' جزئیات کے متعلق تو یہی کہا جاتا ہے کہ ہر قدم ٹھوس معروضی حالات کو جانچ تول کر ایسی سچائیوں کی روشنی میں اٹھایا جائے لیکن اس کے برعکس یہاں بائیں بازو کے اکثر حلقے ہمیشہ بین الاقوامی انقلابی تحریک کی نقالی پر ہی اکتفا کرتے رہے ہیں۔ چینی ثقافتی انقلاب کی بازگشت ابھی تک پاکستان میں سنائی دے رہی ہے۔ گو چینی ثقافتی انقلاب کے نعروں اور اصطلاحوں کے غبارے پھٹ گئے ہیں لیکن پھر بھی ان کے اثرات باقی ہیں۔ پاکستان میں بائیں بازو کا ایک گروہ ابھی چند سال پہلے تک انقلاب ثور کے خلاف مجاہدین کے کیمپوں میں ان کی ہمت افزائی اور حمایت کے لئے اشتہارات تقسیم کرتا رہا ہے۔ آخر اپنے تجربے کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ پاکستانی انقلاب کے خلاف کام کر رہا ہے۔ لہٰذا اسے اپنی پالیسی بدلنا پڑی۔

بائیں بازو کے بعض حلقے ایک ہی تاریخی دور میں بار بار اپنی سیاسی حکمت عملی بدلتے رہے ہیں۔ لیکن حکمت عملی بدلتے وقت انہوں نے کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ ان کی لائن کہاں غلط تھی؟ کیوں غلط تھی اور ان کی سوچ میں کج روی کو کن حالات نے جنم دیا

تھا۔ اور اس کا ذمہ دار کون تھا؟ اور پھر اس لائن کو بدلنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ قومی جمہوری انقلاب' جس کا وہ اس قدر زور شور سے ڈنکا بجاتے ہیں' کی ہی بنیادی ضروریات کی وجہ سے کبھی وہ متحدہ محاذ پارٹی میں شامل ہوتے ہیں اور اسے انقلابی لائن گردانتے ہیں اور کبھی اس متحدہ محاذ پارٹی کو توڑنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اس عمل کو وقت کا سب سے بڑا انقلابی اقدام کہتے ہیں اور علیحدہ پارٹی کی تشکیل کرتے ہیں۔ لیکن پھر کچھ عرصہ بعد اس لائن کو غلط قرار دیتے ہیں اور نئے سرے سے متحدہ محاذ پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ کبھی وہ پیپلز پارٹی کی مکمل طور پر مخالفت کرتے تھے مگر بعد میں اس کی حمایت کرنے لگے۔ پھر اس کی مخالفت پر اتر آئے لیکن کچھ عرصہ بعد پیپلز پارٹی کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کرنے لگے۔ لیکن جب پیپلز پارٹی نے جمہوریت کی بحالی کے لئے وسیع تر محاذ قائم کیا تو پھر مخالفت کرنے لگے۔ پہلے ایم آر ڈی کو امریکی سامراج کی ایجنٹ قرار دیا لیکن پھر 1983ء کی تحریک کے دوران اس کی حمایت کرنے لگے۔ تھیسس تو وہ قومی جمہوری انقلاب کا دیتے ہیں لیکن اعلان یہ کرتے ہیں کہ پاکستانی سماج سوشلسٹ انقلاب کے دہانے پر کھڑا ہے اور صرف دروازہ کھولنا باقی ہے۔ وہ ایسے حالات میں عوام کو آمریت کا تختہ الٹنے کی آواز دیتے ہیں جبکہ عوام قطعاً" اس کے لئے تیار نہیں ہوتے اور پھر وہ قومی جمہوری انقلاب کی طرف لوٹ آتے ہیں لیکن پبلک جلسوں میں "سوشلزم آوئے ای آوے" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اور اس پر سر دھنتے ہیں' وہ اس معمولی سی بات کو بھی سمجھنے سے عاری ہیں کہ سیاست میں نعروں کا کیا مطلب ہے؟ اور کس طرح نعرے خاص وقت اور خاص حالات میں اس سیاست کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔ جس کا معروضی حالات تقاضا کرتے ہیں۔ ان قلا بازیوں اور بار بار بنیادی پالیسی کی تبدیلی کے باوجود ان کی لیڈرشپ میں تسلسل قائم رہتا ہے۔ یہ اور بھی اچنبھے کی بات ہے۔

ہم بائیں بازو کے تمام حلقوں کی قربانیوں اور نہایت ہی نامساعد حالات میں ان کی مسلسل جدوجہد' ان کی ہمت اور ان کے انقلابی جذبات کی تہ دل سے قدر کرتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں کیونکہ بائیں بازو کے مختلف حلقوں نے بے شمار جیالے انقلابی پیدا کئے ہیں جو اپنے اصولوں کے لئے لڑتے ہوئے۔ قربان ہو گئے ہیں یا سالہا سال سے قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں اور کئی ایک نے تو ہنستے مسکراتے ہوئے تختہ دار کو بھی چوما ہے۔ لیکن ہم ان سیاسی قلا بازیوں' سطحی سوچ اور میکانکی عمل کے نقصان دہ اثرات کی نشاندہی' پاکستانی انقلاب کی صحیح سمت قائم کرنے کے لئے بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

کچھ حلقے قومی جمہوری انقلاب کی اصطلاح کو اس لئے اپناتے ہیں کہ بین الاقوامی ورکرز اور کمیونسٹ پارٹیوں نے 1960ء میں دنیا بھر کے پسماندہ ممالک کے لئے قومی جمہوری انقلاب کا راستہ تجویز کیا تھا۔ وہ عوامی جمہوری انقلاب کی اصطلاح کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ اس اصطلاح سے "ماؤ ازم" کی بو آتی ہے۔

ہم ان دونوں مفروضوں سے متفق نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں مفروضے پاکستانی حالات کے تجزیے کی بنیاد پر قائم نہیں کئے گئے اور محض میکانکی سوچ کی غمازی کرتے ہیں۔ کیونکہ اول تو گزشتہ 25 سالوں میں سوشلسٹ اور سرمایہ داری نظام میں بہت سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ اور نو آزاد پسماندہ ممالک بھی ترقی کی کئی منازل طے کر چکے ہیں۔ دوسرے بین الاقوامی انقلابی تحریک نے پسماندہ ممالک کے متعلق عمومی لائن کے طور پر قومی جمہوری اور عوامی جمہوری انقلاب دونوں اصطلاحیں استعمال کی ہیں' جن کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ ان ممالک میں براہ راست سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کا وقت نہیں ہے بلکہ ان ممالک میں ابھی قومی جمہوری انقلاب بھی تشنہ تکمیل ہے جسے برپا کرنا ضروری ہے۔ یعنی نئے نو آبادیاتی قبائلی اور جاگیرداری نظام کے خاتمے کو اولیت حاصل ہے۔ اس لئے سوشلسٹ انقلاب کے لئے نعرہ بازی قبل از وقت ہے۔

تیسرے انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں وقت قومی جمہوری انقلاب کے پڑاؤ پر آ کر رک گیا ہے۔ بلکہ بین الاقوامی انقلابی تحریک' اور لینن نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ عمومی لائن کو من و عن منتر کے طور پر استعمال نہ کیا جائے بلکہ اس کی روشنی میں کسی خاص ملک کے مخصوص اور ٹھوس حالات کا تجزیہ کر کے اپنا سیاسی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

چوتھے محض اس وجہ سے کہ چونکہ ماؤزے تنگ نے بھی کسی زمانہ میں عوامی جمہوریت کی اصطلاح استعمال کی تھی' اس لئے یہ غلط ہے۔ کوئی مارکسٹ لیننسٹ صرف اس وجہ سے کسی اصطلاح کو رد نہیں کر دیتا کہ وہ اصطلاح فلاں شخص نے خاص حالات میں استعمال کی تھی' جس نے بعد میں غلطیاں کیں۔ یہ اصطلاح مشرقی یورپ کے تمام ان ملکوں کی ریاستوں کے متعلق بین الاقوامی انقلابی تحریک اور سویٹ کمیونسٹ پارٹی نے بھی استعمال کی ہے' جن میں دوسری جنگ عظیم کے بعد مخصوص حالات میں انقلاب برپا کئے گئے اور جن میں نئی طرز کی انقلابی حکومتیں قائم ہوئیں۔ ان میں سے کئی ممالک میں سویٹ یونین کے

برعکس ایک پارٹی کی بجائے کئی سیاسی پارٹیوں کی مخلوط حکومتیں' ورکرز پارٹیوں کی رہنمائی میں قائم ہیں اور جنہیں عظیم سویٹ یونین کی مکمل حمایت' اندرونی رجعت پسندوں اور بیرونی سامراج کی ریشہ دوانیوں کے خلاف حاصل ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد "کامن فارم" کے اخبار کا نام "پائیدار امن کے لئے..... عوامی جمہوریت کے لئے" رکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ عوامی جمہوریت بین الاقوامی انقلابی تحریک کی مرتبہ اصطلاح ہے اور یہ اصطلاح سوشلزم کی ترقی اور بین الاقوامی طاقتوں کے بدلے ہوئے توازن اور مختلف ممالک میں نئی قسم کے انقلابی حالات کی غمازی کرتی ہے۔

ایل۔ آئی۔ بریژنیف نے 1976ء میں اندرونی اور خارجہ پالیسیوں کے متعلق پارٹی کے فوری کام کے سلسلے میں سویٹ یونین کی مرکزی کمیٹی کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا تھا۔ "ان عمومی قوانین کا گہرا ادراک اور ان پر انحصار' تخلیقی عمل کے ساتھ مختلف ممالک کے ٹھوس حالات کو سامنے رکھنا مارکسی لیننسٹ کا طرہ امتیاز ہے۔"

ونودستی پریس ایجنسی پبلشنگ ہاؤس ماسکو صفحہ 27۔

1983ء میں سویٹ یونین میں چھپنے والی ایک کتاب "سرمایہ داری سے سوشلزم کی طرف تبدیلی" میں بحث کے دوران یہ لکھا ہے کہ "عوامی جمہوریت' سرمایہ داری نظام کے گہرے ہوتے ہوئے عام بحران کے دور میں ان ممالک کے تاریخی اور قومی خدوخال کی' جنہوں نے سوشلزم کا راستہ اختیار کیا ہے' عکاسی کرتی ہے' عوامی جمہوریتیں' سویٹ جمہوریہ سے مختلف ہیں۔ لیکن یہ فرق بنیادی نہیں ہے۔ اور صرف چند منفرد پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے جن پر سماج کو منظم کیا جاتا ہے۔ مشرقی یورپ کے کئی سوشلسٹ ممالک نے عوامی جمہوریت کا راستہ اختیار کیا۔ ان میں بلغاریہ' ہنگری جرمن جمہوری ریپبلک' پولینڈ' رومانیہ اور چیکو سلواکیہ شامل ہیں۔" (سرمایہ داری سے سوشلزم تک۔" پروگریس پبلشرز 1983ء۔

ظاہر ہے کہ عوامی جمہوریت کی اصطلاح کا استعمال گناہ کبیرہ نہیں ہے' اور جدید دور میں اکثر استعمال کیا گیا ہے' اس اصطلاح کے نام پر ناک بھون چڑھانا اور اسے سمجھنے کی بجائے قہر آلود نگاہوں سے دیکھنا اور اسے زہر کا پیالہ بنا کر پیش کرنا بانجھ ذہنوں کا وطیرہ ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مختلف پسماندہ ممالک میں جو انقلاب برپا کئے گئے' ان میں سے کئی اس راستے سے ہٹ کر تھے جس راستے پر چل کر عظیم سویٹ انقلاب برپا کیا گیا تھا۔ چینی انقلاب نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس کے ذریعے طویل جنگ

آزاد علاقے، شہروں کا دیہات کے ذریعے گھیراؤ اور وسیع ترین متحدہ محاذ کے پر پیچ راستوں سے گزر کر کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں عوامی جمہوری حکومت قائم کی۔ ویٹ نام میں بھی اس سے ملتا جلتا راستہ اختیار کیا گیا۔ لیکن اس میں اسے بین الاقوامی انقلابی تحریک اور خاص طور پر سویٹ یونین کی زبردست امداد حاصل تھی، ان ہر دو ممالک میں ورکرز اور کمیونسٹ پارٹیوں نے وسیع ترین متحدہ محاذ بنا کر انقلابات کی رہنمائی کی اور کامیابی کے بعد مخلوط حکومتیں قائم کیں۔

لیکن کیوبا میں کمیونسٹ قیادت میں آمریت کا تختہ نہیں الٹا گیا۔ بلکہ مسلح جدوجہد کے ذریعے جب آمریت کو شکست دے کر پہلی بار حکومت بنائی گئی تو اس کابینہ میں اکثریت غیر کمیونسٹوں کی تھی اور خود کاسٹرو اس وقت تک کمیونسٹ پارٹی کا رکن نہیں تھا۔ وہ اپنے تجربات کی بنا پر بہت بعد میں پارٹی کا ممبر بنا اور پھر مخصوص حالات میں کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری بن گیا۔

ایتھوپیا میں فوج کے چند افسروں نے انقلاب برپا کیا اور گلے سڑے شاہی نظام کا خاتمہ کر کے ریاستی ڈھانچے پر قبضہ کر لیا۔ انقلاب کے وقت وہاں انقلابی پارٹی کا کوئی وجود نہ تھا، اب کئی برس بعد ورکرز پارٹی کے نام سے انقلابی پارٹی بنائی گئی ہے۔ اور یہی صورت حال کم و بیش جنوبی یمن کی ہے۔

افغانستان میں مخصوص حالات میں نہایت ہی پسماندہ سماج کے ہوتے ہوئے پیپلز ڈیمو کریٹک پارٹی (عوامی جمہوری پارٹی) کی رہنمائی میں فوج کے ذریعے انقلاب برپا کیا گیا---- افغانستان میں انقلاب کے وقت مزدور طبقہ بہت قلیل تعداد میں تھا اور ملک میں کوئی بڑی صنعت نہ تھی۔ اور نہ ہی تربیت یافتہ، تجربہ کار پرولتاری طبقہ موجود تھا بلکہ وہاں پر ایک نہایت ہی پسماندہ قبائلی نظام قائم تھا۔ اب بھی اس نظام کو یکدم ختم نہیں کیا جا رہا۔ بلکہ حکمران پارٹی (عوامی جمہوری پارٹی) وہاں محب وطن قبائلی سرداروں اور مذہبی رہنماؤں کا تعاون حاصل کر رہی ہے پرانی مسجدیں مرمت کر رہی ہے۔ کابل میں ایک عالیشان نئی مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ علماء کو اپنا فرض یکسوئی سے ادا کرنے کے لئے وظیفے دے رہی ہے۔ اس انقلاب ثور کی کامیابی کی ضمانت سویٹ یونین سے مشترکہ سرحدات نے دی ہے۔ ریاستی ملکیت میں صنعتیں اور دوسرے ادارے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کاروبار، نجی شعبے میں قائم کرنے کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔

قابل غور یہ امر ہے کہ یہ تمام حقائق کس بات کی نشاندہی کرتے ہیں؟ یہ حقائق اس بات کی غماز ہیں کہ بین الاقوامی سطح پر پسماندہ ممالک میں انقلاب برپا کرنے کے متعلق مخصوص لائن ہونے کے باوجود ہر ملک میں حالات مختلف ہونے کی وجہ سے انقلاب مختلف راستوں سے آتا ہے اور یہ راستہ خود کسی ملک کے معروضی حالات متعین کرتے ہیں اس لئے ان خاص حالات کا مطالعہ اور ادراک ضروری ہے اور محض نعرہ بازی' مہم جوئی اور بین الاقوامی لائن کے اطلاق کے سلسلے میں مکھی پر مکھی مارنے سے بات نہیں بنتی۔ بلکہ بات بگڑتی ہے۔ طاقت ضائع ہوتی ہے۔ اور ہر موڑ پر شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انقلابی قوتوں میں انتشار بڑھتا ہے اور انقلاب دشمن طاقتیں بجائے کمزور ہونے کے مضبوط ہوتی ہیں اور ان کی زندگی طویل ہو جاتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ میں تبدیلی کا عمل کبھی نہیں رکتا۔ لیکن یہ سمجھنا کہ انقلابی تبدیلی کی دشمن طاقتیں تبدیلی کے اس عمل کے راستے میں رکاوٹیں نہیں ڈال سکتیں' اور تبدیلی کی رہنما طاقتوں کو وقتی طور پر مغلوب کر کے تبدیلی کے عمل کو روک نہیں سکتیں' درست نہیں ہے' انڈونیشیا اور چلی' مصر اور گرنینڈا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں اور ہمیں ان سے سبق سیکھنا چاہئے۔

ایران کے انقلاب نے تمام انقلابیوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ آج کے حالات میں ایک مذہبی تحریک نے کیونکر بائیں اور دائیں بازو کے متحدہ محاذ کی رہنمائی کرتے ہوئے امریکی سامراج اور اس کے پشت پناہ شہنشاہ ایران کو بے مثال عوامی تحریک اور شہروں میں مسلح جدوجہد کے ذریعے شکست فاش دی ہے' بائیں بازو کے پنڈتوں کو اس سے پہلے مذہب کے سامراج دشمن کردار کے بارے میں اس قسم کا شعور بالکل نہیں تھا۔ پولینڈ کے واقعات بھی ہمارے لئے سبق آموز ہیں جہاں 37 سال سے ایک سوشلسٹ حکومت قائم ہے جو وارسا پیکٹ کی ممبر ہے۔ سی۔ ایم۔ ای۔ اے کی رکن ہے لیکن جہاں موجودہ دور کا انقلابی طبقہ ورکرز پارٹی کی قیادت پر اعتماد کی بجائے ایسی قیادت کے زیر اثر چلا جاتا ہے جو گرجوں کو اپنے ایجی ٹیشن کا مرکز بناتی ہے اور جو اپنی ہڑتالی جدوجہد کے ذریعے سوشلسٹ حکومت کا تختہ الٹنے کی تحریک میں مذہبی جوش و خروش کو استعمال کرتی ہے۔ مذہبی اصطلاحیں اپناتی ہے اور اس کا رہنما جو ٹھیٹھ مزدور طبقے سے تعلق رکھتا ہے کامیابی کے بعد پوپ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ اور انقلاب کو بچانے کے لے مارشل لاء لگانا پڑتا ہے۔

پولینڈ کے حالات کے متعلق عام طور پر ایک سہل سی تاویل کر دی جاتی ہے کہ مشرقی

یورپ کے ملکوں میں انقلاب دراصل محض انقلابی پارٹیوں کی جدوجہد کے ذریعے نہیں برپا ہوا تھا بلکہ سرخ فوجوں نے ان ملکوں میں انقلاب کے لئے راستہ ہموار کیا تھا اور نسبتاً آسانی سے وہاں انقلابی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ اس لئے ابھی تک ایسے واقعات پیش آ رہے ہیں' لیکن اگر یہی بات ہے تو پھر یوگو سلاویہ کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ جہاں کمیونسٹ لیگ نے فاشسٹ فوجوں کے خلاف متحدہ محاذ کی رہنمائی کرتے ہوئے نہایت ہی کٹھن حالات میں گوریلا جنگ لڑی اور بے بہا قربانیاں دیں اور آخر کامیابی حاصل کی۔ گو اتحادی فوجوں اور سرخ فوج کی بھی اسے امداد حاصل ہوئی لیکن بہت دیر بعد جب یوگو سلاویہ کی انقلابی پارٹی مارشل ٹیٹو کی رہنمائی میں کامیابیوں سے ہمکنار ہو رہی تھی۔ لیکن اس تمام جدوجہد کے باوجود یوگو سلاویہ نے ایک ایسا راستہ اختیار کیا جسے بین الاقوامی انقلابی تحریک نے غلط قرار دیا جو دراصل غلط نہیں تھا۔

جب ہم کسی ملک کے مخصوص حالات کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم اسے بین الاقوامی تحریک اور اس کے تجزیے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ کسی ملک کے مخصوص حالات کو بین الاقوامی حالات اور بین الاقوامی انقلابی تجزیہ کی روشنی میں ہی سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔

اوپر بیان کئے گئے واقعات اور تجزیہ سے ظاہر ہے کہ موجودہ گنجلک اور رنگا رنگ دنیا میں ترقی یافتہ سوشلزم اور سامراج کے انحطاط کے اس دور میں ہر ملک کے اپنے اپنے مخصوص حالات ہیں اور وہ بہت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا درست تجزیہ انقلابی تحریک کی حکمت عملی اور طریق کار وضع کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ لیکن اگر بنیادی معروضی حالات کا علم ہی نہ ہو تو تجزیہ کس بات کا کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تو محض چمکدار آنکھیں چندھیا دینے والی انقلابی اصطلاحیں اور غبارہ نما "انقلابی" نعرے ہی بروئے کار لائے جا سکتے ہیں اور وہ نعرے معروضی حالات کے خلاف ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں اور گھٹی ہوئی بانجھ سوچ رکھنے والے انقلابی ان نعروں کے ٹکڑوں کو جوڑ جاڑ کر ان سے پھر کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے کارکنوں کی بے بہا قربانیاں اس لائن کو قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں اس طرح کم از کم عوام کے بھیڑ بھڑکوں سے دور' بند کمروں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی مدح سرائی اور اپنی لائن کی مفروضہ عظیم قربانیوں کے گن تو گائے جا سکتے ہیں اور اپنے آپ کو اصلی تے وڈی' سچی اور اکلوتی انقلابی تحریک کے طور پر پیش کیا جا سکتا

ہے۔ اور اپنے من کی تسلی اور اطمینان کے لئے اسے ٹانک کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر معروضی حالات کا ٹھوس تجزیہ کر کے درست اور نتیجہ خیز لائحہ عمل اختیار نہیں کیا جا سکتا!

ہم نے یہ سطور قومی جمہوری اور عوامی جمہوری انقلاب کی اصطلاحوں کے باہمی ٹکراؤ سے پیش آنے والے حالات کی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے سپرد قلم کی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عمومی لائن کو نتیجہ خیز طریقے سے عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ ٹھوس حالات کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس کے مطابق لائن میں ضروری رد و بدل کیا جائے اور محض مکھی پر مکھی مارنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ بعض اوقات ایسا کرنے سے بہت خطرناک نتائج نکلتے ہیں۔

آخر میں ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر یہ تحریر حرف آخر کے طور پر پیش نہیں کی جا رہی _ بلکہ پاکستانی انقلاب کو آگے بڑھانے کے لئے بحث و مباحثہ کی غرض سے پیش کی جا رہی ہے۔ اپنے اگلے پمفلٹ میں ہم "عوامی جمہوری انقلاب۔ پروگرام۔ حکمت عملی اور طریق کار" کے موضوع پر بحث کریں گے۔

جمہوریت کا واحد راستہ

پچھلے 40 برس سے پاکستانی عوام گھپ اندھیروں میں گھوم رہے ہیں انہیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا- جب بھی وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے اٹھتے ہیں کوئی نہ کوئی طالع آزما ان کی گردنوں پر سوار ہو جاتا ہے اور جھوٹ اور فریب' عیاری و مکاری کا جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے پراپیگنڈہ کر کے ان کے ذہنوں کو ماؤف کر دیتا ہے اور ان کی جراتوں اور ہمتوں کو زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے- تحریک پاکستان کے دوران آزادی' جمہوریت' خوشحالی' مساوات اور بھائی چارے کے جو خواب انہوں نے بنے تھے وہ چکنا چور ہو جاتے ہیں- ان کی آرزوئیں اور امیدیں خاک میں تڑپتی نظر آتی ہیں- آزادی کی بجائے گھٹن اور غلامی کے نئے پھندے' خوشحالی کی بجائے نئی محرومیاں' مساوات کی بجائے باہمی دشمنیاں' کدورتیں اور نفرتیں انہیں گھیرے میں لئے نظر آتی ہیں- وہ ملک میں جمہوری نظام چاہتے ہیں- وہ اپنی قسمتوں کا خود فیصلہ کرنا چاہتے ہیں- وہ چاہتے ہیں کہ ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کی جمہوری امنگیں اجاگر ہوں-- وہ اونچ نیچ کو مٹانا چاہتے ہیں- وہ ایسی حکومت اور نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ حاکم وقت سے پوچھ سکیں کہ تمہارا کرتہ کیسے بن گیا جبکہ اسی چادر سے ان کے کرتے نہیں بنتے- وہ قانون کی حکمرانی چاہتے ہیں اور ہر ایک کے لئے برابر انصاف اور روٹی کپڑا اور مکان چاہتے ہیں کیونکہ یہ ضروریات زندگی روح کی بالیدگی کے لئے ضروری ہیں- وہ چاہتے ہیں کہ ہر بچے کے لئے تعلیم و علاج کے یکساں مواقع مہیا ہوں لیکن 40 برس سے ان کی یہ آرزوئیں پوری نہیں ہو سکیں' جمہوریت قائم ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے- خوشحالی سراب بن جاتی ہے جہالت اور بیماری انہیں گھیرے چلی جاتی ہے- اتحاد و یک جہتی کی بجائے ملک دو لخت ہو جاتا ہے اور باقی ماندہ ملک پھر ویسے ہی خطرات میں گھرا نظر آتا ہے- آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ جمہوریت کیوں قائم نہیں ہوتی؟ یہ جمہوریت جس کے لئے اتنی تگ و دو کی جا رہی ہے' اس قدر قربانیاں دی جا رہی ہیں- یہ کیا چیز ہے' کیسے آئے گی؟ کیسے قائم ہو گی؟ اسے کون قائم کرے گا؟ موجودہ راہنما یہ نصب العین حاصل کرنے میں

کامیاب ہو سکیں گے یا نہیں۔ اگر نہیں تو وہ فرشتے کہاں سے آئیں گے جو ان خوابوں کو پورا کریں گے۔

ان سب گتھیوں کو سلجھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں۔ آج کی دنیا پرانی دنیا نہیں' سماجی ارتقاء نے اسے اس قدر مربوط کر دیا ہے کہ ہر لحظہ دنیا میں رائج مختلف نظامہائے زندگی ہر ملک کی سماج پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس امر سے آگاہ ہوں کہ ہم کس دور میں رہ رہے ہیں اور آج کون سی قوتیں سماجی ترقی کے میدان میں نبرد آزما ہیں اور کس طرح ہماری سماجی زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔

آج ہم ایسے دور میں رہ رہے ہیں جبکہ دنیا بھر میں سرمایہ داری نظام اپنی تمام گھن گرج اور ترقی کے باوجود روبہ انحطاط ہے اور اپنے طبعی خاتمے کی طرف رواں دواں ہے اسے قائم رکھنے اور توانائی بخشنے کے تمام علاج یکے بعد دیگرے فیل ہوتے جا رہے ہیں اور وہ ان ناکامیوں کی وجہ سے ہی جھنجلاہٹ کے عالم میں ساری دنیا کو جنگ کی لپیٹ میں لینے کے لئے ہتھیاروں کے انبار لگا رہا ہے۔ عوام سے آسائشیں چھین کر انسانوں کو موت کی نیند سلانے کے لئے نہایت ہی مہلک ہتھیاروں پر بے انداز سرمایہ صرف کر رہا ہے۔ ریگن حکومت نے اب "ستاروں کی جنگ" کا پروگرام بنایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری لامحدود فضاؤں کو بھی جدید ترین جنگی ہتھیاروں سے بھر دیا جائے گا۔ ان پالیسیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے سامراج اپنے تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال میں لا رہا ہے اور اپنے اور دنیا بھر کے عوام کے ذہنوں کو ماؤف کرنے کے لئے اس پالیسی کو پائیدار امن کے قیام کی پالیسی کے طور پر پیش کر رہا ہے اور ترقی پذیر پس ماندہ ممالک میں ترقی پسند تحریکوں کو کچلنے اور حکومتوں کو گرانے کے لئے نہایت ہی ہٹ دھرمی سے کھلے بندوں مسلح مداخلت کر رہا ہے۔ دوسری طرف دنیا بھر میں حقیقی جمہوری نظام اپنی تمام تر الجھنوں کوتاہیوں' ناتجربہ کاریوں کے باوجود قدم قدم پر سامراجی سازشوں کا مقابلہ کرتا ہوا ایک نئی غیر طبقاتی سماج کی تعمیر و ترقی میں لگا ہوا ہے اور محکوم ممالک کی آزادی کی جدوجہد اور نو آزاد ممالک کی آزادی اور خود مختاری کو قائم رکھنے اور پائیدار بنانے کے لئے ہر قسم کی امداد مہیا کر رہا ہے اور جہاں کہیں بھی ضرورت پڑتی ہے اور معروضی حالات سازگار ہوتے ہیں۔ سامراج کے مسلح دستوں کی مسلح مزاحمت بھی کر رہا ہے۔

دنیا کی تاریخ کی سٹیج پر ظالم اور مظلوم کے درمیان زبردست جدوجہد جاری ہے۔ اس

جدوجہد کے ہراول دستوں نے ویت نام کے جنگلوں' چاول کے کھیتوں اور دیہات میں تاریخ کے سب سے بڑے اور ظالم سامراج کو شکست فاش دی ہے۔ آج بھی وہ السلواڈور' جنوبی افریقہ اور کئی دوسرے ترقی پذیر ممالک میں آزادی اور جمہوریت اور عوام کی خوشحالی کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ایک ایک انچ کے لئے جانیں قربان کر رہے ہیں اور اپنے خون کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔

آج دنیا کی ڈیڑھ ارب آبادی پر مشتمل ممالک ایک نیا انقلاب برپا کر رہے ہیں۔ ایک ایسا انقلاب جو آج سے پہلے دنیا میں نہیں ہوا کیونکہ اسے برپا کرنے کے لئے معروضی حالات موجود نہیں تھے۔ ترقی پسند ممالک میں ایک نیا انسان جنم لے رہا ہے۔ ایسا انسان جو نہ صرف ذرائع پیداوار' کارخانوں' فیکٹریوں اور زمینوں کو عوام کی ملکیت بنا چکا ہے بلکہ غلامی' جاگیرداری اور سرمایہ داری ادوار کی ذرائع پیداوار میں شخصی ملکیت اور نفع اندوزی اور خودغرضی پر مبنی صدیوں پرانی عادات' خصلتوں اور جبلتوں اور نظریات کو ختم کر کے نئے سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد میں مصروف ہے اور نت نئی کامیابیوں سے ہمکنار ہو رہا ہے۔

آج بڑی بڑی سامراجی طاقتیں اپنی من مانی نہیں کر سکتیں بلکہ ہر جگہ اور ہر میدان میں نو آزاد پسماندہ ممالک اور خاص طور پر سوشلسٹ ممالک ان کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ان کے نو آبادیاتی نظام کے ذریعے نئی طرز کی لوٹ مار اور استحصالی کی پالیسیوں کو شکست دے رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم بڑی تبدیلیوں کے دور میں رہ رہے ہیں اور آج پاکستان میں جمہوریت کی جدوجہد بھی اسی ہمہ گیر اور عالمی انقلابی جدوجہد کا حصہ بن چکی ہے جو دنیا بھر میں سامراج کو ہر محاذ پر پے در پے شکستیں دے رہی ہے اور ایک نئی سماج اور نیا انسان پیدا کر رہی ہے۔ پاکستانی عوام کی جدوجہد اور تمام پالیسیاں اسی ایک کسوٹی پر پرکھی جائیں گی۔ اسی ایک پیمانے سے جانچی جائیں گی کہ آیا یہ جدوجہد' عالمی تبدیلی کے اس دھارے کو آگے بڑھا رہی ہے یا اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور کوئی بھی ایسی پالیسی ہو اس دھارے کو پیچھے کی طرف لے جاتی ہے اس میں رکاوٹ ڈالتی ہے' رجعت پسند ہے۔ قومی اور ملکی مفادات کے منافی ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی چمکدار' حسین اور دلاویز نعروں میں لپیٹ کر ہی کیوں نہ پیش کی جائے۔ کیونکہ تبدیلی کے اس دھارے کو آگے بڑھانے کی جدوجہد' ہر جدوجہد سے برتر اور افضل ہے اور ہر جدوجہد اس عظیم جدوجہد کے تابع ہے۔

مختلف ادوار میں جمہوریت کا مسئلہ

جمہوریت کی جدوجہد بھی اس عظیم جدوجہد کا حصہ ہے اور جمہوریت کی جدوجہد بھی اس عظیم جدوجہد کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آج پاکستان میں ہر جگہ جمہوریت کی بحالی اور اسے پائیدار بنانے اور ٹھوس بنیادوں پر قائم کرنے کے مطالبات کئے جا رہے ہیں۔ پاکستان میں جمہوریت کا سوال ایک ایسا سوال ہے جو تمام سیاسی کارکنوں اور عوام بلکہ حکمران طبقوں کے لئے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سوال کے حل سے ہماری بقاء' ہماری آزادی اور ملکی سالمیت اور یک جہتی وابستہ ہے۔ اس لئے اس سوال کے حل کے لئے حکمران طبقوں اور محنت کشوں کے نظریات کا جائزہ لینا ضروری ہے اور محنت کشوں کے نظریے کو عوام میں مقبول بنانا ایک اہم سیاسی کام ہے کیونکہ موجودہ دور میں اس نظریے کے مطابق ہی ہم صحیح جمہوریت قائم کر سکتے ہیں۔ اس سوال اور اس کے مختلف پہلوؤں کو تاریخی طور پر سمجھنا نہ صرف ہمارا سیاسی فریضہ ہے۔ بلکہ انقلابی جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

جمہوریت کہیں ہوا میں معلق نہیں ہوتی اور نہ ہی خلا میں پرورش پاتی ہے۔ جمہوریت کوئی آفاقی چیز بھی نہیں ہے۔ جسے اوپر سے نازل کیا گیا ہو اور نہ ہی محض عظیم مفکروں کے عظیم تر ذہنوں نے اسے پیدا کیا ہے بلکہ جمہوریت نے ہمیشہ سماج کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اسی سماج میں پرورش پائی ہے۔ جمہوریت نے تاریخ عالم میں کئی رنگ بدلے ہیں اور ہر زمانے میں اس کے معنی مختلف رہے ہیں۔

قبائلی جمہوریت

ایک زمانہ تھا جب سماج میں طبقات نہیں تھے۔ جب انسان بے لگام قدرتی عناصر کے سامنے بالکل بے بس اور مجبور تھا۔ قدرتی آفتوں' سیلابوں' آندھیوں' بارشوں اور طوفانوں سے ہونے والی بے پناہ تباہ کاریوں اور جنگلی جانوروں اور درندوں سے محفوظ رہنا اور خوراک حاصل کرنا انسان کے لئے جان جوکھوں کا کام تھا۔ نہ سر پر چھت تھی' نہ پہننے کو کپڑا' اور نہ ہی پیداوار کے کوئی ذرائع تھے۔ انسان بھی باقی جنگلی جانوروں اور درندوں کی طرح رہنے پر مجبور تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ بھی ایک درندہ تھا۔ اس لئے محض زندگی برقرار رکھنے کے لئے' زندہ رہنے کے لئے اسے ان بپھرے ہوئے جنگلی درندوں اور قدرتی عناصر کے

خلاف زبردست جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ لیکن انسان اس وقت تنہا تھا۔ اس کے پاس کوئی اوزار اور ہتھیار نہیں تھے۔ اس لئے انسان زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے متحد ہو کر ہی جدوجہد کر سکتے تھے اور مشترکہ جدوجہد سے ہی ان عناصر سے زندگی کو محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔ مشترکہ جدوجہد سے ہی رہنے سہنے' شکار کرنے اور کھانے پینے کا سامان مہیا کیا جا سکتا تھا۔ کوئی فاضل پیداوار نہ ہوتی تھی۔ انسان کا محض زندہ رہنا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ تھا۔ اس لئے کسی حالت میں وافر دولت جمع نہ ہو سکتی تھی۔ اس وجہ سے سماج میں کوئی طبقات نہ تھے۔ کوئی اونچ نیچ نہ تھی۔ کوئی لوٹنے والا نہ تھا نہ کوئی لٹنے والا نہ تھا۔ سب کا مفاد مشترکہ تھا۔ اس لئے حالات کی مجبوریوں کی وجہ سے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ایک دوسرے کے امدادی تھے۔ ایک دوسرے کے محافظ تھے۔ ایک دوسرے کے ہمسفر اور ساتھی تھے۔ ایسے حالات میں ایک عظیم لیکن پسماندہ جمہوریت قائم تھی۔ قبیلے کے لوگ سب کی رائے سے جمہوری طریقوں پر فیصلے کرنے پر مجبور تھے اور اپنے الجھے ہوئے مسائل سلجھاتے تھے۔ شکار کرنا ہوتا یا کھانے پینے کی دوسری اشیاء مہیا کرنی ہوتیں تو وہ گروہی شکل میں ہی ہو سکتی تھیں۔ اس لئے جمہور کا مفاد فرد کے مفاد سے بالاتر تھا۔ ریاست کا وجود نہ تھا۔ انسانی مسائل کے حل اور ان کی حفاظت کے لئے کوئی علیحدہ مسلح طاقت نہ تھی۔ پولیس نہ تھی اور نوکر شاہی نہ تھی۔ غرضیکہ انسانوں پر رعب و دبدبہ کا سوائے پنچائتی دباؤ کے کوئی ہتھیار نہ تھا۔ زندگی سادہ تھی۔ اس میں گنجلیں اور الجھاؤ نہ تھا۔ ہر طرف سادگی' بھائی چارہ اور مروت تھی۔ باہمی میل جول تھا۔ پیار و محبت تھا اور ایک دوسرے کی مدد کی جاتی تھی۔ لیکن جمہوریت پسماندہ معاشی نظام کی طرح خود بھی پسماندہ تھی اور قدرتی عناصر کے سامنے انسان کی مجبوری اور بے بسی کی بنیادوں پر استوار تھی۔

عہد غلامی کی جمہوریت

جونہی انسانوں نے اپنی ضروریات سے فاضل پیداوار کرنی شروع کی' چھینا جھپٹی شروع ہو گئی جو ذہنی اور جسمانی طور پر مضبوط' توانا اور ہوشیار تھے۔ انہوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے پیداوار میں سے زیادہ حصہ رکھنا شروع کر دیا۔ یہ عمل کبھی عام لوگوں کی رضا مندی اور کبھی بغیر رضا مندی کے جاری رہا اور آخر طبقات وجود میں آ گئے۔ دنیا میں پہلی بار طبقاتی سماج نے جنم لیا اور انسان نے انسان کو غلام بنانا شروع کر دیا۔ کیونکہ ابھی تک انسان نے

پیداوار کے جدید اوزار ایجاد نہ کئے تھے اور انسان ہی پیداوار کا سب سے بڑا اوزار تھا اور وہ اپنی ضروریات سے کچھ زیادہ ہی پیداوار کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس لئے اسے غلام بنانا منافع بخش تھا فاضل پیداوار کے زمانہ سے پہلے جب کبھی مختلف قبائل اور انسانی گروہوں میں خوراک اور رہائش کی تلاش میں تصادم ہو جاتا تو مغلوب انسانوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس سماج میں خوراک کے محدود ذخائر کی وجہ سے انہیں زندہ رکھنا مشکل تھا۔ لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اب انہیں غلام بنا کر زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ انہیں پیداوار کے لئے مشینری کی طرح استعمال کیا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ کمزور، مفلس اور مقروض انسانوں کو بھی غلام بنایا جانے لگا۔ غلاموں کو سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ انہیں بہت سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں۔ اپنے لئے خوراک پیدا کرنے کے علاوہ انہیں آقا کے لئے فاضلِ پیداوار بھی کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ فاضل پیداوار ہتھیانے کے لئے غلاموں کو کم سے کم خوراک اور آسائشیں مہیا کی جاتی تھیں اور زیادہ سے زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ غلاموں کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے نئے ادارے وجود میں آنے لگے۔ پہرے داروں اور پولیس کی ضرورت تھی۔ غلاموں سے کام لینے کے لئے منتظموں کی ضرورت تھی۔ غلاموں کو غلام رکھنے اور اس نئی جائیداد (غلام) کو دوسرے کی دست برد سے بچانے کے لئے قانون کی ضرورت تھی۔ اور قانون نافذ کرنے کے لئے کسی ادارے کی ضرورت تھی چنانچہ ابتدائی شکل میں ریاستی ادارے، فوج پولیس، نوکر شاہی، عدالتیں وغیرہ وجود میں آنے لگیں۔

شروع شروع میں تو صرف غیر قبائلی اور دشمنوں کے شکست خوردہ قیدیوں کو ہی غلام بنایا جاتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ مقروض اور گنہگار انسانوں کو بھی غلام بنایا جانے لگا اور سزا یافتہ انسان کو بیچ دیا جانے لگا، اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ غلاموں کی خرید و فروخت کے لئے باقاعدہ منڈیاں لگنے لگیں۔ چنانچہ نئی سماج میں غلامی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئی۔ بلکہ اس کی بنیادیں فراہم کرنے لگی۔ غلام بولتے ہوئے اوزار تھے۔ سماجی عزت و وقار، جاہ و جلال، طاقت اور اثر و رسوخ کا پیمانہ یہ بن گیا کہ کس کے پاس کتنے غلام ہیں۔ جس کے پاس جس قدر زیادہ غلام ہوتے تھے وہ اسی قدر زیادہ امیر و کبر ہوتا تھا اور اسی لحاظ سے اس کی عزت و توقیر ہوتی تھی اور اسی لحاظ سے اس کا سماج میں مقام ہوتا تھا۔

لیکن غلامی کی اس سماج میں بھی پرانی جمہوریت قائم رہی۔ تاہم اس نے چولا بدل لیا۔ اس جمہوریت سے غلاموں کے علاوہ، جو محض بولتے ہوئے اوزار تھے اور انسان نہ سمجھے

جاتے تھے، سبھی مستفید ہو سکتے تھے مگر غلام اس جمہوریت میں حصہ نہیں لے سکتے تھے کیونکہ انہیں انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ محض پیداوار کے اوزار یا ہتھیار تھے۔ انہیں کوئی حقوق حاصل نہیں تھے۔ انہیں بیچا جا سکتا تھا۔ انہیں قتل کیا جا سکتا تھا۔ انہیں ہر قسم کی اذیتیں دی جا سکتی تھیں۔ سوائے آقا کے حکم کے کوئی قانون ان پر لاگو نہ ہو سکتا تھا۔ اسلامی تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں۔ قریش کے سردار غلاموں کو بے پناہ اذیتیں دیتے بلکہ جان سے مار دینے کو عین اپنا حق سمجھتے تھے۔ کیونکہ غلام انسان نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے عہد غلامی کی جمہوریت میں ان کا عمل دخل نہیں ہو سکتا تھا۔ دراصل یہ جمہوریت آقاؤں کی غلاموں پر ڈکٹیٹرشپ تھی۔ آقا اس جمہوریت کے گیت گاتے اور اسے انسانی سماج کی معراج قرار دیتے تھے۔ اس جمہوریت کی عظمت غلاموں کے خون سے سینچی گئی تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود عہد غلامی کی یہ جمہوریت قبائلی دور کی جمہوریت کے مقابلہ میں انسانی سماج کے ارتقاء کے لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ غلامی کے اس دور نے جہاں کچھ انسانوں کو دوسرے زیادہ چالاک اور ہوشیار انسانوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا۔ وہاں انسانی ترقی کے لئے نئی شاہراہیں بھی کھول دیں۔ غلاموں کی وجہ سے فاضل پیداوار نے باہمی تجارت کو فروغ دیا۔ آقاؤں کو فرصت مہیا کی، جنہوں نے قدرت کے رازوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ علوم و فنون نے ترقی کی، عالی شان عمارات غلاموں کے خون اور ہڈیوں سے چنی گئیں۔

انسان نے نئے جمہوری، سیاسی اور انتظامی ادارے قائم کئے۔ پتھروں کو تراش تراش کر عبادت گاہیں بنائی گئیں۔ ریشم و الماس و کمخواب تیار کئے اور زیورات بنائے، تہذیب و تمدن اور ثقافت کو نئی رفعتیں بخشی گئیں اور انسان کے تابناک مستقبل کے لئے نئے نقشے تیار کئے گئے۔

لیکن اس اولین طبقاتی دور میں غلاموں سے انسانیت چھین لی گئی۔ وہ بعض اوقات جانوروں کی طرح پابند زنجیر رکھے جاتے تھے۔ ان کے جسم داغ دیئے جاتے تھے تاکہ اگر وہ فرار ہو جائیں تو جہاں بھی جائیں تو پتہ چل سکے کہ وہ انسان نہیں غلام ہیں۔ آزادی کے لئے بھاگے ہوئے غلام کو پناہ دینے کی سزا بعض اوقات موت تھی۔ آقاؤں---- امراء اور رؤسا کی تفریح کے لئے اکثر اوقات بے بس غلاموں کو شیروں سے لڑایا جاتا۔ غلاموں کا آپس میں تادم مرگ مقابلہ کرایا جاتا۔ کیونکہ غلام اوزار تھے اور وافر دولت پیدا کرنے کا ذریعہ تھے اس لئے ان کی حفاظت کے لئے کڑے قوانین وغیرہ بنائے گئے تھے۔ ان غلاموں کے ذریعے

ہونے والی وافر اور فاضل پیداوار نے جہاں شہری ریاستوں کو جنم دیا وہاں تجارت کے لئے نئی نئی مصنوعات بھی مہیا کر دیں اور انسان تجارتی منافعوں کے لئے ملک ملک پھرنے لگا۔ نئے نئے راستے دریافت ہوئے سمندروں کو تجارت کے لئے عبور کیا جانے لگا۔ بڑی بڑی کشتیاں جنہیں غلام کھینچتے تھے ایجاد کی گئیں اور بکھری ہوئی علیحدہ علیحدہ دنیا کو قریب کر دیا گیا۔

اس اولین طبقاتی سماج کو ختم کرنے کے لئے طبقاتی جدوجہد نے جنم لیا۔ آزادی' مساوات اور سچی جمہوریت کے لئے غلاموں نے بے بہا قربانیاں دیں اور اس دور میں وہ اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے بار بار اٹھے اور بغاوت کا علم بلند کیا۔ روم میں جو عہد غلامی کی نہایت ہی ترقی یافتہ ریاست تھی۔ ایک غلام سپارٹاکس کی رہنمائی میں غلاموں نے عظیم الشان جدوجہد کی مگر اردگرد کی شہری ریاستوں کے حکمرانوں' آقاؤں نے مل کر غلاموں کی اس بغاوت کو بری طرح کچل دیا۔ غلاموں کی شکست کے بعد ہزاروں غلاموں کو روم کی طرف آنے والی شاہراہوں پر زندہ لٹکا دیا گیا۔ حتیٰ کہ وہ اسی طرح لٹکتے ہوئے مر گئے۔

غلاموں کی اس عظیم بغاوت کو اگرچہ کچل دیا گیا۔ لیکن یہ بغاوت غلامی کی بنیادوں پر استوار ان شہری ریاستوں کے ڈھانچوں کو ہلا کر رکھ گئی۔ پھر اس کے بعد کبھی پرانا عہد غلامی واپس نہ آ سکا اور ایک طویل اور کٹھن جدوجہد سے غلامی کے دور کو ختم کر دیا گیا۔ عہد غلامی میں پیداواری اوزاروں کی ترقی نے سماج کے بطن میں نئے پیداواری تعلقات کے لئے بنیادیں فراہم کر دی تھیں۔ چنانچہ اس دور کے خاتمے نے ایک نئے طبقاتی نظام کو جنم دیا۔ جو جاگیرداری نظام کے نام سے موسوم ہے۔

مکہ' مدینہ' طائف اور خیبر کی شہری ریاستوں میں بھی اسلام کا ظہور دراصل عہد غلامی کے خاتمے کا دور تھا۔ رسول عربی نے غلامی کے سماج کے خلاف نہایت ہی کٹھن اور صبر آزما جدوجہد کی اور ان گنت مصائب سہے اور تکالیف اٹھائیں۔ اذیتیں جھیلیں۔ غلامی کے علمبرداروں کو شکست ہوئی۔ سب انسان برابر ہیں کا ولولہ انگیز اعلان ہوا۔ حضرت بلالؓ حبشی کو جنہیں غلامی کے دور میں جان لیوا تکالیف اٹھانی پڑی تھیں۔ منبر پر مؤذن بنا کر کھڑا کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی لڑکی کا نکاح ان سے کر دیا۔ اسلام کے نفاذ کے لئے پرانے قبائلی نظام اور اس کی جمہوریت کو نئے سانچوں میں ڈھال کر عمل میں لانے کی کوشش کی گئی۔ خلفائے راشدین کا عہد اس جمہوریت کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن خود خلفائے راشدین کی ہیئت ترکیبی میں مستقبل کے نظام---- فیوڈل ازم کی بنیادیں پوشیدہ تھیں۔ پیداواری

ذرائع ترقی کر چکے تھے اور وہ پرانے پیداواری تعلقات کے دائرے میں مقید نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ چالیس سال کے قلیل عرصہ میں یہ جمہوریت مٹ گئی اور نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے فیوڈل نظام کامیاب ہو گیا۔

وہ غلام جنہیں بولتے ہوئے اوزار کہا جاتا تھا پیداواری اوزاروں اور ہتھیاروں (ہل۔ بیل۔ درانتی۔ ہتھوڑا وغیرہ) کے مالک تو بن گئے۔ لیکن وہ زمین کے مالک نہ بن سکے۔ جس پر وہ کام کرتے تھے اور زمین قبائلی سرداروں کی ملکیت بن گئی یا فوجی سورماؤں کی تحویل میں چلی گئی۔ اس طرح قبائلی سردار اور فوجی سورما جاگیردار بن گئے اور ایک جاگیردار' دوسرے جاگیرداروں کا سردار بن گیا اور پھر وہ بادشاہ بن گیا اور آخر میں ظل الٰہی کہلانے لگا۔ اس کا ہر لفظ قانون بن گیا۔ اس طرح غلامی کے عہد کی جمہوریت بھی ختم ہو گئی۔

جاگیرداری عہد کا نظام

قبائلی جمہوریت میں مشترکہ محنت دولت کا سرچشمہ تھی۔ عہد غلامی میں غلاموں کی محنت شاقہ سے پیدا کی ہوئی قدر زائد آقاؤں کے لئے دولت اور عزت اور طاقت کی بنیاد تھی اور اس نئے عہد میں زمین دولت حشمت اور طاقت کا منبع تھی زمینوں کے مالک بڑے بڑے راجے مہا راجے بادشاہ تھے اور کاشتکار ان کی رعیت تھے۔ اس نئے عہد کو' فیوڈل ازم یا جاگیرداری عہد کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں بڑے بڑے بادشاہ جب اپنے اہلکاروں مصاحبوں وزیروں اور سپہ سالاروں کو نوازنا چاہتے تو زمین کے وسیع قطعات انہیں عطا کر دیتے۔ ان قطعات اراضی پر رہنے والے لوگ ان کی رعیت کہلاتے۔ عہد غلامی میں غلاموں کی محنت کے بل بوتے پر پیداواری قوتوں نے جو ترقی کی انہوں نے اس نئے عہد کو جنم دیا تھا نئے اوزاروں کی ایجاد نے زراعت کو بہت ترقی دی۔ گھریلو صنعتوں کے ساتھ ساتھ زرعی پیداوار میں پہلے کی نسبت بہت اضافہ ہوا اور زمین زندگی کی محور بن گئی۔ مجبور و مقہور غلام جب آزاد ہوئے تو وہ آزاد انسانوں کی حیثیت سے زیادہ محنت سے کام کرنے لگے۔ اس نئی وافر پیداوار نے تجارت کو نئی وسعتیں دیں۔ تجارتی راستوں کی حفاظت کے لئے شہری ریاستوں کی جگہ نئے سیاسی نظام نے لے لی اور آہستہ آہستہ مختلف چھوٹے رجواڑوں اور حاکموں کو زیر کر کے ایک بڑا بادشاہ سب پر قابض ہو گیا اور بڑی سلطنتیں قائم ہونے لگیں۔ جن کی حکمرانی دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی اس عہد نے جہاں زمین پر چھوٹے چھوٹے

رجواڑوں کو ختم کر کے ایک بڑے بادشاہ کو جنم دیا وہاں چھوٹے چھوٹے مقامی خداؤں کو ختم کر کے کل عالم کے ایک خدا کا تصور بھی پیدا کیا اور نئے بادشاہ اپنے آپ کو ظل الٰہی کہنے لگے۔ خلفائے راشدین کے بعد بادشاہت کا قیام اسی تاریخی عمل کا نتیجہ تھا اور وہ قبائلی جمہوریت جو مکہ اور مدینہ کی شہری ریاستوں کے اردگرد ابھی تک رائج تھی اور جسے از سرنو ان علاقوں میں غلامی کو مٹا کر قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکی اور نئی پیداواری قوتوں اور نئے پیداواری تعلقات اور نئے پیداواری رشتوں کی ضروریات نے اسے آہستہ آہستہ ختم کر دیا۔ بادشاہ کی شخصی حکومت کو دور دراز علاقوں میں قائم رکھنے کے لئے ریاستی ڈھانچہ' فوج پولیس' نوکر شاہی اور عدلیہ نئی شکلوں میں ظہور میں آنے لگے۔ عوام اس نئے استبدادی نظام کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے رجوڑے حاکم اور امیر بادشاہ وقت سے روگردانی نہیں کر سکتے تھے اور اگر کرتے تو گردن زنی کے مستحق ٹھہرتے علماء اور حکماء کی اکثریت مطلق العنان حکمرانوں کی خوشنودی کے لئے ہر قسم کی مذہبی رکاوٹوں اور اخلاقی قدروں کو ان کی ہوس کے راستے سے ہٹانے کے لئے فتوے دیتی رہتی تھی۔ تمام طاقت مرکز میں مرکوز تھی اور مرکز میں بادشاہ جلوہ گر ہوتا تھا جو ظل الٰہی کہلاتا تھا اس لئے جمہور کی کوئی آواز' کوئی رائے اور کوئی حقوق نہ تھے اس دور میں ساری تہذیب' سارا تمدن اور ثقافت شاہی محل کے اردگرد گھومتی تھی۔ انسانی ترقی کی رفعتیں شاہی محل میں رسائی سے تعبیر کی جاتی تھیں۔ قوانین اور انصاف بادشاہ اور اس کے چند مشیروں اور وزیروں کی صوابدید کے مطابق نافذ ہوتا تھا۔ بڑے بڑے بنیادی اور پائیدار اصولوں اور مذہبی احکام کو بھی شاہی حکمرانی کی سہولت کے لئے بدل لیا جاتا تھا۔ حکمرانوں کو تبدیل کرنے کے تمام پرانے اصول دم توڑ گئے تھے۔ اب ایسے سب مسائل کا فیصلہ سازشوں اور تلوار سے ہوتا تھا۔ جمہور کی آواز ختم ہو گئی تھی اور عوام ظل الٰہی کے سامنے سجدہ کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ جمہوریت کے پرانے اصول اور نظریات کتاب زندگی سے مٹا دیئے گئے تھے۔ اس دور کو یورپ میں سیاہ دور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں صرف یہی ایک دور ایسا ہے جس میں کسی قسم کی جمہوریت نہ تھی۔

لیکن سماجی ارتقاء کے اعتبار سے یہ دور عہد غلامی کے دور سے ایک قدم آگے کی طرف تھا۔ اس دور کے معروضی حالات نے بکھری ہوئی دنیا کو پہلے سے زیادہ متحد کر دیا تھا۔ بڑی بڑی ریاستیں وجود میں آ گئیں تھیں اور حکومتوں اور بادشاہوں کو بے شمار وسائل میسر آ

گئے تھے۔ بادشاہ جس طرح چاہتے ان وسائل کو استعمال کر سکتے تھے۔ چنانچہ کئی بادشاہوں نے ان وسائل کو منظم طریقے سے سماجی ترقی کے لئے استعمال کیا۔ اگرچہ یہ سماجی ترقی عموماً ان حکمران طبقوں کے حصے میں ہی آئی لیکن دنیا نے مجموعی طور پر ترقی کی۔ سڑکیں اور سرائیں تعمیر کی گئیں تاکہ آمدورفت میں سہولت ہو اور تجارت میں ترقی ہو۔ تعلیم و تربیت کے لئے کثیر رقوم خرچ کی گئیں۔ فلسفہ' ریاضی اور دوسرے علوم نئی بلندیوں پر پہنچ گئے۔

مشرق وسطیٰ میں بنو امیہ اور بنو عباس اور ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی حکومتیں اس دور کی معراج ہیں۔

اس دور میں آزاد غلاموں میں سے بہت سے چھوٹے موٹے کاریگر بن گئے تھے جو پہلے آقاؤں کے لئے مصنوعات بناتے تھے۔ وہ اب اپنے گھروں اور دکانوں میں مصنوعات بنانے لگے۔ پھر زیادہ بڑے اور اچھے کاریگروں کے پاس لوگ کاریگر بننے کے لئے شاگردی کرنے لگے۔ چنانچہ استاد شاگرد کے رشتے پر قائم پیداوار کے طریقوں میں بھی مزید ترقی ہوئی اور جاگیرداری عہد کے دوران اناج کی فاضل پیداوار کے ساتھ ساتھ مصنوعات کی کاریگری نے بھی نئی منزلیں طے کرنی شروع کیں۔ مصنوعات کو کم وقت میں بڑے پیمانے پر پیدا کرنے کے لئے کوششیں شروع ہونے لگیں۔ چنانچہ سب سے پہلے انسان کی بنیادی ضروریات کپڑے کی صنعت کے لئے بھاپ سے چلنے والی مشین ایجاد ہوئی پیداوار کے اس نئے نظام کو بڑھانے کے لئے سرمائے کی ضرورت تھی۔ سرمایہ خواہ کسی طرح بھی اکٹھا ہو۔ لوٹ مار سے' مار دھاڑ سے' فتوحات سے' دھوکہ دہی سے' سب جائز قرار دیا گیا۔ مخصوص حالات میں برطانیہ' ہالینڈ' سپین' پرتگال اور فرانس کے بحری تاجروں اور بحری ڈاکوؤں نے نہ صرف دور دراز علاقوں ہندوستان' لنکا' انڈونیشیا' افریقہ اور دوسرے ممالک میں سمندری راستوں کے ذریعے پہلے تجارت کے ذریعے رسائی حاصل کی اور تلوار کی نوک سے ان براعظموں کو غلام بنا لیا۔ سرمائے کو اکٹھا کرنے کے لئے اور ہر سرزمین پر برتری حاصل کرنے کے لئے یہ آپس میں بھی میدانی اور بحری جنگیں لڑتے رہے اور ایک دوسرے کو تہس نہس کرنے اور سبقت لے جانے کے لئے خونخوار وادیوں سے گزرے۔ جیسے جیسے سرمایہ اکٹھا ہوتا گیا۔ مصنوعات کی پیداوار بڑھتی گئی۔ پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اندرونی اور بیرونی تجارت میں اضافہ ہوا۔ لیکن وقت کے بادشاہوں نے شاہی اخراجات کے لئے اس تجارت پر ناجائز اور بھاری ٹیکس عائد کر دیئے---- نیز پیداوار کو مزید بڑھانے کے لئے سستے مزدوروں کی

ضرورت تھی۔ لیکن شہروں میں آبادیاں کم تھیں اور دیہات کے مزدور اور کسان جاگیرداروں کی رعیت تھے۔ جو ان کی اجازت کے بغیر نقل مکانی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ فیوڈل ازم کے بطن سے پیدا ہونے والی نئی پیداواری قوتوں کے لئے پرانے پیداواری تعلقات کے خول کے اندر ترقی اور نشوونما کی گنجائش نہ تھی۔ ایک طرف سرمایہ داروں کی---- مزدوروں کے لئے بڑھتی ہوئی مانگ پوری نہ ہو سکتی تھی اور دوسری طرف ان کی مصنوعات ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر پابندیاں اور ٹیکس لگے ہوئے تھے اور یہ پابندیاں اور ٹیکس بادشاہ وقت انفرادی طور پر لگاتا تھا اور سرمایہ داروں اور تاجروں وغیرہ سے کوئی صلاح مشورہ نہ کیا جاتا تھا جو ان کے لئے سخت ناگوار اور نقصان دہ تھا۔ چنانچہ سرمایہ داروں نے اس صورت حال کو اپنے حق میں بدلنے کے لئے کسانوں کو آزاد کرنے اور شاہی ٹیکسوں کو ختم کرنے کے لئے "آزادی مساوات اور بھائی چارے" اور حق نمائندگی کے نعرے بلند کرنے شروع کر دیئے۔ یہ نعرے بہت حسین اور دلپذیر تھے۔ مظلوم انسان جوق در جوق ان نعروں کے اردگرد اکٹھے ہونے لگے۔ برطانیہ اور فرانس میں عظیم انقلاب برپا ہوئے۔ بادشاہوں کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ گلوٹین میں سر دھڑ سے جدا کئے گئے اور انسانوں کو بادشاہوں اور جاگیرداروں کی بندشوں سے نجات دلائی گئی۔ یوں جاگیرداری عہد کے شخصی استبداد سے نئی پیداواری قوتوں نے انسانوں کو نجات دلائی اور نئے سرمایہ داری نظام کی بنیاد رکھی۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت

جاگیرداری عہد میں ظل الٰہی کے سامنے انسانوں کی زبان گنگ تھی۔ وہ حرف شکایت زبان پر نہ لا سکتے تھے اور خون کے گھونٹ پیتے ہوئے' بے بسی کے عالم میں' جہاں پناہ کی ہر بات' ہر اشارے کو طوعاً" و کرہاً" برداشت کرتے تھے۔ لیکن سرمایہ داری کی نشوونما نے نئے اوزاروں اور نئے پیداواری طریقوں اور قدرت پر قادر ہونے کے احساس نے ان بے زبان انسانوں کو زبان دے دی۔ وہ اپنے مسائل کے حل کے لئے گفتگو کرنے لگے۔ بحث و مباحثے برپا کرنے لگے اور کسی شے کو بلا چون و چرا تسلیم کرنے اور اندھی حاکمیت کے سامنے بے حیل و حجت سر جھکانے کی بجائے اپنے حقوق اور نمائندگی حاصل کرنے کے لئے منظم ہو کر جدوجہد کرنے لگے اور انسانی غلامی اور اونچ نیچ کے متعلق تمام مروجہ پرانے نظریات کو عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھنے لگے حتیٰ کہ صدیوں پرانے مذہبی نظریات کو بھی چیلنج کیا جانے لگا۔

کلیساؤں میں راہبوں کی گھناؤنی زندگی کو بے نقاب کیا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ جن خیالات اور نظریات کی بنیادوں پر پرانے اصول اور ادارے قائم تھے' دھڑام سے نیچے آ رہے۔

سرمایہ دارانہ انقلابات کے بعد مزدوروں کا طبقہ بظاہر بالکل آزاد تھا۔ لیکن اسی دور میں وہ غلامی کی نئی زنجیروں میں جکڑا گیا تھا۔ غلامی کی یہ نئی زنجیریں لوہے کی نہ تھیں۔ یہ زنجیریں مزدور کا فیکٹری کے ساتھ نیا بندھن تھا۔ وہ فیکٹری کا غلام تھا۔ اس نے جاگیرداری ظلم و تشدد اور حاکمیت سے تو نجات پا لی تھی۔ لیکن وہ اپنے پیداواری اوزاروں سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا اور اپنا پیٹ پالنے کے لئے کارخانے میں اپنی محنت بیچنے پر مجبور تھا۔ کارخانے کی سیٹی سنتے ہی اسے کشاں کشاں کارخانے میں جانا پڑتا تھا۔ اگر وہ نہیں جاتا تو اس کے بال بچوں کے لئے بھوک اور محرومی مقدر بن جاتی۔ لیکن کارخانے سرمایہ داروں کے قبضے اور ملکیت میں تھے اور ان کارخانہ داروں اور ان کے منافعوں کو محنت کشوں کی دست برد سے بچانے کے لئے ریاست کی مشینری' جو عہد غلامی میں طبقاتی سماج کے ظہور میں آنے کے ساتھ ہی پیدا ہو چکی تھی موجود تھی۔ چنانچہ یہ مشینری' پولیس' نوکر شاہی' فوج' عدلیہ وغیرہ نہایت ہی مؤثر طریقے سے قانون کے نفاذ اور امن و امان قائم رکھنے کے نام پر ان کے خلاف استعمال ہونے لگی۔ مٹھی بھر سرمایہ دار تمام وسائل پیداوار پر قابض تھے اور لاکھوں محنت کش محض اپنی محنت بیچنے کے لئے فیکٹریوں کے دروازوں پر موجود تھے۔ پارلیمنٹ تھی' انتخابات تھے' قوانین تھے لیکن یہ سب سرمایہ دار طبقے کی باندیاں تھیں اور محنت کش طبقوں کی دسترس سے باہر۔ دراصل یہ سرمایہ دار طبقہ کی جمہوریت تھی جو حقیقت میں سرمایہ دار طبقہ کی محنت کشوں پر ڈکٹیٹرشپ تھی۔ اقلیت کی اکثریت پر حکمرانی تھی۔ جو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں امریکہ' برطانیہ' فرانس اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں میں موجود ہے۔

اس نئی سرمایہ دارانہ جمہوریت میں مزدوروں کو یہ احساس دلایا جاتا کہ سرمایہ دار ان کی روزی کا بندوبست کرتے ہیں۔ وہ ان داتا ہیں اور انہیں کی مہربانی سے وہ دو وقت کی روٹی پاتے ہیں۔ ظاہرا" طور پر یہ درست نظر آتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ خود سرمایہ دار مزدور کی محنت کے بل بوتے پر پلتا تھا۔ مزدور کی پیدا کی ہوئی قدر زائد سستے داموں ہتھیا کر وہ امیر سے امیر تر ہوتا جاتا تھا۔ شروع شروع میں مزدوروں سے اٹھارہ اٹھارہ بیس بیس گھنٹے کام لیا جاتا۔ اور اکثر اوقات انہیں فیکٹریوں میں مشینوں کے قریب ہی نہایت ہی گندے ماحول میں

شب و روز بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ کارخانوں میں کام کرنے کے سلسلہ میں کوئی قوانین نہ تھے' کوئی رعایت نہ تھی بس جان لیوا کام تھا اور قدر زائد پیدا کرنے کے لئے اسے رات دن مشینوں کے ساتھ مشین بننا پڑتا تھا۔ اگر وہ آواز اٹھاتا تو قانونی مشینری پوری طاقت کے ساتھ اسے دبا دیتی۔ لیکن آہستہ آہستہ نہایت ہی کٹھن جدوجہد کے راستوں سے گزرتے ہوئے مزدوروں نے اپنی اجتماعی طاقت سے اور مسلسل جدوجہد سے سرمایہ دارانہ جمہوریت کے خول کے اندر اپنے کچھ حقوق منوانے شروع کئے۔ کام کے گھنٹے اٹھارہ سے کم ہو کر آٹھ گھنٹے فی یوم رہ گئے۔ علاج اور رہائش اور پنشن اور بونس وغیرہ بھی ملنے لگا۔ سرمایہ داروں کو اپنے مزدوروں کے لئے کوارٹر بنانے کے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ محنت کشوں کے بچوں کی تعلیم اور بیماروں کے علاج کے لئے سرمایہ داروں کو اپنے بے پناہ منافعوں سے روپیہ پیسہ خرچ کرنا پڑا۔

آزادی' مساوات' اخوت اور جمہوریت کے بلند بانگ نعرے جنہیں استعمال کر کے سرمایہ داروں نے حکمرانی حاصل کی تھی اور پرانے فیوڈل بادشاہوں اور شہزادوں کو شکست دے کر ہر بالغ کے ووٹ اور انتخاب کی بنیاد پر پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق حاصل کیا تھا۔ وہ آئین کی کتابوں میں تو بہت خوش کن نظر آتا تھا۔ لیکن وسائل پیداوار سارے کے سارے سرمایہ دار طبقہ کے قبضہ میں آ گئے تھے اور بعض حالات میں تو انہوں نے پرانے جاگیرداروں کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ لیکن محنت کش طبقے بالکل نہتے ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ وہ ان پیداواری اوزاروں سے بھی محروم ہو گئے تھے جن کے وہ جاگیرداری عہد میں مالک تھے۔ گو ہر شخص پارلیمنٹ کا انتخاب لڑ سکتا تھا' ہر شخص قانون کے سامنے برابر تھا۔ ہر کوئی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آزاد تھا اور اپنے عالیشان محل تک بنا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ یہ تمام نعمتیں اور اشیاء روپے پیسے سے حاصل ہوتی تھیں اور روپیہ پیسہ سب سرمایہ داروں کے پاس تھا اور محنت کشوں کے پاس بھوک تھی' بیروزگاری تھی اور بیماری تھی اور زندہ رہنے اور نئے مزدور پیدا کرنے اور انہیں پالنے پوسنے کے لئے محنت شاقہ تھی' اس لئے نہ تو وہ انتخاب لڑ سکتے تھے نہ قانونی رعائتیں حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ وکیل کر سکتے تھے۔ نہ تعلیم حاصل کرنے کا ان کے پاس وقت تھا نہ علاج کے لئے پیسہ۔ اس لئے آزادی' مساوات کے ہوتے ہوئے بھی آزادی میں ان کے لئے کوئی حصہ نہ تھا۔ مساوات ان کے لئے نہیں تھی۔ جمہوریت سے وہ بے بہرہ تھے۔ بس ہر چار پانچ سال بعد وہ اپنے ووٹ کا حق استعمال کرتے

تھے اور کسی بڑے آدمی، کسی بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار کو، جس کے چہرے پر دیانت اور شفقت اور خدا ترسی کے جعلی نقاب چڑھے ہوتے کو ووٹ دے کر اپنا نمائندہ چن لیتے اور بس! منتخب ہونے والے نمائندے بنیادی طور پر اپنے ہی طبقے کے لئے قوانین بناتے اور محنت کش پھر اپنے حقوق کے لئے پارلیمنٹ کی بجائے سڑکوں اور شاہراہوں پر مظاہرے کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

اس کشمکش میں سرمایہ دار مضبوط ہوتے چلے گئے اور مزدور ساری تگ و دو کے باوجود مزید مجبور ہوتے چلے گئے۔ سرمایہ دار چھوٹے سے بڑے سرمایہ دار بن گئے اور بڑے سرمایہ دار سے اجارہ دار ہو گئے۔ انہوں نے بڑے بڑے بنک کمپنیاں اور اجارہ داریاں قائم کر لیں۔ منافع اور مزید منافع کے لئے ان کی بھوک بڑھتی گئی۔ پیداواری قوتیں، جن کی سرمایہ داروں نے محنت کشوں اور دوسرے طبقوں کی اندھی لوٹ کے بل بوتے پر نشوونما کی تھی، وہ اس قدر بڑھ اور پھیل گئیں کہ ان کی منافعوں کی بھوک اور ہوس بیکراں ہونے لگی اور اپنے ملک کی حدود سے باہر لوٹ مار کا راستہ تلاش کرنے لگیں۔

اجارہ دار سرمایہ داری اور جمہوریت

یہ سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کا نہایت ہی ترقی یافتہ روپ تھا۔ اسے اجارہ دار سرمایہ داری کا نام دیا گیا۔ یہی اجارہ دار سرمایہ داری سامراج کہلائی۔ اس سامراج نے اپنے ملک کی حدیں پھلانگ کر ایک بڑے عفریت کی طرح براعظم ایشیا، افریقہ وغیرہ کے بے شمار ملکوں کو بزور شمشیر اپنے زیر کر لیا۔ یورپ کی سامراجی طاقتوں نے یہ عمل ایک ہاتھ میں بائبل اور دوسری میں تلوار تھام کر کیا۔ جھوٹ، مکر، فریب، دھوکا، تشدد، غرضیکہ کوئی ایسا حربہ نہ تھا جسے آزاد قوموں کو محکوم بنانے کے لئے استعمال نہ کیا گیا ہو۔

اس جارحانہ اور ظالمانہ عمل کو انہوں نے نہایت ہی خوبصورت الفاظ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اس کو سفید فام لوگوں کا بوجھ قرار دیا۔ اسے پس ماندہ جہالت سے بھرے ہوئے غریب ممالک میں تہذیب اور روشنی پھیلانے کا مشن قرار دیا۔

لیکن یہ سارے نظریے اور تگ و دو دراصل ایک طرف مشینوں کے ذریعے پیدا کی ہوئی فاضل پیداوار کو بیچنے کے لئے منڈی کی تلاش تھی اور دوسری طرف مشروط اور نابرابر تجارت اور ٹیکسوں اور دوسرے ناجائز ذریعوں سے محکوم ملکوں کے عوام کو لوٹنے کی تدبیر

تھی۔ ہندوستان اس لوٹ کی کلاسیکی مثال ہے۔ یہ لوٹ برطانیہ کی جمہوری حکومت کے جھنڈے تلے نہایت ہی منظم طریقے سے کی گئی۔ وہ ہندوستان جو سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ انگریزی راج کے اختتام پر ایسا کوا رہ گیا جس کے سارے بال نوچ لئے گئے ہوں۔

جس طرح ایک سرمایہ دار ملک کے سرمایہ دار اپنے طبقے کے لئے حقیقی جمہوریت اور محنت کش طبقوں کے لئے محض کاغذی جمہوریت قائم کرتے ہیں اسی طرح سامراجی دور میں حاکم سرمایہ دار ملک اپنے ملک کے لئے جمہوریت اور خوشحالی اور محکوم ممالک کے عوام کے لئے عدم جمہوریت، بھوک اور قحط اور بے روزگاری کا موجب بنتے ہیں۔

چنانچہ برطانیہ نے ہندوستان اور دوسرے محکوم ممالک کی بے دریغ لوٹ کے ذریعے برطانیہ میں نہایت ہی اعلیٰ اور ارفع درجے کی جمہوریت قائم کی۔ برطانوی عوام کو آزادیوں سے بہرہ ور کیا۔ بلکہ دوسرے ملکوں کے باغیوں کو بھی اپنی سرزمین پر پناہ دی اور سامراجی لوٹ کا حصہ ان اداروں اور نظریات کی تعمیر کے لئے خرچ کیا۔ عوام کے لئے بھی سکول، ہسپتال، سڑکیں، سوشل سروس مہیا کی۔ ووٹ کا حق دیا۔ تحریر و تقریر کی آزادی بخشی، شہری آزادیوں کا تحفہ دیا۔ لیکن جب برطانوی عوام اور اشرافیہ اور سرمایہ داروں کی زندگی کو خوبصورت بنانے کا یہ عمل برطانیہ میں جاری تھا۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی فوجیں ہندوستان کے مختلف آزاد راجوں نوابوں اور دلی کی مغلیہ حکومت کو شکست دینے اور برباد کرنے کے لئے ہر چہار سو سے یلغار کر رہی تھیں۔ وہ عیاری اور دھوکے بازی سے پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو زیر کر رہے تھے۔ سرنگاپٹم میں شیر دکن سلطان ٹیپو کی حکومت کو تہس نہس کر رہے تھے اور لاولد مر جانے والے رجواڑوں کی حکومتوں کو غیر جمہوری اور استبدادی طریقوں سے ہڑپ کر رہے تھے۔ وہ اپنا مصنوعی نیل بیچنے کے لئے بہار کے نیل اگانے والے کاشتکاروں کو تباہ کر رہے تھے۔ اپنے کپڑے کی صنعت کو وسعت دینے کے لئے وہ ڈھاکہ کے پارچہ بافوں کے انگوٹھے قلم کر رہے تھے۔ آزادی اور جمہوریت کے یہ علمبردار ہندوستان میں اپنی آزادی کے لئے لڑنے والوں کو کچل کر دلی میں بوڑھے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے پوتوں کے سر دھڑ سے جدا کر کے اسے تحفے کے طور پر طشتری میں پیش کر رہے تھے۔ برطانوی سرزمین پر جمہوریت کے اعلیٰ اداروں اور انسانی آزادیوں کے ارفع اصولوں کی نشوونما کے لئے ہندوستان میں بہیمانہ عمل ضروری سمجھا گیا۔ برطانوی جمہوریت کی حسین نشوونما اور ہندوستان میں آزادیوں اور انسانیت کا قتل عام لازم و ملزوم تھا۔ اس دور میں یورپ اور

ہندوستان سے دور' موجودہ دور کی سب سے ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ جمہوریت---- جس کی چکا چوند نے پسماندہ نو آزاد ممالک کے جاگیردار سرمایہ دار حکمرانوں اور پیٹی بورژوا طبقوں کی آنکھیں خیرہ کی ہوئی ہیں- یہی عمل ایک دوسری شکل میں جاری تھا اور ترقی یافتہ اوزاروں' ہتھیاروں اور جدید جنگی علوم سے لیس یورپ کے سفید فام امریکہ میں یلغار کر رہے تھے اور امریکہ کے اصلی باشندوں' جن کو ریڈ انڈین کہا جاتا تھا اور جو ابھی پسماندہ قبائلی نظام کی حدود میں ہی زندگی بسر کر رہے تھے' کو بزور قوت تہس نہس کر کے ان کی زمینوں' جنگلوں' دریاؤں اور آسمانوں پر قبضہ کر رہے تھے- جب وہاں آبادیاں بڑھ گئیں اور پیداوار بڑھانے کے لئے زرعی مزدوروں کی مانگ پوری نہ ہوئی تو جمہوریت کے علمبرداروں نے ایک نیا گھناؤنا' انسان دشمن اور ظالمانہ راستہ اختیار کیا- انہوں نے افریقہ کے سیاہ براعظم کا رخ کیا اور وہاں سے جدید ہتھیاروں اور ساز و سامان کے بل بوتے پر افریقی باشندوں کو درندوں کی طرح شکار کرنے لگے اور لاکھوں کی تعداد میں غلام بنا کر امریکہ میں غلاموں کی منڈیوں میں عام اجناس کی طرح سرعام فروخت کیا- نئے زمانے میں یہ نئے غلام ہزاروں کی تعداد میں راستے میں ہی بھوک' بیماری اور ظلم و تشدد سے دم توڑ گئے اور جو زندہ بچے وہ یوسف بے کارواں کی طرح بک گئے- ان افریقی غلاموں نے اپنا خون اور ہڈیاں امریکی سماج اور اس کے جمہوری اداروں اور جمہوری آزادیوں کی بنیادیں استوار کرنے میں لگا دیا-

حتیٰ کہ جب یورپ کے آبادکاروں نے امریکہ میں برطانوی حکمرانی ماننے سے انکار کر دیا اور جنگ آزادی میں کامیاب ہو گئے تو آزادی کے جن دو رہنماؤں نے شہرہ آفاق "اعلان آزادی" (جو آج بھی انسان کی جمہوری جدوجہد میں سنگ میل گردانا جاتا ہے اور لکھوکھا دلوں کو گرماتا ہے) لکھا وہ خود ہزاروں غلاموں کے مالک تھے جنہیں آزادی کے اس حسین اعلان سے کچھ حاصل نہ ہوا تھا- اٹھارویں صدی میں بھی انہیں انسان نہیں سمجھا جاتا تھا- وہ محض غلام تھے وہ انسان نہیں تھے- ان کے کوئی حقوق نہ تھے- تاریخی ارتقاء کے دامن پر یقیناً یہ بدنما ترین داغ ہے- جسے نہ چھپانے سے چھپایا جا سکتا ہے اور نہ ہی دھونے سے دھویا جا سکتا ہے- حال ہی میں ایک امریکی حبشی نے افریقی حبشیوں کی غلامی کی خونچکاں داستان کو بارہ سال کی کٹھن تحقیق کے بعد اپنی کتاب جڑیں (Roots) میں نہایت ہی خوبصورت اور دلخراش انداز سے بیان کیا ہے- آج بھی امریکی حبشی ان بنیادی حقوق سے محروم ہیں جو لوگوں کو حاصل ہیں- آج بھی امریکی اجارہ دار لاطینی امریکہ' ایشیا اور افریقہ کے

کروڑوں عوام کا خون اپنی بالادست تجارتی پالیسیوں اور غیر مساوی معاہدوں کے ذریعے چوس رہے ہیں اور اپنی کھلی اور مخفی لوٹ مار اور استحصال کا جال پھیلانے کے لئے اسلحہ کے انبار لگا رہے ہیں۔ چھوٹی جنگیں لڑ رہے ہیں اور ستاروں کی جنگ کے نقشے بنا رہے ہیں۔ وہ آج بھی نکاراگوا کی جمہوری حکومت کو کچلنے کے لئے نہایت ہی ہٹ دھرمی سے مسلح مداخلت کر رہے ہیں۔ جنوبی افریقہ کی اقلیتی گورا حکومت کو حقیقی سیاہ فام باشندوں کو مغلوب اور محکوم بنانے کے لئے ہر قسم کی امداد فراہم کر رہے ہیں۔ ایسے ہی عزائم سے وہ آج پاکستان کی سرزمین کو افغانستان میں تاریخ کے دھارے کو بدلنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

پسماندہ اور نو آزاد ممالک کے عوام کے لئے یہ سب واقعات درس عبرت رکھتے ہیں۔ آج جب وہ اپنے ملکوں میں جمہوریت' آزادی اور خوشحالی کے قیام کے لئے جدوجہد کرتے ہیں تو انہیں برطانیہ اور امریکہ کے حکمران طبقوں کے حقیقی چہروں کو پہچان لینا چاہئے کیونکہ آج بھی استحصال اور لوٹ مار کی انہیں پالیسیوں کو رائج کرنے کے لئے انہوں نے چہرے پر آزاد دنیا "انسانی حقوق" وغیرہ کے خوبصورت نقاب اوڑھ رکھے ہیں اور ان خوبصورت نقابوں کے پیچھے نئے نو آبادیاتی نظام کی پالیسیاں نشوونما پاتی ہیں۔

جوں جوں سرمایہ داری نظام ترقی کرتا گیا اور اجارہ داریاں قائم ہوتی گئیں اور ایسے چند ممالک نے جن میں برطانیہ' فرانس' امریکہ' ہالینڈ وغیرہ شامل تھے۔ سامراجی طاقتیں بن کر ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کو نو آبادیات بنا لیا اور ان کی بے دریغ لوٹ اور استحصال سے اپنے اپنے ملکوں میں سرمایہ دارانہ جمہوریت کو جلا دی اور اسے نئی بلندیوں پر پہنچایا۔

لیکن جرمنی' اٹلی اور جاپان جیسے ممالک جنہوں نے سرمایہ دارانہ ترقی کی منزلیں قدرے بعد میں طے کیں۔ جب وہ اجارہ داری کی سطح پر پہنچے تو ان کے گرد و پیش میں کوئی ایسے ممالک نہ تھے جنہیں وہ نو آبادیات بنا لیتے۔ ان کے کارخانوں کے مال کی نکاسی کے لئے منڈیاں دستیاب نہ تھیں۔ انہیں اپنے کارخانوں کے لئے خام مال بھی سستے داموں میسر نہ آتا تھا۔ اس صورتحال سے نپٹنے کے لئے انہوں نے سب سے پہلے اپنے اپنے ملک میں جمہوری آزادیاں ختم کر دیں اور سرمایہ داروں کی ننگی آمریت قائم کر دی اور تحریر و تقریر کی آزادی' تنظیم و اجتماع کی آزادی وغیرہ حرف غلط کی طرح مٹا دی گئی اور جرمنی میں نازی ازم' اٹلی میں فاشزم اور جاپان میں شنٹو ازم کے نام پر ننگی آمریتیں وجود میں آ گئیں۔ آخر ان آمریتوں نے سرمایہ دارانہ جمہوری ریاستوں' پسماندہ ممالک اور سوویت یونین پر قبضہ جمانے

کے لئے دو بڑی جنگیں چھیڑ دیں۔ جن میں کروڑوں انسان' انسانی آزادی اور جمہوریت کو بچانے کے لئے کام آئے آج پھر امریکی سامراج کی رہنمائی میں سرمایہ داری نظام کی اجارہ دارانہ شکل کو قائم رکھنے کے لئے دنیا بھر میں تیسری جنگ عظیم کے لئے تیاریاں کی جا رہی ہیں اور پسماندہ ممالک کی سیاسی آزادیوں کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ سوشلسٹ نظام کو مٹانے کے لئے سازشوں میں مشغول ہیں اور جمہوری حکومتوں کو گرانے اور مٹانے کے لئے ہر قسم کے حربے استعمال کر رہی ہیں۔ نکاراگوا کے خلاف امریکی سامراج (جو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی ترقی یافتہ جمہوریت کہتا ہے) کی سازشیں اور کھلی جارحیت اسی بات کا بین ثبوت ہے کہ سرمایہ داری نظام اب جمہوریت کے پرانے چوکھٹے کے اندر قائم نہیں رہ سکتا۔

مختلف تاریخی ادوار کے اس مختصر جائزے سے ظاہر ہے کہ جمہوریت صرف ان طبقوں کے لئے ہوتی ہے جو وسائل پیداوار پر قابض ہوتے ہیں اور جو طبقے وسائل پیداوار کی ملکیت سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ہمیشہ ڈکٹیٹرشپ ہوتی ہے۔ مختلف ادوار میں اس کی نہ صرف مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ بلکہ ایک تاریخی دور میں بھی اس کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ جو مختلف طبقوں کی طاقت' شعور اور تنظیم پر مبنی ہوتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ عہد میں خاص طور پر سرمایہ دار طبقہ کی جمہوریت نے مختلف شکلیں اختیار کی ہیں۔ پارلیمانی نظام حکومت سے لے کر ننگی ڈکٹیٹرشپ (جیسے کہ جرمنی' اٹلی اور جاپان وغیرہ میں ہوا) سرمایہ داری نظام کے محافظ کے طور پر ظہور میں آئی ہیں۔ اس لئے سرمایہ دارانہ عہد میں اس نظام کی مختلف شکلوں اور اداروں کے متعلق محنت کشوں اور ان کی پارٹیوں کا رویہ حالات کے تقاضوں کے مطابق مختلف ہوتا ہے اور اس انقلابی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے سرمایہ داری نظام کی ان مختلف شکلوں کے متعلق ٹھوس حالات کے ادراک سے رویہ متعین کرنا ضروری ہے اور سرمایہ داری نظام کے اندر ہر اس سہولت کے لئے جدوجہد کرنا ضروری ہے جو اس نظام کے اندر ہو سکتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ان حقائق کو اچھی طرح سمجھا جائے کہ یہ منزل پر پہنچنے کے لئے سیڑھی کے طور پر استعمال ہو رہی ہے اور خود منزل نہیں ہے۔ اکثر اوقات دائیں اور بائیں بازو کے انقلابی ان حالات سے نشوونما پانے والی کج رویوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور بورژوا جمہوریت کے گن گانے میں سب کچھ کھو دیتے ہیں یا اس محدود جمہوریت کو بھی ٹھکرانے پر زور صرف کرتے ہوئے عوام سے الگ تھلگ ہو کر اپنی طاقت کو کمزور کر دیتے ہیں یا چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر رہ جاتے ہیں۔

مغربی سرمایہ دارانہ نظام جمہوریت کی حقیقت

پاکستان کے پڑھے لکھے اور درمیانہ طبقہ کے لوگ برطانوی اور امریکی جمہوریت سے بہت مرعوب ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ان ملکوں میں دولت کی فراوانی ہے۔ تحریر و تقریر کی آزادی ہے۔ تنظیم اور جلسے جلوس کی آزادی ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق پیشہ اختیار کرے اور اپنی ہی مرضی کے مطابق جس طرح چاہے زندگی گزارے اور یہ سب کچھ اس جمہوریت کی بدولت ہے جو برطانوی اور امریکی رہنماؤں نے صدیوں کے تجربات کے بعد قائم کی ہے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان ملکوں میں تحریر و تقریر اور نشر و اشاعت کے تمام وسائل بڑے بڑے اجارہ دار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں اور محنت کشوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہ سرمایہ دار ان تمام وسائل کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان ملکوں میں ان ذرائع کا بیشتر حصہ تو محض عوام کو ترغیب دینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ فلاں چیز خریدیں۔ سرمایہ داروں کے کارخانوں میں بنی ہوئی چیزوں کو بیچنے کے لئے اس قدر وسیع اور بھیانک پیمانے پر پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ اس پراپیگنڈا کے ذریعے عام لوگوں کے ذہنوں کو ماؤف کر دیا جاتا ہے۔ غلط اطلاعات اور غلط نظریات اس صفائی سے لوگوں کے ذہنوں میں اتار دیئے جاتے ہیں کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ سب کچھ دراصل ان کے چھینے ہوئے حقوق پر پردہ ڈالنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ محنت کش ان وسائل کو محض اس حد تک استعمال کر سکتے ہیں۔ جس حد تک کہ وہ سرمایہ داروں کے لئے خطرے کا باعث نہیں بن سکتے۔

وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ برطانوی جمہوریت کی عمارت پاکستان ہندوستان برما۔ سیلون۔ ملایا۔ افریقہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کے کروڑوں عوام کی ہڈیوں اور خون پر استوار کی گئی ہے اور انہیں کے خون سے اسے رنگ و روغن کیا گیا ہے جس قدر ان محکوم ملکوں کی آزادی ختم ہوئی اور دولت لٹی' اسی قدر برطانوی جمہوریت کے لئے غازہ اور سرخی مہیا ہوتی رہی۔ محکوم ملکوں کے کروڑوں عوام کے جبری استحصال اور لوٹ مار سے برطانوی جمہوریت کو جلا ملی تھی اور جمہوریت کے اس محل کی دیواریں محکوم ملکوں کی غلامی کی بنیادوں پر استوار ہوئی تھیں۔ لیکن آج وہ دور ختم ہو چکا ہے اور برطانوی سامراج سسکتا ہوا ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور برطانوی جمہوریت لامحدود وسائل کے نرغے میں گھری ہوئی ہے۔ روز بروز

عوام کے حقوق اور انہیں حاصل سہولتیں محدود ہوتی جا رہی ہیں۔ بے روزگاری اور تنگدستی ہر طرف منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ لوگوں کے بنیادی حقوق آہستہ آہستہ سلب ہو رہے ہیں اور کوئی جتن اسے از سرنو توانا اور جوان کرنے کے لئے کام نہیں آ رہا۔

وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی امریکی جمہوریت ریڈ انڈین' امریکہ کے اصلی باشندوں اور حبشی غلاموں کے خون سے سینچی گئی ہے تاریخ کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ سرمایہ داری نظام کے اس عہد نے جو آزادی' مساوات اور بھائی چارے کے سدا بہار اور مسحور کن نعروں کے جھرمٹ میں شروع ہوا تھا۔ امریکہ کے حقیقی باشندوں اور مالکوں کو اپنے ہی ملک میں اجنبی بنا دیا اور ان کے وسیع و عریض دولت سے مالا مال ملک کو ان نعروں کے علمبرداروں نے اپنے قبضہ میں لے لیا اور انہیں اتھاہ پس ماندگی اور بے بسی کے گڑھوں میں دھکیل دیا اور انہی نعروں کے ساتھ افریقہ کی بے بس اور پس ماندہ حبشی آبادیوں کا جانوروں کی طرح شکار کیا اور غلام بنا لیا۔ آج بھی امریکہ میں سیاہ فام لوگ ان حقوق سے محروم ہیں جو گوروں کو حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ امریکی اجارہ دار اپنی بین الاقوامی کمپنیوں کی بالادست تجارتی پالیسیوں اور غیر مساوی معاہدوں کے ذریعے لاطینی امریکہ' ایشیا اور افریقہ کے کروڑوں عوام کا خون چوس رہے ہیں اور اپنی کھلی اور مخفی لوٹ مار اور استحصال کو ساری دنیا میں پھیلانے کے لئے اسلحہ کے انبار لگا رہے ہیں ستاروں کی جنگوں کی تیاری کر رہے ہیں اور دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔

تاریخ نے جو شاندار مواقع برطانوی اور امریکی جمہوریت کی نشوونما کے لئے مہیا کئے وہ آج کی دنیا میں پاکستان کو کبھی مہیا نہیں ہو سکتے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت کے چند نعرے

بالغ رائے دہی کا اصول سرمایہ داری عہد کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس اصول کو سرمایہ داروں کی رہنمائی میں مسلسل جدوجہد کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے۔ برطانیہ میں 1649 اور 1832 اور فرانس میں 1779 اور 1848 کے انقلابات نے بالغ رائے دہی کے مطالبہ کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ روس میں 1905ء اور فروری 1917ء میں بھی بالغ رائے دہی کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ بالغ عورتوں کے لئے تو رائے دہی کا حق اس صدی میں کہیں جا کر حاصل ہوا۔ اس عام رائے دہی کے حق سے پہلے وہی بالغ مرد ووٹ دے سکتے تھے جو کچھ جائیداد کے

مالک ہوتے تھے یا پڑھے لکھے سمجھے جاتے تھے۔ 1947ء سے متحدہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے پرچم پر بھی بالغ رائے دہی کا مطالبہ جلی حروف میں کندہ تھا جسے متحدہ ہندوستان کی تحریک آزادی نے ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل کیا۔ پاکستان کا وجود بھی اسی بالغ رائے دہی کے اصول کا مرہون منت ہے۔ لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد 1970ء تک اس اصول کی بنیاد پر کبھی مرکزی انتخابات نہ کروائے گئے بلکہ 1958ء سے 70ء تک اسمبلیوں کے انتخابات کے لئے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کا سہارا لیا گیا۔ شائد اس کی وجہ یہ تھی کہ 1954ء میں مشرقی پاکستان میں صوبائی انتخابات میں جو بالغ رائے دہی کی بنیادوں پر ہوئے' مسلم لیگ کو شکست فاش ہوئی تھی۔ اس لئے 1970ء تک حکمران جاگیردار اجارہ دار سرمایہ دار طبقے بالغ رائے دہی اور براہ راست انتخاب کے نعرے عوام کے سامنے پیش کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے اس پر کبھی عمل نہیں کیا 1970ء میں پہلی بار یحییٰ خاں کے مارشل لاء کی چھتری کے تحت بالغ رائے دہی کے اصولوں کی بنیاد پر انتخابات کروائے گئے۔ لیکن یحییٰ خان اور حکمران ٹولے نے انتقال اقتدار کرنے سے انکار کر دیا حتیٰ کہ پاکستان میں 1985ء میں آٹھ سال کے طویل مارشل لاء کے بعد انتخابات بالغ رائے دہی کے حق کی بنیاد پر کروائے گئے ہیں۔ لیکن اس حق کو مسخ کرنے کے لئے ان انتخابات کو غیر سیاسی اور غیر جماعتی بنا دیا گیا ہے انتخابات کے عمل کے بعد بھی مارشل لاء جاری رکھا گیا ہے اور اس طرح غیر جانبدارانہ منصفانہ انتخابات کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود انتخابات کی نفی کر دی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈھونگ محض مارشل لاء کو دوام بخشنے کے لئے رچایا گیا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں بالغ رائے دہی کی بنیادوں پر بھی اگر انتخابات کروائے جائیں تو اکثر اوقات جاگیردار اور سرمایہ دار طبقوں کے نمائندے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر محنت کش طبقے اپنی تنظیم اور جدوجہد کے ذریعے کبھی پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تب بھی حکمران طبقے اور فوج انہیں برسر اقتدار نہیں آنے دیتی۔ فرانس اور اٹلی میں دوسری جنگ عظیم کے بعد ایسا ہی ہوا۔

1970ء کے عشرہ میں جنوبی امریکہ کے ملک چلی میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب حکومت کا تختہ سی آئی اے کی مدد سے فوج نے الٹ دیا۔ پچھلے دس بارہ سال سے چلی میں فوجی حکومت قائم ہے جس نے ہزاروں سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کو قتل کروایا ہے۔ 1936-37ء میں سپین میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب ری پبلکن حکومت کا تختہ جنرل

فرانکو نے ہٹلر، مسولینی اور امریکی، برطانوی اور فرانسیسی سرمایہ داروں کی ایماء اور مدد سے عوام کے انتخابی فیصلے کو ٹینکوں اور بموں سے بدلنے کے لئے الٹ دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جاگیرداری سرمایہ داری نظام میں محض بالغ رائے دہی کا حق عوام کو ہر پانچ سال بعد صرف اس بات کا موقع دیتا ہے کہ وہ اگلے پانچ سال کے لئے کس کس سرمایہ دار اور جاگیردار کو اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں جونہی کہیں کوئی پارلیمنٹ پیداواری رشتوں کو تبدیل کرنے کے لئے قدم اٹھاتی ہے اسے فوجی طاقت اور سامراجی امداد سے ختم کر دیا جاتا ہے۔

سرمایہ دار ملکوں میں محنت کشوں کی پارٹیوں اور تنظیموں کو پنپنے نہیں دیا جاتا اور ہر وقت ان کے سر پر سیفٹی ایکٹ اور دفعہ 144 جیسے قوانین کی تلوار لٹکتی رہتی ہے اور ان غیر جمہوری حربوں کے ذریعے کوشش کی جاتی ہے کہ وہ انتخابات میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں۔

پاکستان میں انتخابات کے تجربے نے عوام پر واضح کر دیا ہے کہ جاگیرداری سرمایہ داری کے موجودہ نظام میں سرمایہ دار، جاگیردار روپے پیسے، طاقت دھونس اور دبدبہ، غنڈہ گردی، بدمعاشوں، سمگلروں اور رسہ گیروں کے ذریعے انتخاب جیت جاتے ہیں اور اگر یہ ہتھیار کارگر نہ ہو تو نوکر شاہی اور پولیس کھلم کھلا ان کی امداد کرتی ہے اور اگر اس کے باوجود محنت کشوں کا کوئی نہ کوئی نمائندہ جیت جائے تو اسے ووٹوں کی گنتی کے وقت جھرلو کے ذریعے سے شکست دی جاتی ہے۔

جاگیرداری سرمایہ داری نظام میں محض بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخاب کے ان نتائج کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں کی کوششوں اور ہتھکنڈوں کے باوجود اگر ان کے مفادات کے خلاف ہوں تو ختم کرنے کے لئے ہمیشہ ان طبقوں نے جمہوریت کے نقاب کو اتار پھینکا ہے اور ننگی طاقت کا استعمال کیا ہے اور محنت کشوں کی عظیم اکثریت کو بالغ رائے دہی کے جمہوری حقوق سے محروم کر دیا ہے۔

اگر جاگیرداروں سرمایہ داروں کو یہ کہا جائے کہ اگر واقعی وہ جمہوریت چاہتے ہیں تو انہیں اپنی تعداد کے مطابق نمائندگی حاصل کرنی چاہئے اور مزدوروں اور کسانوں اور دوسرے محنت کشوں کو ان کی تعداد کے مطابق نمائندگی ملنی چاہئے تو وہ جاگیرداری سرمایہ داری نظام کے اندر بھی اس تجویز کو منظور نہیں کریں گے۔ حالانکہ ان کے پاس ایسے وسائل موجود ہیں

کہ وہ مختلف طبقوں میں اپنے لئے ٹاؤٹ خرید لیں۔

ظاہر ہے کہ بالغ رائے دہی کے اصول منوانے کے باوجود مزدور کسان اور دوسرے محنت کش طبقے جاگیرداری سرمایہ داری نظام میں کبھی اپنی نمائندہ حکومت قائم نہیں کر سکتے اور کر لیں تو اسے الٹنے کے لئے فوجی طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس لئے بالغ رائے دہی کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ مزدوروں کسانوں اور درمیانہ طبقہ کے سیاسی شعور کو بلند کرنے اور اسی حق کو صحیح طرح استعمال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سامراجی غلبہ سے نجات' جاگیرداری نظام کے خاتمہ' بنکوں انشورنس کمپنیوں' بیرونی تجارت اور اجارہ داریوں کو قومی ملکیت میں لانے کا مطالبہ بھی کیا جائے۔ کیونکہ ان مطالبات کے حصول کے بغیر محض بالغ رائے دہی سرمایہ داروں کی دھوکے بازی' مکاری اور لوٹ کھسوٹ پر پردہ پوشی کا ذریعہ بن جاتی ہے جب تک بالغ رائے دہی کے حق کے مزدوروں کے استعمال کے لئے سازگار حالات پیدا نہیں کئے جاتے بالغ رائے دہی صرف سرمایہ داروں' جاگیرداروں کے ہاتھ میں اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے ایک ہتھیار بن کر رہ جاتی ہے۔

سرمایہ داری نظام کے انحطاط کے اس دور میں سرمایہ دار جاگیردار بالغ رائے دہی کے حق کو بھی محنت کشوں سے چھین لینا چاہتے ہیں اور بار بار کوشش کرتے ہیں کہ وہ بالواسطہ طریقے سے انتخابات کروائیں بلکہ براہ راست فوجی حکومت قائم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ پاکستان پچھلے 40 برس سے ایسے ہی تجربات کی بھٹی سے گزر رہا ہے۔

بالغ رائے دہی کے حق کے استعمال میں ان کمزوریوں کے باوجود سماجی ارتقاء میں اس کا حصول سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں بے بس انسانوں کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار آ جاتا ہے جسے وہ منظم اور باشعور طریقے سے استعمال کر کے اس نظام کے اندر بھی اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اصلاحات نافذ کروا سکتے ہیں اور بعض اوقات وسائل پیداوار پر قابض حکمران طبقوں پر زبردست دباؤ ڈال کر اپنے مفادات کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں مغربی بنگال تری پورہ وغیرہ میں محنت کشوں نے باشعور طریقے سے اپنا ووٹ کا حق استعمال کر کے صوبائی سطح پر کمیونسٹ پارٹی اور محنت کشوں کی دوسری پارٹیوں کے متحدہ محاذ کی حکومت قائم کر رکھی ہے اور کانگرس کے حربوں اور ہتھکنڈوں کو بار بار شکست دی ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک قدم آگے کی طرف بڑھایا ہے۔ اس لئے بالغ رائے دہی کے حق کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا محنت کشون کی بنیادی

ضرورت ہے نیز اس جدوجہد کے دوران ان کا سماجی اور سیاسی شعور بلند ہوتا ہے اور وہ اپنے تجربے سے سمجھتے ہیں کہ جمہوریت' عوامی جمہوریت اور سوشلزم کے لئے ایک سیڑھی ہے جسے استعمال کرنا ان کے مفاد میں ہے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت میں بنیادی حقوق کے نعرے

فرانس کے بورژوا انقلاب (1779ء) کے نعرے "آزادی' مساوات' بھائی چارہ" آج بھی انسانوں کے دلوں کو گرماتے ہیں' روحوں کو بالیدگی عطا کرتے ہیں۔ پس ماندگی' غلامی اور بے بسی کی زنجیروں کو توڑنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور انسان کے رہنے کے قابل نئی دنیا کی بشارت دیتے ہیں۔ یہ نعرے بہت خوبصورت' حسین اور دل پذیر ہیں۔ اور صدیوں کے دوران انسان کی گھمبیر جدوجہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ لیکن طبقاتی سماج میں ان نعروں کے حقیقی معنی بھی محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان نعروں نے بورژوا سماج میں بنیادی حقوق کے باب کو جنم دیا ہے ہر شخص انسان کے بنیادی حقوق کی بات کرتا ہے۔ اور بنیادی حقوق کو آئین کی کتاب میں رقم کرنے کا خواہاں ہے اور آئین میں ان رقم شدہ حقوق کو عمل میں لانے کے لئے تگ و دو کرتا ہے۔ بورژوا سماج میں بنیادی حقوق میں سرفہرست جائیداد کی ملکیت کا حق ہے اور اس حق کو نہایت ہی ارفع اور عزیز گردانا جاتا ہے۔ صدیوں سے روندے کچلے انسانوں کو حکمران طبقوں نے اس حق سے محروم کر رکھا ہے۔ جونہی نئے پیداواری اوزاروں اور نئے پیداواری رشتوں نے بورژوا سماج کو جنم دیا' بے بس و مقہور انسانوں کو جن کے پاس سر چھپانے کو بھی اپنی کوئی جگہ نہیں تھی اس حق کی مقناطیسی قوت نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس حق کے پردے میں جو انہیں اس قدر عزیز ہے' انہیں کیونکر غلامی کی نئی غیر مرئی زنجیروں میں جکڑ لیا جائے گا۔ اور اک لامحدود طاقت اور بے مثال قوت ایک محدود طبقے کو سونپنے کے لئے وہ آلہ کار بن جائے گا۔ چنانچہ جائداد کی ملکیت کے حق کی آڑ میں سرمایہ دار طبقے نے لامحدود ملکیت کا حق حاصل کر لیا۔ اور اس طرح کروڑوں انسانوں کو اس حق سے عملی طور پر محروم کر دیا' گو وہ قانون اور آئین کے مطابق جائیداد حاصل کرنے کا حق رکھتے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں ایک طرف مٹھی بھر سرمایہ دار اور جاگیردار بڑی بڑی ملوں اور فیکٹریوں اور ہزاروں ایکڑ زمین کے مالک ہیں مگر محنت کشوں کے پاس سر چھپانے کی بھی جگہ نہیں اور وہ اچھی خوراک اور لباس سے بھی محروم ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر وسائل پیداوار پر ذاتی ملکیت کے لامحدود حق کو مقدس مان لیا جائے تو پاکستانی سماج میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی جو پچاسی فیصدی محنت کش عوام کی زندگی کو جہالت' پس ماندگی' غربت اور بے بسی سے نجات دلا سکے۔ جب تک زمین پر جاگیردار مسلط رہیں گے' جب تک سرمایہ دار' صنعتوں اور تجارت اور بنکوں اور کمپنیوں کے مالک رہیں گے' پاکستان میں حقیقی آزادی' خوشحالی اور جمہوری سماج قائم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پاکستان کے ارب پتی سرمایہ داروں اور بڑے جاگیرداروں نے اپنے روپے پیسے سے جمہوریت کو اپنی باندی بنا رکھا ہے۔ چنانچہ محنت کش طبقے کبھی ایسے قوانین' جو وسائل پیداوار کی نجی ملکیت کے حق کو تقدس بخشتے ہیں' منظور کرنے کو تیار نہیں کیونکہ وہ بنیادی طور پر وسائل پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کی جدوجہد کی نفی کرتے ہیں اور اس کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

سرمایہ داری' جاگیرداری نظام کے علمبردار محنت کشوں کے ذہنوں کو ماؤف کرنے اور شک و شبہات پیدا کرنے کے لئے ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت اور اشیائے استعمال (روٹی' کپڑا' مکان' موٹر' سائیکل' برتن' ریڈیو' ٹیلی ویژن' فرج وغیرہ) کی نجی ملکیت کو ہمیشہ گڈ مڈ کر کے پیش کرتے ہیں۔ وہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ سوشلسٹ نظام میں ہر چیز پر ریاستی ملکیت ہو گی۔ حتیٰ کہ عورت بھی ریاست کی ملکیت ہو گی۔ لوگوں کو ایک ہی قسم کی روٹی مہیا کی جائے گی۔ ایک ہی قسم کے کپڑے پہننے پر مجبور کیا جائے گا اور انہیں محض جانوروں کی طرح جینے کا حق دیا جائے گا۔ ان کی زندگی میں کوئی جدت نہیں ہو گی' کوئی ذاتی پسند نہیں ہو گی۔ کوئی رنگینی نہیں ہو گی اور وہ محض کولہو کے بیل کی طرح شب و روز کام کرنے پر مجبور ہوں گے۔ یہ سارا پراپیگنڈہ ایک سفید جھوٹ ہے' نہایت ہی سطحی' بودی اور بے بنیاد بات ہے۔ آج عملی زندگی میں سوویت یونین اور دوسری سوشلسٹ ریاستوں میں اس پراپیگنڈہ کی قلعی کھل چکی ہے۔ جہاں سرمایہ دار ملکوں کے لاکھوں سیاح ہر سال سیر و تفریح سے محظوظ ہونے کے لئے جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے وہاں کے باشندوں کا رہن سہن دیکھتے ہیں۔ اسی کے عشرہ کے شروع میں جب سرمایہ دار دنیا میں کروڑوں مزدور بے روزگار اور بے گھر ہو رہے تھے اور زندگی کی وہ آسائشیں جو انہوں نے طویل اور کٹھن جدوجہد سے حاصل کی تھیں' سرمایہ داری نظام کے بحران کی نذر ہو رہی تھیں' سوشلسٹ ممالک میں نہ صرف یہ کہ کوئی بے روزگار نہ تھا بلکہ زندگی روز بروز زیادہ دلکش' زیادہ بھرپور اور پررونق ہوتی جا رہی تھی۔ اور ہر گھرانے میں روزمرہ کے استعمال کی چیزیں زیادہ ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر خاندان مکان کا مالک

بن چکا تھا۔ لیکن اس کے برعکس امریکہ میں ہزاروں گھر خالی پڑے تھے اور لاکھوں لوگ پارکوں اور اپنی موٹروں میں سو رہے تھے۔

سرمایہ داری سماج میں دوسرا بنیادی حق تحریر و تقریر کا حق بیان کیا جاتا ہے۔ اس سماج میں چونکہ وسائل پیداوار مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس لئے محنت کشوں کے لئے یہ حق محض کتاب قانون کی زینت بن کر رہ جاتا ہے۔ کاغذ اور سیاہی' لاؤڈ سپیکر' ریڈیو' ٹیلی ویژن' اخبار اور کتابیں محنت کش طبقوں کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔ محنت کش عوام رات دن اپنی روزی کمانے کے چکر میں گرفتار رہتے ہیں۔ ان کی غربت اور بے کسی تعلیم کے اعلیٰ اداروں کے دروازے ان پر بند کئے رکھتی ہے۔ پاکستان میں 99 فیصدی اخبارات اور رسائل اور پریس جاگیردار اور سرمایہ دار طبقوں کی ذاتی ملکیت کے نظریہ کے نقیب ہیں۔ یہ طبقے خواہ حکومت کے اندر ہوں یا باہر' نشر و اشاعت کے وسائل پر قابض ہیں اور جب کبھی محنت کش طبقے اپنے حقوق حاصل کرنے اور اپنے نظریات پھیلانے کے لئے اپنی قربانیوں سے کوئی اخبار یا رسالہ وغیرہ چھاپنے کا بندوبست کرتے ہیں تو حکمران اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک ان کی آواز کو بند نہیں کر دیا جاتا۔ پاکستان ٹائمز اور امروز اور لیل و نہار چونکہ محنت کشوں کے ہمدرد تھے' اس لئے ان کے مالکوں سے ہتھیا لئے گئے اور انہیں سرمایہ دار اور جاگیردار طبقوں کے مفاد میں استعمال کیا جانے لگا۔ حکومت کے باہر جماعت اسلامی اور دوسری رجعت پسند جماعتیں اور تنظیمیں' محنت کشوں کی آواز کو گوارا تک نہیں کرتیں۔ باوجود اس کے کہ وہ آزادی تحریر و تقریر کی علمبردار بنتی ہیں' وہ محنت کشوں کے اخبار اور کتابوں کو ضبط کرنے کے متعلق حکومت سے مطالبہ کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ لکھنے اور چھاپنے والوں کو ملک بدر کرنے کے لئے آواز اٹھاتی رہتی ہیں۔ چند سال پہلے کراچی میں پی آئی اے یونین کے اخبار "منشور" کو بند کرنے کے لئے جماعت اسلامی مسلسل مطالبہ کرتی رہی حتیٰ کہ اسے غیر قانونی طور پر بند کر دیا گیا۔ 1947ء سے لے کر اب تک پاکستان میں کئی روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات' کتابچے اور کتابیں جو محنت کشوں کے مفادات کے نقیب سمجھے جاتے تھے ضبط کئے جاتے رہے ہیں۔ بالغ رائے کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومتوں اور مارشل لاء کی حکومتوں کے تحت بھی پبلک سیفٹی ایکٹ' سکیورٹی ایکٹ' ڈیفنس آف پاکستان رولز' مارشل لاء ضابطے بھی محنت کشوں کے خلاف ہی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ 1947ء سے پہلے بغیر مقدمہ چلائے کسی شخص کو چھ ماہ سے زائد نظر بند نہیں کیا جا

سکتا تھا۔ لیکن ممتاز دولتانہ' عبدالقیوم خان اور چودھری محمد علی کے دور اقتدار میں چھ ماہ کی پابندی ختم کر دی گئی۔ اور حکومت کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ کسی بھی سیاسی کارکن' رہنما یا اخبار نویس وغیرہ کو غیر معینہ عرصہ کے لئے نظر بند رکھ سکتی ہے۔ برطانوی دور حکومت کے استبداد کی یادگار شاہی قلعہ اور لال قلعہ کے تاریک سیل 39 سال تک ہر حکومت کے دور میں سیاسی کارکنوں کے لئے اذیت گاہوں کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ 1986ء کے وسط میں پنجاب حکومت نے نہایت ہی طمطراق سے شاہی قلعہ کو عقوبت گاہ کو ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لوئر مال اور گلبرگ کے نئے تعمیر شدہ تھانوں میں جدید طرز کی صعوبت گاہیں تعبیر کر دی گئی ہیں۔

ہڑتال کا حق

ہڑتال کا حق---- مزدور طبقے کا بنیادی حق ہے۔ اسے بین الاقوامی مزدور تحریک نے بیش بہا قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے مگر پاکستان میں اس حق کو 1947ء کے بعد چھین لیا گیا حالانکہ یہ حق قانون کی کتاب میں موجود تھا۔ عدالت عالیہ نے نہ صرف یہ کہ اس حق کی حفاظت نہیں کی بلکہ اس کے خلاف فیصلے دیئے۔ اور اس حق کو استعمال کرنے کے عمل کو ملک دشمنی قرار دے دیا۔ 1948ء میں ریلوے ورکرز یونین کے دو رہنماؤں کو اس بنا پر چھ ماہ کے لئے نظر بند کر دیا گیا تھا کہ انہوں نے قانون کے مطابق ہڑتال کا نوٹس دیا تھا۔ جب اس نظر بندی کے خلاف ملک کے ایک نامور جمہوریت پسند وکیل نے عدالت عالیہ میں درخواست دی تو وہ درخواست محض اس بنا پر نامنظور کر دی گئی کہ ہڑتال کا نوٹس دیا گیا تھا اور دونوں رہنماؤں کی نظر بندی کو جائز اور قانونی قرار دے دیا گیا۔ ہڑتال کے حق کے ساتھ ساتھ محنت کشوں نے خونیں جدوجہد کے ذریعے دن میں آٹھ گھنٹے کام کرنے کے حق کو بھی تسلیم کروایا ہے' 1886ء سے پہلے 18 گھنٹے تک بھی روزانہ کام لیا جاتا رہا ہے لیکن شکاگو کے محنت کشوں نے آٹھ گھنٹے کام کرنے کے حق کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے حاصل کیا۔ محنت کشوں کی اس عظیم جدوجہد کو ہر سال کروڑوں محنت کش پہلی مئی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی محنت کش اس حق سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ اور اب دیہات میں بھی مزدور آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ لیکن اس حق کے

باوجود آج بھی لاکھوں مزدوروں کو آٹھ گھنٹے سے زائد کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات محنت کش اپنی قلیل آمدنیوں میں اضافے کے لئے اوور ٹائم لگانے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔

قانون کی حکومت

سرمایہ دارانہ جمہوریت میں تیسرا بڑا نعرہ قانون کی حکومت کا نعرہ ہے۔ اس نعرے کی چمک دمک پیٹی بورژوا ذہنوں کو تو بالکل ماؤف ہی کر دیتی ہے۔ اور وہ کبھی سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ اس کے معانی کیا ہیں۔ پاکستان کی ہر حکومت دعوے کرتی رہی ہے کہ وہ سختی سے قانون پر عمل پیرا ہو گی۔ اور عوام دشمن اور سماج دشمن عناصر کو بھی مجبور کر دے گی کہ وہ قانون کا احترام کریں۔ حتیٰ کہ مارشل لاء حکومت' جو جنگل کے قانون کی حکومت ہوتی ہے' وہ بھی قانون کے احترام کی بہت بات کرتی ہے۔ اور غیر قانونیت کو نہایت سختی سے کچل دینے کے اعلان کرتی ہے۔

مگر ہم جانتے ہیں کہ دفعہ 144 کا قانون برطانوی سامراجی ضروریات کے تحت بنایا گیا تھا۔ 1947ء کے بعد اسے پارلیمانی اور صدارتی حکومتیں بھی دل کھول کر استعمال کرتی رہی ہیں۔ 1973ء کے آئین کی بحالی کے لئے پاکستانی عوام ساڑھے نو سال سے نہایت ہی گھمبیر جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ اسی آئین کے ہوتے ہوئے بھی دفعہ 144 قانون کی کتاب میں نہ صرف محفوظ رہی بلکہ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں شروع سے آخر تک دفعہ 144 کا نفاذ مسلسل جاری رہا۔ اور جلسے' جلوسوں اور سیاسی اجتماعات پر پابندیاں عائد رہیں۔ 1947ء سے پہلے اس قانون کو برطانوی سامراج اپنے حکمرانی کے مفادات کی حفاظت کے لئے استعمال کرتا تھا مگر 1947ء کے بعد پہلے جاگیردار حکمران اسے استعمال کرتے رہے اور پھر جاگیردار' سرمایہ دار' فوجی اور سول نوکر شاہی اسے استعمال کرتی رہی۔ پبلک سیفٹی ایکٹ اور ڈیفنس آف پاکستان رولز جیسے قوانین بھی بالغ رائے دہی کی بنیادوں پر منتخب شدہ اسمبلیوں نے پاس کئے اور وہ آج تک قانون کی کتاب میں موجود ہیں۔ مزدور کے ہڑتال کے حق کو محدود کرنے کے لئے بھی اسمبلیوں میں قوانین بنائے جاتے ہیں۔ صنعتی عدالتوں کے قوانین رائج کئے جاتے ہیں ان قوانین میں بعض ایسی شقیں شامل کر دی جاتی ہیں جو محنت کشوں کے مفادات کے خلاف ہوتی ہیں۔ ایسے قوانین محنت کشوں اور دوسرے جمہوری طبقوں کے خلاف استعمال ہوتے

چلے جاتے ہیں۔ اگر کوئی قوانین عوام کے حق میں بھی بنائے جائیں جیسے کچھ ٹریڈ یونین قوانین یا مزارعین کی بے دخلی کے متعلق قوانین ہیں' تو ان کا نفاذ بھی ایسے افسران کے ذریعے ہونا ہوتا ہے' جن میں سے شاذ ہی کوئی ان طبقوں سے ہمدردی رکھتا ہو۔ عوام کے خلاف ایسے قوانین استعمال کرنے والے ہمیشہ سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ عین قانون کے مطابق احکام صادر کر رہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جمہوریت کے علمبردار رہنماؤں نے اپنے دور حکومت میں انہیں ختم نہیں کیا اور نہ ہی ان قوانین کو ختم کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ وہ تو صرف یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان قوانین کو ان کے خلاف استعمال نہ کیا جائے۔ اگر یہ قوانین محنت کشوں اور ان کے رہنماؤں کے خلاف استعمال ہوں تو ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ ان قوانین کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ اگر وہ برسر اقتدار آئیں تو بھی عوام دشمن قوانین استعمال کر سکیں۔ پانچویں دہائی میں تو پاکستان کے سب سے اعلیٰ قانونی ادارے نے یہ فتوے دے دیا تھا کہ طاقت کے بل بوتے پر قائم شدہ حکومت قانونی حکومت ہے۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں بھی پاکستان کی سپریم کورٹ نے 1973ء کے آئین کو ختم کر کے جو حکومت قائم کی گئی' اسے نظریہ ضرورت کے تحت قانونی قرار دے دیا تھا۔ حالانکہ ملکی آئین کو توڑنے کے جرم میں پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی تھی۔ سپریم کورٹ کے اسی فیصلے کے تحت سارے مارشل لاء دور میں فوجی عدالتیں کام کرتی رہیں۔ جہاں انصاف کا دن دہاڑے قتل عام ہوتا رہا۔ اور اب تو پاکستان کی اسمبلی نے ایسا قانون پاس کر دیا ہے جس کے تحت مارشل لاء کے زمانے کے غلط سے غلط اقدام کو بھی تحفظ مل گیا ہے۔ اور اسے قانون کی حکمرانی کا نام دیا جاتا ہے۔

پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں نیشنل عوامی پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور نیپ کے رہنماؤں کے خلاف ملک دشمنی وغیرہ کے بے بنیاد الزامات کے تحت مقدمہ قائم کر دیا گیا اور حیدر آباد جیل میں طویل عرصہ تک یہ مقدمہ زیر سماعت رہا۔ اس قانون کے تحت ہر وہ شخص جو اس نظریہ کا پرچار کرتا ہے کہ پاکستان میں چار پانچ قومیتیں بستی ہیں' اسے سات سال کی بامشقت سزا ہو سکتی ہے۔ اور یہ قانون آج تک قانون کی کتاب میں موجود ہے۔ آج ملک کے اندر پاکستان میں بسنے والی مختلف قومیتوں کے حقوق کے حفاظت کے لئے کھلم کھلا بحث مباحثہ ہو رہا ہے اور ایم آر ڈی نے مختلف قومیتوں کے حق خود اختیاری کے مسئلے کے حل کے لئے ایک مربوط اور قابل قبول حل پیش کیا ہے۔ لیکن اس قانون کے تحت آج بھی

ایم آر ڈی اور ان کے ہمنوا دوسرے رہنماؤں کے خلاف کسی وقت بھی مقدمات قائم کئے جا سکتے ہیں اور ان کو سات سال تک سزا ہو سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام قوانین ملک کے سماجی ڈھانچے کا مظہر ہوتے ہیں اور حکمران طبقوں کے مفادات کی حفاظت کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محنت کش طبقے بھی سرمایہ دارانہ سماج میں اپنی جدوجہد سے اپنے حقوق کچھ حد تک منوا لیتے ہیں اور حکمران طبقوں کو انہیں قانونی شکل دینے پر مجبور کر دیتے ہیں لیکن جن طبقوں کے ہاتھوں میں وسائل پیداوار ہوتے ہیں' وہ ایسے قوانین کو کبھی بھی پوری طرح عمل میں نہیں آنے دیتے۔ آج تک جتنے بھی قوانین مزدوروں اور کسانوں کے حق میں بنائے گئے ہیں عوامی دباؤ کے تحت بنے ہیں۔ ان کی عملی صورت دیکھنے سے ساری حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً مزارعین کے متعلق یہ قانون موجود ہے کہ انہیں اس وقت تک بے دخل نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ مزارعت کی شرائط پوری کرتے ہیں۔ لیکن عمل میں ہزاروں مزارعین کو مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پاکستان کے ایک جج نے حکومت کی طرف سے انعام میں ملنے والی چھ مربع اراضی سے مزارعین کو پولیس اور محکمہ مال کے حکام کی مدد سے بغیر کسی نوٹس یا دعوے کے بے دخل کروا دیا۔

اس کے علاوہ قانون پر عمل درآمد کروانا اس قدر مہنگا عمل ہے کہ محنت کش طبقے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اس کی مدد کسی صورت بھی نہیں لے سکتے۔ پاکستان کے بڑے بڑے وکلاء جو شب و روز قانون کی حکومت کی رٹ لگاتے رہتے ہیں' وہ اپنی فیسوں میں کمی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی فیسیں تو بڑے بڑے سیٹھ اور جاگیردار یا رشوت خور نوکر شاہی اور حکومت ہی ادا کر سکتی ہے اور وہی قانون کی حکومت سے صحیح معنوں میں مستفید ہو سکتے ہیں۔

ترقی پسند کارکنوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جاگیردار سرمایہ دار سماج میں بنیادی حقوق ان طبقات کے مفادات کی حفاظت کے لئے ہی استعمال ہوتے ہیں' جو وسائل پیداوار پر قابض ہوتے ہیں۔

بنیادی حقوق کے نعرے اور ترقی پسند کارکنوں کا رویہ!

ہم نے سرمایہ دارانہ جمہوریت کے چند عظیم نعروں کا تجزیہ کیا ہے اور یہ بتانے کی

کوشش کی ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج کے اندر یہ نعرے جاگیردار سرمایہ دار طبقوں کے مفادات کی ہی آبیاری کرتے ہیں اور محنت کش ان حقوق سے پوری طرح استفادہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس ایسے وسائل ہی نہیں ہوتے جن سے وہ بہرہ ور ہو سکیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان نعروں کو خیرباد کہہ دیں اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیں اور ان کی مخالفت کرنا شروع کر دیں۔

طبقاتی سماج میں ان نعروں کا کردار کا تجزیہ کرنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم ان نعروں کو نامنظور کر دیں۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نعرے سماجی ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ہزارہا سال میں انسانی سماج نے جو ترقی کی ہے اس کی عکاسی کرتے ہیں۔

جاگیردار' سرمایہ دار طبقے ان نعروں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ محنت کش طبقے بھی انہیں سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے ہوتے ہوئے بھی اپنے مفادات کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور کچھ حد تک اپنے مفادات حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں میں منظم محنت کشوں نے بنیادی حقوق حاصل کرنے میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ انہوں نے بیکاری الاؤنس' علاج معالجے اور تعلیم کی سہولتیں' اپنی کٹھن جدوجہد سے حاصل کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ طبقاتی سماج کے اندر بھی بالادست طبقوں سے اپنے حقوق چھینے جا سکتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ طبقاتی سماج میں ان نعروں کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے اپنے علم پر قومی اور عوامی جمہوریت کے نعرے رقم کریں۔

قومی اور عوامی جمہوریت کا مطلب ہے سامراجی بالادستی اور لوٹ کھسوٹ کا مکمل خاتمہ' جاگیرداری نظام اور گماشتہ سرمایہ داری کا قلع قمع۔ بنیادی حقوق میں سے نجی ملکیت کے لامحدود حق کو ختم کر کے اگر ان نعروں کو قومی اور عوامی جمہوریت کے پروگرام کے ساتھ پیش کیا جائے تو یقیناً یہی نعرے ترقی پسند کردار ادا کر سکتے ہیں اور نامکمل بورژوا جمہوری انقلاب کی تکمیل کی جدوجہد میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

ترقی پسند کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ ان نعروں کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے چنگل سے آزاد کرائیں اور انہیں محنت کشوں کے ہاتھوں میں انقلابی ہتھیار بنا کر موجودہ آمرانہ حکومت کے خلاف جدوجہد کریں۔

پاکستان میں محنت کشوں نے اپنی بے انداز مسلسل قربانیوں سے کچھ ٹریڈ یونین حقوق

حاصل کئے ہیں' مزارعت کے تحفظ کے لئے بھی قوانین بنوائے ہیں۔ جاگیرداری نظام کو کمزور کرنے کے لئے زرعی اصلاحات کروائی ہیں' سرمایہ داروں کی اجارہ داری توڑنے کے لئے بھی صنعتوں اور بنکوں کو قومی ملکیت میں لئے جانے کے قوانین بنوائے ہیں۔ اور ان قوانین سے محنت کشوں اور غریب کسانوں کو کچھ فائدے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ سب سے بڑھ کر ان میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ جدوجہد سے اس زندگی کو بدلا جا سکتا ہے۔ جو پہلے بڑے زمینداروں اور بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں مقید تھی اور جس کے متعلق یہ پرا پگینڈہ کیا جاتا تھا کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ بڑے لوگوں کو امارت اللہ کی طرف سے بخشی گئی ہے اور انہیں زمینیں اور کارخانے اور بنک اللہ کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں۔ اور بھوک اور غربت اور محرومی اور پس ماندگی بھی اللہ میاں نے ہی غریبوں کو دی ہے اور یہ قدرت کا قانون ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ امیر امیر رہیں گے اور غریب غریب رہیں گے اس لئے مقہور و مجبور انسانوں کے لئے صبر و شکر کرنا ہی بہتر ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہے۔ اور اس کا پھل انہیں اگلے جہاں میں ملے گا۔

لیکن لوگ آج اسی دنیا میں جینے کا حق مانگتے ہیں' اپنی کھوئی ہوئی انسانیت مانگتے ہیں۔ اور وہ یہ حق مانگتے ہیں کہ جو چیزیں اور آسائشیں ان کی عظیم محنت سے وجود میں آتی ہیں ان کی زندگی کو بھی منور کریں۔ ان کے چہروں پر بھی آسودگی کی چمک دمک ہو' ان کی آنکھوں میں بھی خوشیوں اور اطمینان کا نور ہو' انہیں بھی انسان سمجھا جائے۔ انہیں بھی عزت بخشی جائے۔ انہیں بھی آسودگی اور آرام میسر ہو۔

اور آج دنیا میں بے شمار ایسے ممالک ہیں جن پر محنت کشوں نے حکومتیں قائم کی ہیں اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کو قدرت کی نعمتوں سے نوازا ہے اور روز بروز ان کی زندگی بہتر سے بہتر ہوتی چلی جا رہی ہے اور وہ جدید دریافتوں اور الیکٹرانک سامان' اچھے گھروں اور تعلیم سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

سوشلسٹ جمہوریت یا مزدوروں کی جمہوریت!

اکتوبر 1917ء میں روس کے محنت کشوں اور ان کی انقلابی پارٹی نے عظیم لینن کی رہنمائی میں ایک نیا انقلاب برپا کر دیا۔ جس کی بشارت کارل مارکس اور اینگلز نے 1848ء میں اشتراکی منشور کے ذریعے دی تھی۔ اس انقلاب نے نہ صرف روس میں زار شاہی کا

خاتمہ کر دیا بلکہ نئی مزدور (سوشلسٹ) جمہوریت کی بنیاد ڈال دی۔ جو دراصل جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف عوام کی عظیم اکثریت' مزدوروں اور دوسرے محنت کشوں کی ڈکٹیٹرشپ' یعنی عظیم اکثریت کی چھوٹی سی اقلیت پر ڈکٹیٹرشپ تھی۔ اس انقلابی جمہوریت میں حکومت کی مشینری (فوج' پولیس وغیرہ) اندرونی مزدور دشمنوں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور ان کے ایجنٹوں اور بیرونی سامراج اور مداخلت پسندوں اور سامراجی جنگ بازوں کے خلاف استعمال ہونے لگی۔ دنیا میں پہلی بار ریاستی مشینری کسی ملک کے اندر اور بین الاقوامی میدان میں محنت کشوں' مظلوموں اور محکوموں کے حق میں کردار ادا کرنے لگی۔

اس دنیا میں طبقاتی سماج وجود میں آنے کے بعد سوویت یونین میں پہلی بار ایک ایسی جمہوریت قائم کی گئی ہے جس میں وسائل پیداوار افراد کی ملکیت میں نہیں ہیں بلکہ وہ تقریباً قومی ملکیت میں ہیں۔ جن کا انتظام محنت کش خود اپنی تنظیموں اور ریاست کے ذریعے مرکزی منصوبہ بندی کے ذریعے کرتے ہیں۔ سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک کے معاشی نظام نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ انسان کی مادی اور روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اور تیزی سے پیداوار بڑھانے کے لئے یہ نظام بہترین ہے۔ اسی نظام کی بدولت آج انسان اس جمہوریت کو عملی جامہ پہنا رہا ہے جس کا صدیوں سے وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ 1984ء میں سوویت یونین کی سپریم سوویت میں' جس کے کل ممبروں کی تعداد 1500 تھی جس میں 527 مزدور تھے' 242 کسان' 68 کارخانوں کے منیجر اور ماہرین' 98 سول افسر' 250 پارٹی کارکن' 19 ٹریڈ یونین اور نوجوان کمیونسٹ لیگ کے عہدیدار' 141 سائنس دان' ثقافتی کارکن' ڈاکٹر اور اساتذہ اور 55 فوجی تھے۔ (1)

اس کے علاوہ سوویت یونین میں بسنے والی مختلف قومیتوں کو برابری اور انصاف مہیا کرنے کے لئے قوموں کی سوویت الگ ہے جس میں تمام قوموں کو برابر کی نمائندگی دی گئی ہے۔

سوویت یونین کے عوام کی پارٹی---- کمیونسٹ پارٹی---- کی 27 ویں کانگرس منعقدہ 1986ء کے پروگرام کا رہنما اصول یہ ہے کہ "سب کچھ انسان کے لئے ہے!"

سوویت یونین میں سوشلسٹ جمہوریت نے انسان کو وہ حقوق عطا کئے ہیں جو اس سے پہلے کسی طرز حکومت میں نہیں دیئے جا سکے اور نہ ہی معروضی حالات کبھی ایسے تھے جن میں جمہوریت کے اعلیٰ اصولوں کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا۔

عرصہ ہوا سوویت یونین میں بے روزگاری کا مکمل طور پر خاتمہ کیا جا چکا ہے' سوویت ریاست کا فرض ہے کہ وہ ہر شہری کو کام مہیا کرے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری سماج میں کام نہ کرنا باعث افتخار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سوشلسٹ جمہوریت میں کام اور صرف کام عزت و توقیر کا منبع ہے۔ سوشلسٹ جمہوریت کی یہی سب سے بڑی دین ہے۔ عرصہ ہوا سوویت یونین میں بے روزگاری ختم کی جا چکی ہے۔ سوویت یونین میں آخری بے روزگار مائخیل شکونو تھا جس نے 1930ء میں دفتر روزگار میں اپنا نام لکھوایا تھا۔ (2) لیکن اس کے برعکس ترقی یافتہ مغربی سرمایہ دار ملکوں میں اس وقت تقریباً ساڑھے تین کروڑ لوگ بے روزگار ہیں۔ 1982ء میں صرف امریکہ میں ایک کروڑ بیس لاکھ کے قریب محنت کش اور دوسرے ماہرین بے روزگار تھے۔ برطانیہ میں آج بھی تیئس لاکھ کے قریب لوگ بے روزگار ہیں۔

سوویت یونین میں ستر سال کے قلیل عرصہ میں سوشلسٹ جمہوریت کی بدولت ہر شہری مرد اور عورت کو مفت تعلیم' مفت علاج مہیا کیا گیا ہے بلکہ اگر کوئی غیر ملکی بھی سوویت یونین میں بیمار پڑ جائے تو اس کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ جبکہ وہ پاکستانی جو امریکہ یا برطانیہ میں "بائی پاس" سرجری کرانے جاتے ہیں تین چار لاکھ کے لگ بھگ خرچہ اٹھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پاکستان کے اندر بھی جہاں شب و روز اسلام کی دہائی دی جاتی ہے' علاج اس قدر مہنگا ہے کہ عام آدمی کروا ہی نہیں سکتا۔ اور ہزاروں آدمی برآمدوں میں کسمپرسی کے عالم میں پڑے رہتے ہیں۔ اور پرائیویٹ ہسپتال تو قصابوں کی دکانیں بن کر رہ گئے ہیں۔ سوویت یونین کی سوشلسٹ جمہوریت نے عوام کے لئے سفر کرنا اس قدر سستا کر دیا ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ ماسکو جیسے 80 لاکھ کی آبادی کے شہر میں صرف 75 پیسے پاکستانی ہیں سارے شہر کی دنیا کی بہترین اور خوبصورت میٹرو (زیر زمین ٹرین) میں سیر کی جا سکتی ہے۔ اور ایک ایک اسٹیشن قابل دید ہے جیسے عجائب گھر ہو۔ سوویت یونین میں اس وقت ہر شخص کو گھر مہیا کر دیا گیا ہے۔ خوراک سستی اور اچھی مہیا کی جا رہی ہے اور ہر سال عوام کا معیار زندگی خوب سے خوب تر ہو رہا ہے۔

پڑھنے لکھنے اور چھاپنے کے لئے سوویت عوام کے ادارے' ٹریڈ یونین' عورتوں کی انجمن' نوجوانوں کی انجمن اور مشترکہ کھیتی باڑی کے ادارے اور ریاستی اشاعت گھر ہر قسم کی سہولتیں مہیا کر رہے ہیں۔ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ تعداد میں کتابیں اور رسائل سوویت یونین میں چھاپے جا رہے ہیں۔ اور ان کی قیمتیں اس قدر کم ہیں کہ پس ماندہ ممالک

کے خریداروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ سوویت یونین کے سب سے بڑے اخبار "پراودا" کی آج بھی وہی قیمت ہے جو 1913ء میں تھی اس اخبار میں ملک کی تعمیر و ترقی کی خبریں ہوتی ہیں محنت کشوں کے مسائل اور ان کے حل کے متعلق مضامین ہوتے ہیں۔ نئی زندگی کی تعمیر کے متعلق خاکے ہوتے ہیں۔ سماجی خرابیوں اور برائیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ دنیا میں امن قائم کرنے کے متعلق خبریں اور مقالات ہوتے ہیں ان اخبارات میں سرمایہ داروں کے کارخانوں کی بنی ہوئی مصنوعات کے بیچنے کے متعلق کوئی اشتہار نہیں ہوتے۔ مار دھاڑ' ڈاکے زنی' رہزنی اور قتل و غارت کے متعلق خبریں نہیں ہوتیں۔ اخبار کی بکری سے منافع کمانے کے لئے پاکستان کے نام نہاد اسلامی اخبارات "نوائے وقت" اور "جنگ" کی طرح روزانہ عورت کے خوبصورت چہرے کو نہیں بیچا جاتا۔ اول تو بھیانک جرائم بہت کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں ان کی تشہیر اس طرح نہیں ہوتی کہ دوسرے لوگ بھی ان کے نقش قدم پر چلنے لگیں۔ نہایت ہی ترقی یافتہ مغربی سرمایہ دار ملکوں میں' جن کی جمہوریت کے متعلق شب و روز' ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے' اس قدر جرائم کرتے ہیں کہ الامان' مغربی جرمنی کی پولیس کے اندازوں کے مطابق وہاں ہر روز سات قتل' 77 ڈاکہ زنی کی واردات' 174 شدید ضربات لگانے کے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں اور روزانہ 958 کے قریب جعل سازی کے مقدمات درج کرائے جاتے ہیں۔ ہر آٹھ سیکنڈ میں ایک جرم سرزد ہوتا ہے۔ سرمایہ دار دنیا کے بہشت بریں امریکہ میں حالات اس سے بھی ابتر ہیں' بے روزگاری' مہنگائی اور جرائم کی بھرمار ہے ایک طرف ارب پتی سرمایہ دار ہیں اور دوسری طرف بے روزگاروں کی قطاریں ہیں۔ کالے گورے کی تمیز مغربی جمہوریت کا ضروری جزو بن چکی ہے۔ برطانیہ میں آئے دن گوروں کی کالوں کے خلاف نفرت کا اظہار تشدد کے واقعات سے ہوتا رہتا ہے۔

پاکستانی عوام کا المیہ یہ ہے کہ اس کی نئی جمہوریت کے متعلق انہیں معلومات صرف اور صرف مغربی سرمایہ دار دنیا کے رسائل' کتابوں' اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے ہی مہیا کی جاتی ہیں اور سوشلسٹ ممالک سے کتابوں اور رسائل اور اخباروں کی درآمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور اگر درآمد ہو بھی جائیں تو کسٹم کے حکام انہیں ہزار حیلے بہانوں سے روکے رکھتے ہیں۔

مغربی ذرائع ابلاغ سوشلسٹ ممالک میں رائج نظام کے متعلق شب و روز نہایت ہی

بھیانک اور بے بنیاد اور جھوٹا پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور ترقی پذیر ممالک کے عوام کے ذہنوں میں اس نظام کے خلاف نفرت اور زہر اور شکوک و شبہات پھیلاتے رہتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک عرصہ تک یہ پراپیگنڈہ کیا جاتا رہا کہ وہاں لوگوں کے پاس رہنے کو گھر نہیں، کھانے کو روٹی نہیں، پہننے کو کپڑا نہیں اور سوویت عوام نہایت ہی تنگدستی کے عالم میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ کے فوراً بعد سوویت یونین میں حالات بہت ابتر تھے۔ لیکن مغربی ذرائع ابلاغ یہ نہیں بتاتے کہ حالات ایسے کیوں تھے؟

وہ یہ نہیں بتاتے کہ دوسری جنگ عظیم میں سوویت یونین کے باشندوں نے اپنے وطن کی آزادی کو برقرار رکھنے اور سوشلزم کے دفاع کے لئے کتنی عظیم قربانیاں کیں۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ اس جنگ میں سوویت یونین میں دو کروڑ شہری ہلاک ہو گئے۔ ستر ہزار فیکٹریاں اور کارخانے تباہ ہو گئے۔ مشترکہ کھیتی باڑی کے سینکڑوں ادارے منہدم ہو گئے اور ہزاروں سکول، کالج اور کنڈر گارٹن برباد ہو گئے۔ جبکہ اسی زمانہ میں سارے امریکہ پر ایک بھی بم نہیں گرا، ایک بھی عمارت تباہ نہیں ہوئی۔ بلکہ مغربی یورپ اور سوویت یونین کو سپلائی کرنے کے لئے امریکی کارخانے رات دن کام کرتے اور اربوں روپیہ کماتے رہے اور دوسروں کو مقروض کرتے رہے خود ترقی کرتے رہے اور نئی نئی ایجادات کرنے میں مصروف رہے۔

آج کل مغربی ذرائع ابلاغ یہ پراپیگنڈہ بھی نہایت زور دار طریقے سے کر رہے ہیں کہ سوویت یونین سوشلسٹ جمہوری نظام کی وجہ سے تکنیکی اعتبار سے سرمایہ دار ملکوں سے ہر میدان میں بہت پیچھے ہے۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کی بے انداز تباہی کے باوجود سوویت یونین تکنیکی اعتبار سے بھی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کو ہر شعبے میں مات دے رہا ہے۔ سوویت یونین نے سب سے پہلے مدار میں انسان کو بھیجا۔ سوویت یونین آج فولاد، تیل، کوئلہ اور کئی دوسرے شعبوں میں سرمایہ دار ملکوں سے سبقت لے جا چکا ہے اور جن شعبوں میں وہ پیچھے ہے ان میں بھی زور دار مقابلہ جاری ہے۔ اور جلد یا بدیر ان شعبوں میں بھی وہ سبقت لے جائے گا۔ یہ ترقی 70 سال کے قلیل عرصہ میں سوشلسٹ جمہوریت کی وجہ سے ہی ہوئی ہے۔ حالانکہ اسی زمانہ میں دو بار سوویت یونین کی معیشت کو

تباہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے 1917ء کے فوراً" مغربی سرمایہ دار ملکوں کی فوجی یلغار سے اور دوسری بار نازیوں کی مسلط کردہ جنگ سے۔

جدید سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار اور محافظ جب چاروں طرف سے گھر جاتے ہیں اور ان کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں رہتی تو وہ اس دلیل کا سہارا لیتے ہیں کہ سوویت سوشلسٹ جمہوریت گو لوگوں کو روٹی، کپڑا، مکان اور روزگار تو مہیا کر رہی ہے لیکن وہ ان کی روحانیت کو مسخ کر رہی ہے اور انہیں مادہ پرستی کے جال میں جکڑ رہی ہے مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خود روح اور سوچ وغیرہ انسانی جسم کی ارفع نشوونما کا ہی ظہور ہے اور روح جسم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ سوشلسٹ جمہوریت مذہبی اقدار کی نفی نہیں کرتی بلکہ وہ آج کے حالات میں مذہب کی اعلیٰ اقدار کو عمل میں لاتی ہے۔ مثلاً سارے مسلمان اس بات پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے کندھے پر آٹے کی بوری اٹھائی اور ایک فاقہ کش غریب کے گھر میں خود پہنچائی۔ حضرت عمرؓ خلیفہ وقت تھے۔ وہ ریاست کے سربراہ تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ریاست کا فرض ہے کہ ہر شخص کو روٹی اور روزگار مہیا کرے۔ اگر آج ضیاء الحق یہی کام کرنے لگے تو صرف کراچی کے فاقہ مستوں کو روٹی پہنچاتے پہنچاتے اس کی کمر ٹوٹ جائے۔ لہٰذا کوئی ایسا ریاستی نظام کرنا ضروری ہے جو موجودہ حالات میں لوگوں کو روٹی روزگار مہیا کر سکے۔ سوشلسٹ ریاست یہی کچھ کر رہی ہے، جسم کی صحیح نشوونما روح کی بالیدگی کے لئے بھی ضروری ہے۔ اگر جسم کو خوراک ہی نہ ملے تو روح اس میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ بھوک سے ستائے ہوئے لوگ اپنی ساری روحانی اقدار کھو بیٹھتے ہیں۔ اور ان کے اخلاق ذلت کے گڑھوں میں غلطاں نظر آتے ہیں۔ 1943ء میں بنگال میں جب قحط پڑا تو تقریباً تیس ہزار عورتیں چند سکوں کے عوض بک گئیں۔ اور بازار حسن کی زینت بن گئیں ہزاروں بچے ٹکوں کے عوض دوسروں کی ملکیت بن گئے کیونکہ ان کے ماں باپ کے پاس انہیں زندہ رکھنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ اس لئے سرمایہ داری کے نقیبوں کی اس دلیل میں بھی کوئی وزن نہیں ہے۔

قومی جمہوریت کے قیام کا خواب!

اب تک کی بحث میں ہم نے یہ واضح کیا ہے کہ سماج کے ہزاروں سالوں کے نظریاتی ارتقاء کے دوران انسان نے "عوام کی حکومت، عوام پر اور عوام کے لئے" کے نظریہ

جمہوریت کی کس طرح آبیاری کی اور یہ نظریہ سرمایہ دارانہ عہد میں کیسے پروان چڑھا اور کیا کیا کامیابیاں حاصل کیں مگر آدرش اور حقیقت ایک کیوں نہ ہو سکے اور اس نظریے کی تکمیل میں کیا کیا رکاوٹیں پیدا ہوئیں جنہیں دور کرنا ضروری ہے۔

ہم نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب سے طبقاتی سماج وجود میں آیا ہے "جمہوریت" اپنے سارے خوبصورت نعروں کے باوجود طبقاتی جمہوریت ہی ہوتی ہے۔ یعنی جو طبقے وسائل پیداوار پر قابض ہوتے ہیں' ان کے لئے جمہوریت اور جو وسائل پیداوار سے محروم ہوتے ہیں ان کے لئے آمریت ہوتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود سرمایہ دارانہ نظام میں عوام نے اپنی جدوجہد اور قربانیوں سے سرمایہ دارانہ جمہوریت کے خول کے اندر بے شمار سہولتیں اور رعائتیں حاصل کی ہیں اور جمہوریت کی معروضی حدود میں نئے رنگ بھرے ہیں اور نئے نئے بنیادی حقوق وضع کئے ہیں۔

ہم پاکستان میں پچھلے چالیس سال سے ایسے ہی سوالوں سے دوچار ہیں اور ان سالوں میں کوئی بھی سال ایسا نہیں آیا جب وسائل پیداوار پر قابض حکمران طبقوں کی طرف سے یہ نعرہ نہ لگایا گیا ہو کہ مرکز کو مضبوط کرو' ارباب اقتدار کے ہاتھ مضبوط کرو۔ قومی' مذہبی اور قبائلی اور ذات برادری کے تعصبات دور کرو اور ایک خدا' ایک رسول' ایک قرآن کے نام لیوا ہونے کی حیثیت سے ایک جان ہو جاؤ۔ سب سٹیجوں سے یہی آواز اٹھائی جاتی ہے۔ سب منبروں سے بھی یہی وعظ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسلام نے اعلیٰ ترین جمہوریت کی شکل پیش کی ہے۔ ہمارا ضابطہ حیات مکمل ہے۔ ہمارا آئین چودہ سو سال پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ہمارا دین مکمل ہے۔ ہمیں کسی ازم کی ضرورت نہیں ہم دوسروں کے دست نگر کیوں بنیں۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ بس اپنے نظریات کو صدق دل سے عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ پھر دیکھئے کس والہانہ انداز سے ساری دنیا سچائی اور نیکی اور طہارت کے اس مرکز کے گرد جمع ہوتی ہے اور ہم دنیا و آخرت میں برگزیدہ امت کے طور پر سرخرو ہوتے ہیں۔

ہمارے اخبارات' ہمارے رسائل' ہمارے دیگر ذرائع ابلاغ ان ہی نعروں' انہی خیالات' انہی نظریات سے مزین ہیں لیکن یہ کتنی تلخ حقیقت ہے کہ پچھلے چالیس سالوں میں ہم اپنے نظریات' اپنے آدرشوں کو پاکستانی سماج میں گوشت پوست کی شکل نہیں دے سکے۔ مکمل

ضابطہ حیات ہوتے ہوئے بھی کوئی قابل قبول آئین نہیں بنا سکے اور جو 1973ء میں قوم کے منتخب نمائندوں نے متفقہ آئین بنایا' اسے فرد واحد نے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور خاص طور پر پچھلے دس سالوں میں جب سے مکمل ضابطہ حیات پر بہت زور دیا گیا ہے اور جب کہ اس ضابطہ حیات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بظاہر ایک ہی شخص کو بلا شرکت غیرے مکمل اختیار حاصل رہا ہے اور جب کہ اس شخص کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے بڑے بڑے جید علماء اور ماہرین معاشیات اور تاریخ دان اور فلاسفر اور وکلاء اور جج صاحبان بھی موجود رہے ہیں تو پھر ابھی تک ہم اس میدان میں ٹامک ٹوئیاں کیوں مار رہے ہیں۔ مکمل ضابطہ حیات کا نعرہ لگا لگا کر حلق خشک ہو گئے ہیں۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بیک وقت تین ضابطے فوجی' اسلامی اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے قوانین کے نفاذ کے ساتھ سمجھوتہ کئے بیٹھے ہیں اور ساری قوم اپنے ہی پھیلائے ہوئے اندھیروں اور بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ ایسے تجربے کرنے والوں نے دس سال کے بعد جب دیکھا کہ پاکستان کو ہر قسم کے بحران' سیاسی سماجی اور معاشی' قومی اور بین الاقوامی بحران نے گھیرے میں لے لیا ہے تو اب مختلف نعروں اور پالیسیوں سے ترغیب دی جا رہی ہے کہ جو حکمران مارشل لاء کے بانس پر چڑھے بیٹھے ہیں' ان کی مدد کرنے کے لئے آگے بڑھئے۔ کیونکہ مارشل لاء کے بانس پر چڑھنا تو آسان ہے لیکن اترنا مشکل ہے۔ اس لئے ان نیک اور پاکیزہ حکمرانوں کو جنہوں نے بظاہر نہایت انکساری اور خوف خدا سے پاکستان کو مکمل ضابطہ حیات دلانے کی راہ اختیار کی تھی اور ملک و قوم کی بہتری کے لئے دہائی دے رہے تھے' وہ اب یہ چاہتے ہیں کہ ساری قوم آنکھیں بند کر کے ان کی ہمنوا بن جائے تاکہ وہ اپنے ذاتی اقتدار اور قوت میں اضافہ کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاکستانی عوام کے سروں پر مسلط رہیں۔

مگر سماجی ارتقاء کی روشنی میں پاکستانی عوام کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس قسم کی جمہوریت لانا چاہتے ہیں' وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت لانا چاہتے ہیں یا عوامی جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ قبائلی جمہوریت کے لئے کوشاں ہیں یا سوشلسٹ جمہوریت کے طلب گار ہیں۔

ان سوالوں کے صحیح جواب سے ہی ہم اس راستے پر چل سکیں گے جو پاکستان میں پاکستانی عوام کے آدرشوں کے مطابق جمہوریت لانے کا راستہ ہے۔

اگر ہم یہ نہ کر سکے تو یقیناً ہم کئی عشروں تک انہی بھول بھلیوں میں پھنسے رہیں گے۔ انہیں مشکلات اور انہیں محرومیوں سے دوچار رہیں گے اور شاید ہم وطن عزیز کو موجودہ

شکل میں قائم بھی نہ رکھ سکیں۔ ہم 1971ء میں ایک سانحہ سے دوچار ہو چکے ہیں۔ لیکن 1971ء کے پردرد واقعات سے سبق لینے کی بجائے ہم ان امور کے متعلق یا تو مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں یا اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر تحکمانہ اور رعونت بھرے انداز اختیار کئے ہوئے ہیں۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کس طرح یورپ و امریکہ میں نئی پیداواری قوتوں کی کوکھ سے جمہوری انقلاب نے جنم لیا اور کس طرح ان قوتوں نے جاگیرداری نظام اور بادشاہت کے خلاف یلغار کی۔ تخت و تاج الٹ دیئے اور نیا سماج جسے جمہوری سماج کے نام سے نوازا گیا' قائم کیا۔ لیکن ایشیا اور افریقہ کے پسماندہ اور محکوم ممالک میں جمہوریت کے قیام کی جدوجہد کا نشانہ محض جاگیرداری نظام ہی نہ ہو سکتا تھا کیونکہ ان ممالک کے قدرتی سماجی ارتقاء کو سامراج کے غلبہ نے مسخ کر دیا تھا۔ برصغیر ہند و پاکستان میں اور بنگلہ دیش اور بھارت میں بھی عین اس وقت جب جاگیرداری عہد کی کوکھ میں سرمایہ داری نظام کی پیدائش کے لئے حالات وجود میں آ رہے تھے' برطانوی فوج نے تفنگ و تلوار' عیاری اور سازش اور اپنی ترقی یافتہ پیداواری قوتوں اور ان پر مبنی سماجی اور سیاسی نظام کے بل بوتے پر قبضہ کر لیا اور ان ملکوں کے عوام کی بے پناہ کھلی لوٹ سے ایک طرف اپنے نئے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کی نشوونما کی اور نہایت ہی ارفع قسم کے جمہوری ادارے قائم کئے اور دوسری طرف ان ملکوں کی سماج کی کوکھ میں نشوونما پانے والی نئی پیداواری قوتوں کو اپنی استحصالی پالیسیوں کے ذریعے تباہ و برباد کر دیا اور عوام پر جاگیرداری استبداد کے ساتھ ساتھ سامراجی استبداد مسلط کیا۔ سامراج نے اپنے نئے نظام کی آبیاری کے لئے ان خطوں کی نشوونما' کچا مال۔ پٹ سن۔ کپاس چائے وغیرہ پیدا کرنے اور برطانوی صنعتی مصنوعات کے لئے منڈی کے طور پر کی۔ اس نئے نظام کو قائم رکھنے کے لئے برصغیر میں برطانوی دور کے پیدا کردہ جاگیردار اور افسر شاہی سامراج کے سب سے بڑے حلیف بن گئے اور انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں اور طاقت کو زمینداری نظام کو قائم رکھنے اور سامراجی برطانوی راج کے دوام کے لئے صرف کر دیا۔

چنانچہ برصغیر میں جمہوریت کی جدوجہد قومی بن گئی۔ قومی اس لئے کہ برطانوی سامراج سے آزادی اس کا اولین نشانہ تھا اور جمہوری اس لئے کہ فرسودہ جاگیرداری نظام جو سامراج کا حلیف بھی تھا اور اس کے راستے میں رکاوٹ تھی' کو ختم کرنا بھی اس کا نصب العین تھا۔

برطانوی سامراج نے اپنے جمہوری نظام کی آبیاری اور سامراجی مفادات کے لئے برصغیر میں ریلوں اور نہروں کا جال بچھایا' کانوں اور تیل کے کنوؤں کو حسب ضرورت ترقی دی۔ چھوٹی چھوٹی جننگ فیکٹریاں۔ کپڑے کے کارخانے' لوہے کا معمولی سامان بنانے کے کارخانے' گودیوں اور ہوائی اڈوں وغیرہ کو ترقی دی۔ گو یہ سب کچھ متحدہ ہندوستان میں برطانوی مفادات کو حاصل کرنے کے لئے کیا گیا تھا لیکن ان اقدامات کے کچھ مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے۔ محکوم سرمایہ داری نظام کی نشوونما کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار' مزدور اور درمیانہ طبقہ نے بھی جنم لیا اور پرورش پائی۔

1857ء اور اس کے بعد برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی تحریک نے جنم لیا۔ جس نے بعد میں کانگرس' مسلم لیگ' کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں' مزدور انجمنوں' کسان سبھاؤں' طلبہ کی تحریکوں نوجوان بھارت سبھا سماجی تنظیموں' مذہبی جماعتوں' آزاد ہند فوج اور کئی دوسری انجمنوں کی شکل اختیار کی۔ برصغیر کے مخصوص حالات کی وجہ سے سوویت یونین میں 1917ء کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد بھی برطانوی سامراج کے خلاف تحریک کی رہنمائی سرمایہ داروں' تاجروں اور روشن خیال زمینداروں کے ہاتھ میں رہی۔ ایک طویل اور کٹھن جدوجہد اور ان گنت قربانیوں کے بعد آخر 1947ء میں برطانوی سامراج برصغیر ہند و پاکستان کو آزادی دینے پر مجبور ہو گیا۔

چونکہ تحریک آزادی کی رہنمائی سرمایہ داروں' تاجروں اور روشن خیال زمینداروں کے ہاتھ میں تھی جو کانگرس اور مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں پر چھائے ہوئے تھے اور درمیانہ طبقہ اور عوام کی رہنمائی حاصل کئے ہوئے تھے اور محنت کشوں کی انقلابی پارٹیاں کمزور تھیں اور 1917ء کے سوویٹ انقلاب کے بعد ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جس سے سرمایہ داری نظام کے علمبرداروں کو اپنے مفادات کے خاتمہ کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ وہ تحریک آزادی کو اس قدر آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے جس کے نتیجے میں تحریک کی رہنمائی ان کے ہاتھوں سے نکل کر انقلابیوں کے ہاتھ میں چلی جائے لہٰذا جونہی ہندوستانی فوج میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے اور بحری اور بری فوج نے بغاوت کا راستہ اختیار کرنا شروع کر دیا اور ہندوستان بھر کے محنت کشوں میں ایک لڑاکو تحریک ملک کے کونے کونے میں جنم لینے لگی تو برطانوی سامراج نے کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے ساتھ سمجھوتے کی کوششیں شروع کر دیں اور آخر اس سمجھوتے کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کو آزادی ملی۔ لیکن

قومی جمہوریت کے قیام کا خواب تشنہ تکمیل ہی رہا۔

نامکمل جمہوریت

برطانوی سامراج سے سیاسی آزادی تو مل گئی لیکن دولت مشترکہ کی تنظیم اور شاہی ترجیحات جیسے مختلف معاشی بندھنوں کے ذریعے اسے محدود کر دیا گیا۔ برطانوی سامراج کی معاشی لوٹ بدستور قائم رہی۔ برطانوی سامراج جب رخصت ہوا تو پاکستان کا سیاسی' معاشی اور سماجی نقشہ عجیب و غریب صورت حال پیش کر رہا تھا۔ ہندو مسلم اور سکھوں کے درمیان خونخوار مذہبی منافرت اور لاکھوں انسانوں کی نقل مکانی کے پس منظر میں ایک طرف نہایت ہی پس ماندہ قبائلی اور جاگیرداری نظام تھا اور دوسری طرف ترقی یافتہ نوکر شاہی' جدید فوج اور متحدہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کی ضروریات اور متحدہ جمہوری تحریک کی عکاسی کرتے ہوئے حکومتی ادارے تھے۔ مگر متحدہ ہندوستان میں برطانوی عہد کے دوران کانگرس اور دوسری جماعتوں کی جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں جو جمہوری ادارے وجود میں آئے تھے تقسیم کے بعد پاکستان میں قبائلی اور جاگیرداری نظام ان کو کوئی بنیاد فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستان کے وہ علاقے جن میں سرمایہ داری نظام نے نشوونما پائی تھی وہ پاکستان میں شامل نہ تھے۔ اس لئے پاکستان میں سرمایہ دار طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ متحدہ ہندوستان میں 14569 ایسے کارخانے اور فیکٹریاں تھیں جن میں بیس مزدوروں سے زائد کارکن کام کرتے تھے اور مزدوروں کی کل تعداد 3142000 تھی۔ پاکستان کے حصہ میں صرف 1406 فیکٹریاں آئیں جن میں 206000 مزدور کام کرتے تھے۔ ان میں سے بھی زیادہ تر حکومت کی ملکیت میں تھے یا ہجرت کرنے والے ہندوؤں کے۔ پاکستان کے اندر تو تجارتی سرمایہ دار طبقہ بھی بہت کمزور تھا اور حکومتی سطح پر جاگیردار حکمرانوں اور نوکر شاہی کے رحم و کرم پر تھا۔ ملک میں ابتدائی طور پر سرمایہ کے ارتکاز کے لئے وسائل بالکل محدود تھے اور پرانا قبائلی اور جاگیرداری نظام اس کے راستے میں حائل تھا 51-1950ء میں کوریا کی جنگ نے' جسے امریکی سامراج نے چھیڑا تھا' پہلی بار پاکستان میں تجارتی سرمایہ داری کی نشوونما اور ترقی کے لئے مواقع فراہم کئے۔ چونکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی سامراج کا دیوالہ نکل چکا تھا اس لئے امریکی سامراج نے صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانوی سامراج کی ملی بھگت سے' پاکستان کی معاشی زندگی کو امداد اور قرضوں کے ذریعے اپنے معاشی' سیاسی اور فوجی چنگل میں

جکڑ لیا۔

امریکی سامراج کی ماتحتی میں سرمایہ دارانہ ترقی کا راستہ

نئے حالات میں نئی سطح پر پھر سے وہی عمل دوہرایا گیا یعنی پاکستان کے معاشی نشوونما کے ارتقاء کو مسخ کر دیا گیا۔ پاکستان کے جاگیردار حکمرانوں نوکر شاہی اور فوجی جنتا اور ابھرتے ہوئے تجارتی سرمایہ دار طبقہ نے ملک کے اندر پیداوار کے جاگیرداری رشتوں کو قائم رکھتے ہوئے امریکی سامراج کی "امداد" اور مشروط قرضوں سے گماشتہ سرمایہ دارانہ ترقی کا راستہ اختیار کیا۔ امریکی سامراج نے نہایت ہی کروفر سے برطانوی سامراج کی جگہ لے لی۔ برطانوی سامراج کو مجبوراً" بوریا بستر اٹھا کر پاکستان کی سٹیج سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ برطانوی سامراج کی بوڑھی گرفت سے جلدی چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مستقبل کے حاکموں' نوکر شاہی ٹولہ نے وزیراعظم لیاقت علی خاں کے قتل کا خونیں ڈرامہ رچایا اور امریکی سامراج کی آمد کے لئے تمام دروازے کھول دیئے۔

حال ہی میں شائع ہونے والی ہندوستانی محقق کی کتاب "پاکستان میں امریکی کردار" میں ان حقائق پر سرکاری دستاویزات کی مدد سے کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ امریکی سامراج کی آمد کا اعلان "امریکہ تیرا شکریہ" کی تختیاں ان اونٹوں کے گلے میں پہنا کر کیا گیا جو پاکستان جیسے زرعی ملک میں (جس نے کوریا کی جنگ میں 50 ہزار ٹن گندم امریکی فوجوں کی امداد کے طور پر بھیجی تھی) مصنوعی قحط کو روکنے کے لئے کراچی کی بندرگاہ سے امریکی گندم گاڑیوں میں لاد رہے تھے۔ اس کے بعد امریکی قرضوں سے قائم شدہ دیہی امداد کے محکموں کے ملازمین کے سینوں پر یہی بیج سجائے گئے۔ اس طرح ایک طرف پاکستان کی معاشی اور سیاسی اور ثقافتی غلامی کا نیا نوآبادیاتی دور شروع ہو گیا اور دوسری طرف جاگیردار طبقے اور ابھرتے ہوئے تجارتی سرمایہ داروں (جو صنعتی سرمایہ داری میں قدم رکھنا چاہتے تھے) کی باہمی کش مکش اور امریکی سامراج کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں 1951ء سے 1958ء تک کے مختصر عرصے میں چھ مرکزی وزارتیں یکے بعد دیگرے قائم ہوئیں اور آخر اکتوبر 1958ء میں ایوب خاں نے مارشل لاء نافذ کر دیا اور 1956ء کے آئین کو جس کے تحت انتخابات ہونے والے تھے کالعدم کر دیا۔

مشروط قرضوں اور امداد نے پاکستان کو غلامی کی نئی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ جس کے نتیجے میں پشاور میں سوویٹ یونین کے خلاف جاسوسی کرنے کے لئے بڈا بیئر کا اڈہ تعمیر ہوا۔ پاکستان

بغداد پیکٹ، سیٹو اور سنٹو کا ممبر بنا۔ غرضیکہ امریکی سامراج کی عالمی حکمت عملی کا ایک مہرہ بن گیا اور پاکستانی حکومت کے تمام اہم شعبے امریکی مشیروں کی زیر نگرانی دے دیئے گئے۔ اس طرح پاکستان کی آزادی کو ڈالر کے عوض گروی رکھ دیا گیا۔

اس دور کی بنیادی پالیسی، سامراجی امداد اور مشروط قرضوں کی مدد سے پاکستان میں بین الاقوامی سامراجی نظام کی محتاج سرمایہ دارانہ ترقی کے لئے بھی اندرون ملک اور بیرون ممالک میں منڈی کو وسیع کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نئی معیشت کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کمزور سی زرعی اصلاحات کا قدم اٹھایا گیا۔ یہ اصلاحات بنیادی ملکیتی رشتے تو ختم نہ کر سکیں لیکن ان کے نفاذ اور پراپیگنڈے نے سرمایہ دارانہ طریق کاشت کی طرف رجحان ضرور پیدا کیا۔ اس کے علاوہ زمین کی لامحدود ملکیت کے نظریے کے تقدس کو بھی ٹھیس پہنچی۔ زراعت میں سرمایہ دارانہ طریق کاشت پر زور دیا گیا۔ ٹریکٹر، ٹیوب ویل، نئے بیج، کیمیائی کھاد اور کیڑے مار دوائیوں کے زیادہ سے زیادہ استعمال کے منصوبے بنائے گئے۔ اس پالیسی سے جو نتائج نکلے اسے "سبز انقلاب" کا نام دیا گیا۔ اس طرح جاگیرداری ملکیتی رشتے قائم رکھتے ہوئے زراعت میں سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی نشوونما ہونی شروع ہو گئی۔

واضع پالیسی کے تحت پاکستان میں بنیادی اور بھاری صنعتوں کے قیام کی مخالفت کی گئی۔ فولاد بنانے اور مشینیں تیار کرنے کے کارخانوں کو منصوبہ بندی میں کوئی جگہ نہ دی گئی اور سارا زور ٹیکسٹائل اور اس قسم کی دوسری صنعتیں قائم کرنے پر صرف کر دیا گیا۔ انشورنس، تجارتی کمپنیاں اور بنک وجود میں آئے۔ چنانچہ پاکستان ٹریکٹروں، ٹیکسٹائل مشینری، مصنوعی کھاد، کیڑے مار دوائیوں، کوکا کولا، سگریٹ، چائے فاضل پرزوں، موٹروں، بسوں اور سامان تعیش کے لئے منڈی کے طور پر نشوونما پانے لگا۔ سامراجی طاقتوں کے مال کی کھپت کے لئے منڈی وسیع ہونے لگی اور پاکستان کے دور افتادہ علاقے بھی عالمی سرمایہ داروں کے منافع کی گرفت میں آ گئے۔

اس پالیسی نے نئے گماشتہ، محتاج اور طفیلی سرمایہ دار طبقہ کو جنم دیا۔ جس کی ریڑھ کی ہڈی اس قدر کمزور تھی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکتا تھا بلکہ اسے ہر وقت سامراجی بیساکھیوں کی ضرورت تھی۔ چونکہ اس گماشتے سرمایہ دار طبقہ نے نئے سامراج اور پرانے جاگیردار طبقے کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے نشوونما نہیں پائی تھی بلکہ سامراج کی امداد اور حفاظت تلے جاگیرداروں کے پہلو بہ پہلو پروان چڑھ رہا تھا اور آمریت کے سایہ تلے ترقی کر

رہا تھا اس لئے قدرتی طور پر وہ ان کا حلیف بن گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس طبقے کے بائیس خاندان ملک کے 80 فیصد اثاثوں پر قابض ہو گئے۔ ان کے مفادات کی آمرانہ حکومت ہی حفاظت کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ ایوب حکومت یعنی اپنے خالق کا سب سے بڑا علمبردار بن گیا۔ بلکہ صدر ایوب کا اپنا خاندان بھی چند سالوں میں اسی طبقہ میں شامل ہو گیا۔ ملک کے اندر قومی جمہوریت کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کی بجائے وہ غیر جمہوری حکومت کا ستون بن گیا اور بیرونی پالیسیوں میں سامراج کے عالمی مفادات کے محافظ کا کردار ادا کرنے لگا۔

سامراجی ذرائع ابلاغ نے پاکستان میں ترقی کے اس راستے کو ترقی پذیر ممالک کے لئے نمونے کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا اور دنیا بھر میں پاکستان کی ترقی کے گیت گائے جانے لگے۔

ایوب حکومت نے گماشتہ اور طفیلی سرمایہ داری کی کامیابیوں اور بے بنیاد طاقت کے بل بوتے پر نئی سیاسی کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے خفیہ طور پر کشمیر میں اپنے چھاپہ مار اس مفروضے کے پیش نظر داخل کر دیئے کہ یہ جنگ کشمیر کے علاقہ تک ہی محدود رہے گی۔ لیکن بھارت نے اپنی فوجیں ہند و پاکستان کی بین الاقوامی سرحدات میں داخل کر دیں۔ اس طرح 1965ء کی پاک بھارت جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ نے ترقی و تعمیر کی گماشتہ پالیسیوں کی کمزوریوں کو ننگا کر دیا اور "سبز انقلاب" کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا۔

اس دور میں محتاج اور طفیلی سرمایہ داری کی نشوونما کے دوران پیداواری قوتوں کی ترقی کی وجہ سے سامراج اور جاگیردار طبقہ' نوکر شاہی اور فوج کا ایک نیا حلیف طبقہ وجود میں آیا۔ یہ گماشتہ اور افسر شاہی سرمایہ دار طبقہ تھا۔ جس کا خمیر ملک کے اندر جاگیرداری اور قبائلی پیداواری رشتوں کے خاتمے اور سامراجی مفادات کے قلع قمع کرنے کی جدوجہد کے دوران نہ اٹھا تھا بلکہ اس نے سامراجی امداد اور مشروط قرضوں اور جاگیردار طبقہ سے مفاہمت کی پالیسی سے نشوونما پائی تھی۔

اس عمل نے دوسری طاقتوں کو بھی جنم دیا تھا۔ یہ طاقتیں---- صنعتی مزدوروں' شہروں اور دیہات میں پیٹی بورژوازی' امیر کسانوں' کھیت مزدوروں' نئے دکانداروں' سفید پوش ملازمین' گھریلو صنعت کاروں' مشینری مرمت کرنے والوں' چھوٹے اور درمیانے مستریوں اور ماہرین' انجینئروں' ڈاکٹروں---- دانشوروں اور طلباء کی خاصی تعداد پر مشتمل تھیں۔ انسان کی سہولتوں کے لئے نئی بین الاقوامی الیکٹرانک ایجادات اور بین الاقوامی ذرائع

ابلاغ اور نشوونما پاتے ہوئے نئے پیداواری تعلقات نے لوگوں کو نیا شعور دیا اور نئی بیداری پیدا کی۔ چنانچہ جاگیرداری نظام کے پہلو بہ پہلو سامراجی امداد اور قرضوں سے طفیلی اور گماشتہ سرمایہ دارانہ نظام نشوونما پاتا رہا۔ پرانے جاگیرداری پیداواری تعلقات اور اس سماج کی کوکھ میں پیدا ہونے والے نئے سرمایہ دارانہ تضادات بڑھتے رہتے۔ پاکستانی عوام تہری لوٹ کے پاؤں تلے پسنے لگے' یعنی سامراجی لوٹ' جاگیرداری لوٹ اور گماشتہ اور افسر شاہی سرمایہ دارانہ لوٹ۔

بڈابیر (پشاور) سے اڑنے والے امریکی جاسوسی جہاز کو سوویٹ یونین کی سرزمین پر 80 ہزار فٹ کی بلندی پر سے مار گرانے کے بعد پاکستانی عوام پر یہ انکشاف ہوا کہ ایوب حکومت کس طرح امریکی سامراج کی تابع مہمل بن چکی ہے اور کس طرح پاکستانی سرزمین کو ہمسایہ ملکوں کے خلاف جاسوسی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس واقعہ نے امریکی سامراج کے عزائم ننگے کر دیئے اور سوویٹ یونین کے وزیراعظم نے پاکستانی حکومت کو سخت تنبیہ کی۔ اس کے بعد 1965ء کی پاک و ہند جنگ کے دوران امریکی سامراج نے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا اور ہتھیاروں کے علاوہ پاکستان کو فاضل پرزے بھی دینے بند کر دیئے۔ یوں امریکی سامراج کا بھرم کھل گیا۔ ادھر امریکی سامراج کے مشروط قرضوں میں جکڑی ہوئی پاکستانی معیشت اور دس سال کے عرصہ میں اس کی وساطت سے بائیس گماشتہ سرمایہ دار خاندانوں کے عروج اور لوٹ پر' پاکستانی عوام کے سینوں میں امریکی سامراج کے خلاف بے پناہ جذبات موجزن ہونے لگے اور درمیانہ طبقہ بھی ان غلامانہ تعلقات کے خلاف آواز بلند کرنے لگا۔ گماشتہ سرمایہ دارانہ ترقی کے اس راستہ نے 69-1968ء تک ملک کے 85 فیصد اثاثوں پر بائیس خاندانوں کو مسلط کر دیا تھا۔ طفیلی سرمایہ دارانہ معیشت کے پرانے چوکھٹے میں جس قدر ترقی ہو سکتی تھی وہ ہو چکی تھی' اور ملکی معیشت بحران سے دوچار تھی۔ مزید ترقی کے لئے میدان ہموار کرنے اور نئی راہیں نکالنے کے لئے ضروری تھا کہ امریکی سامراج سے بندھن توڑے جائیں اور جاگیرداری نظام کو ختم کر کے نئی پیداواری قوتوں کی نشوونما کی جائے' نیز امریکی سامراج پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ بڈابیر کے واقعہ کے بعد جاسوسی کے لئے ایسے اڈے سودمند نہیں رہے' کیونکہ سوویٹ یونین نے 80 ہزار فٹ کی بلندی پر اڑنے والے جہازوں کو گرانے کے لئے استعداد حاصل کر لی تھی۔

ان حالات نے ایوب حکومت کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ تاشقند میں 1965ء کی جنگ سے

پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہندوستان کی حکومت سے سوویٹ یونین کے رہنماؤں کی مدد سے گفت و شنید کرے۔ جس کے نتیجے میں تاشقند کا معاہدہ ہوا اور سوویٹ یونین کے ساتھ تجارت بڑھنے لگی۔ 1962ء کی ہند چین جنگ کے بعد۔۔۔۔ پاکستان کے چین کے ساتھ تجارتی تعلقات پہلے ہی استوار ہو چکے تھے۔ چین کی مدد سے ٹیکسلا میں بھاری کمپلیکس بنایا جانے لگا۔ شاہراہ ریشم کی تعمیر کے منصوبے بننے لگے اور پاکستان چین سے بھی اسلحہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پاکستان کے اندر جاگیرداروں اور ابھرتے ہوئے گماشتہ تجارتی اور صنعتی سرمایہ داروں کی پس پردہ باہمی کش مکش اور نئے پیداواری تعلقات اور جمہوری اور ترقی پسند پارٹیوں کی جدوجہد نے عوام کو نئے حالات اور نئے شعور سے لیس کیا اور بہتر زندگی کے لئے خواہشات کو زبردست جمہوری قوت میں بدل دیا۔ ٹرانسسٹر نے یہ خیالات ہر چہار سو پھیلا دیئے۔ عوام کی تھری لوٹ نے بے چینی پیدا کر دی۔ چونکہ گماشتہ طفیلی سرمایہ دار طبقہ کی گھناؤنی لوٹ کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس لئے جو تحریک 69-1968ء میں پھوٹی اس کا رخ اس طبقہ کے خلاف مرکوز ہو گیا۔ 1965ء کی جنگ میں اپنے کردار اور گماشتہ سرمایہ داروں کی پشت پناہی کی وجہ سے امریکی سامراج بھی اس کا نشانہ بنا۔ جاگیرداری نظام کے خلاف بے پناہ جذبات اس تحریک کے دوران ابلنے لگے مگر محنت کش طبقوں کی مضبوط اور منظم پارٹی کے فقدان، بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک میں زبردست انتشار، پیٹی بورژوا مہم پسندی اور موقعہ پرستی اور پاکستان کے بائیں بازو کی تہی دامنی اور جدوجہد کے لئے پہل قدمی کے فقدان کی وجہ سے اس عظیم عوامی تحریک کی رہنمائی فیوڈل سوشلسٹوں اور پیٹی بورژوازی نے حاصل کر لی۔ ایوب حکومت ختم ہو گئی اور یحییٰ خان نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس طرح ایک عظیم عوامی تحریک کے باوجود قومی جمہوری انقلاب ایک بار پھر تشنہ تکمیل رہ گیا۔

یحییٰ خاں کا مارشل لاء اور جمہوریت

ایوب خاں کے خلاف عظیم عوامی تحریک، قومی جمہوری انقلاب پر تو منتج نہ ہو سکی لیکن اس تحریک کی وجہ سے دو بڑے فیصلوں نے ضرور جنم لیا۔

(1) مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب پر مشتمل جو ایک یونٹ قائم کیا گیا تھا اسے توڑ دیا گیا اور مغربی پاکستان میں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے صوبوں کو بحال کر دیا گیا۔

(2) پاکستان میں ایک آدمی ایک ووٹ اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔

چنانچہ پاکستان میں 23 سال بعد پہلی بار بالغ رائے دہی کی بنیاد پر 1970ء میں عام انتخابات کروائے گئے۔

اس عظیم جمہوری تحریک کے ان دو مطالبات کو عملی جامہ پہناتے وقت اگرچہ عوام کی طاقت کے سامنے سر جھکا دیا گیا۔ لیکن درحقیقت یحییٰ خاں کا خیال یہ تھا کہ انتخابات میں کوئی بھی پارٹی اتنی اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی کہ اکیلی حکومت قائم کر سکے لہٰذا ان حالات میں بندر بانٹ کے لئے سب پارٹیوں کو اس کی ضرورت پڑے گی اور وہ نہایت آسانی سے صدارت کے عہدے پر متمکن ہو جائے گا۔ لیکن 7- دسمبر 1970ء کو جب انتخابات کے نتائج کا اعلان کیا گیا تو عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں تقریباً تمام سیٹیں جیت لیں اور اس طرح اس نے بلا شرکت غیرے حکومت بنانے کی طاقت حاصل کر لی۔ اور یحییٰ خاں کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے جبکہ سندھ اور پنجاب میں پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی اور سرحد اور بلوچستان میں ولی خان (نیپ) اور جمعیت علمائے اسلام کے نمائندے کامیاب ہوئے۔

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ دائیں اور بائیں بازو کے اپنے تمام حریفوں کو شکست دے کر ملک کی واحد اکثریتی پارٹی بن چکی تھی اس لئے اصولی طور پر اقتدار اسے منتقل ہونا چاہئے تھا۔ یحییٰ خاں نے مجبوراً" قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں طلب کر لیا۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ اس کی پارٹی کا جو ممبر اس اجلاس میں شمولیت کرے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ چنانچہ یحییٰ، بھٹو کی ملی بھگت سے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ انتخابی مہم کے دوران مشرقی پاکستان کے عوام عوامی لیگ کے چھ نکات سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ اور وہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کے راستے پر گامزن تھے۔ یحییٰ خان نے فوج اور بھٹو کے ایماء پر انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انتقال اقتدار کرنے کی بجائے مشرقی پاکستان کے بپھرے ہوئے عوام کو دبانے کے لئے فوج کو بے دریغ استعمال کرنے کی راہ اختیار کی، شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء پر فوج نے یلغار کر دی۔

دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو نے ڈھاکہ سے کراچی واپس آ کر ہوائی اڈے پر یہ بیان

دیا کہ پاکستان کو بچا لیا گیا ہے۔ اور اس طرح بھٹو نے یحییٰ خاں کے فوجی اقدامات کی کھلی حمایت کر دی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی کیونکہ اس فوجی ایکشن کے ذریعے پاکستان کو بچایا نہیں گیا تھا بلکہ اس کے ایک بڑے حصے کو خون کے دریا میں بہا دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں لاکھوں جانیں تلف ہو گئیں۔ ہزاروں عصمتیں لٹ گئیں۔ مشرقی پاکستان کے کھیت اور ندیاں اور دریا انسانوں کے خون سے رنگین ہو گئے اور عین اس وقت جب بنگلہ دیش کی عوامی انقلابی طاقتیں رفتہ رفتہ' اس خانہ جنگی کے دوران مضبوط ہو رہی تھیں اور پاکستان کی فوج کے ساتھ بنگالی عوام نے بھرپور اور مکمل مقاطعہ کر رکھا تھا اور انہیں سبزیاں' انڈے' گوشت' دودھ' مکھن اور پھل وغیرہ روپے پیسے سے بھی دستیاب نہیں ہو رہا تھا' بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے ایک طرف اپنی حریف پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تو دوسری طرف دن بدن طاقت پکڑتی ہوئی عوامی فوج کو طاقت سے کچل دیا۔ پاکستانی فوج کے 90 ہزار جوان بھارت کی قید میں چلے گئے۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ اقتدار عوامی لیگ کے ہاتھ میں چلا گیا اور اس طرح آگ اور خون کے دریا میں ڈوب کر بنگلہ دیش نے جنم لیا۔

مگر مغربی پاکستان میں اس تاریخی واقعہ سے مختلف ردعمل کا اظہار ہوا۔ پنجاب کے عوام' جن کی ذہنی آبیاری پنجابی فوج کی برتری اور اسلامی نظام کے نفاذ کی علمبرداری کے دلفریب لیکن کھوکھلے نعروں سے کی گئی تھی' غم و اندوہ کی وادی میں ڈوبے سکتے کے عالم میں دھاڑیں مارتے ہوئے گورنر ہاؤس کے آہنی دروازے سے سر پھوڑ رہے تھے' جبکہ کوئٹہ کے بازاروں میں لوگ مٹھائی بانٹ رہے تھے اور اندرا گاندھی زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

مغربی پاکستان میں ایوبی دور میں گماشتہ سرمایہ داری کی نشوونما کے دوران جن نئے طبقات نے جنم لیا تھا ان کی وجہ سے بھٹو کی رہنمائی میں پیپلز پارٹی پنجاب اور سندھ میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی۔ مغربی پاکستان کے شکست خوردہ جرنیلوں نے امریکی سامراج کی اعانت سے ان معروضی حالات میں' جبکہ فوج کی ساکھ مٹی میں مل چکی تھی' وقتی طور پر اس انتہائی گہرے اور ہمہ گیر بحران پر قابو پانے کے لئے بھٹو کو مغربی پاکستان کے مسند اقتدار پر براجمان کر دیا۔

بھٹو دور کے مثبت اقدامات!

1971ء کے آخر میں بھٹو نے برسر اقتدار آنے کے بعد فوری طور پر حالات کی

مجبوریوں کی وجہ سے جمہوریت کی بحالی کی بجائے مارشل کے سربراہ کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا اور پاکستان کی معیشت اور سیاست میں بہت سے جمہوری تبدیلیوں کے غیر جمہوری طریقوں سے نفاذ کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس دور کو سول مارشل لاء کے دور کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ چنانچہ اقتدار سنبھالنے کے چند ماہ بعد پہلی مارچ 1972ء کو زرعی اصلاحات کا نفاذ ان الفاظ میں کیا گیا۔

"ہم وطنو' مزارعو' ہاریو!

آج کی رات تمہاری رات ہے۔ میں تم سے زرعی اصلاحات کے بارے میں گفتگو کرنے والا ہوں۔ میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نے وہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ زرعی نظام بدل دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کو تم صدیوں سے خاموشی کے ساتھ برداشت کر رہے تھے آج کا دن عہد آفرین دن ہے کیونکہ ہم نے ایک ہی ضرب سے وہ روگ جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے جس نے اس ارض حسین کا چہرہ صدیوں سے مسخ کر رکھا تھا۔ ہم نے اپنے بچوں اور آپ کے بچوں کے لئے ایک جرات آزما نئی دنیا کا دروازہ کھول دیا ہے۔ ہم نے اپنی نسلوں کا مستقبل محفوظ کر دیا ہے۔ میں خدا اور اس کے بندوں کے سامنے سرخرو ہو رہا ہوں کہ آج کے دن پاکستان کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ تاریخ میں کوئی شعبدہ بازی نہیں ہے بلکہ اس سے ہماری کتاب آزادی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ ہماری زنجیریں کٹ رہی ہیں۔ آؤ ہم مل کر جشن منائیں....."

مسند اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد آج تک کسی پاکستانی حکمران نے طبقاتی بنیاد پر کسی روندے کچلے طبقے کو ان الفاظ سے مخاطب نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہیں مل کر جشن منانے کی دعوت دی تھی۔ بھٹو صاحب کی زرعی اصلاحات کے عملی نتائج خواہ کچھ ہی ہوں' یہ ہمدردانہ الفاظ مظلوم و مقہور عوام کے دلوں میں اترتے چلے گئے۔ ان کی نظروں میں صدیوں بعد اس خطہ زمین پر ایک ایسا رہنما پیدا ہوا تھا جو ان کے دکھ درد بانٹنے کے لئے آواز دے رہا تھا اور ان کے شانہ بشانہ جشن منانے کی دعوت دے رہا تھا۔۔۔۔ ان زرعی اصلاحات کی رو سے:

○ پہلی مارچ 1972ء کے اعلان کے مطابق کوئی شخص ڈیڑھ صد ایکڑ نہری یا چاہی اور دو صد ایکڑ بارانی زمین یا پندرہ ہزار یونٹوں سے زائد زمین ایک وقت میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔

○ 20 دسمبر 1971ء سے پہلے جس نے دس ہارس پاور کا ٹیوب ویل لگا رکھا تھا یا ٹریکٹر

خرید رکھا تھا' اسے اٹھارہ ہزار یونٹوں کی زمین رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔

○ یکم جنوری 1959ء کے بعد اگر کسی نے 4 مربع اراضی سے زائد زمین حاصل کر رکھی تھی اور خواہ وہ کسی کو منتقل ہی کیوں نہ کی گئی ہو۔ اسے بلا معاوضہ ضبط کرنے کا حکم دیا گیا۔

○ گھوڑی پال اور گائے پال مربع بلا معاوضہ حکومت کی ملکیت بنا دیئے گئے۔

○ تمام شکار گاہیں حکومت کی ملکیت بنا دی گئیں۔

○ آبیانہ اور دوسرے تمام ٹیکس مالک اراضی کو ادا کرنے ہوں گے۔ نیز آئندہ بیج کے اخراجات بھی مالک اراضی کو ادا کرنے ہوں گے۔ جبکہ کھاد اور کیڑ مار ادویات کا خرچ مالک اور مزارع کے ذمہ نصف نصف ہو گا۔

○ مزارع کو حق شفع دے دیا گیا اور اس کا حق سب سے فائق قرار دیا گیا۔

○ پٹ فیڈر (بلوچستان) کی چھ لاکھ ایکڑ اراضی بلا معاوضہ حاصل کر کے بے زمین کاشتکاروں یا گزارہ یونٹ سے کم زمین کے مالکان اراضی میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔

○ حکومت کی زمینیں پاکستانی افواج کے لئے بھی ریزرو کر دی گئیں۔

○ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ زرعی اصلاحات سے حاصل ہونے والی تمام زمینیں بلا معاوضہ لی جائیں گی اور بلا معاوضہ کاشتکاروں میں تقسیم کی جائیں گی۔

پہلے اعلان کے مطابق جب گوشوارے حاصل کئے گئے تو تقسیم کے لئے کوئی خاص زمینیں میسر نہ آ سکیں۔ چنانچہ پہلے حکم میں ترمیم کر کے 12 ہزار یونٹوں کی حد مقرر کی گئی اور ٹیوب ویل اور ٹریکٹر رکھنے والے کو مزید 2 ہزار یونٹ کی اراضی رکھنے کی اجازت دے دی گئی ان زرعی اصلاحات کے تحت پنجاب میں دو لاکھ چالیس ہزار ایکڑ' سندھ میں دو لاکھ اکاون ہزار ایکڑ اور صوبہ سرحد میں اٹھارہ ہزار سات ایکڑ اراضی تقسیم کے لئے دستیاب ہوئی۔ لیکن زمینداروں نے سب سے نکمی اراضی حکومت کے حوالے کی۔

مارچ 1977ء کے انتخابات کے موقع پر جنوری 1977ء میں نئی زرعی اصلاحات کا اعلان کیا گیا اور حدِ ملکیت چار مربع یا آٹھ ہزار یونٹ مقرر کر دی گئی زرعی اصلاحات سے حاصل شدہ اراضی مزارعین میں بلا معاوضہ تقسیم کر دی گئی۔

مزارعین کے لئے آبیانہ اور بیج کے متعلق قانون کے نتیجے میں ساڑھے بارہ ایکڑ نہری اراضی کاشت کرنے والے مزارعہ کو اس وقت کی قیمتوں کے مطابق تقریباً سوا تین صد روپیہ

سالانہ کی بچت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں دیہات کے لئے بے گھر لوگوں کے لئے 5 مرلہ سکیم رائج کی گئی۔ اس سکیم کے مطابق مالکان اراضی سے زمین لے کر پانچ پانچ مرلہ اراضی ان تمام خاندانوں میں تقسیم کی گئی جن کے پاس رہنے کو اپنے ملکیتی گھر نہیں تھے۔ پھر مزارعین کی بے دخلی کے متعلق قوانین میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں جن سے مزارعین کو پہلے سے زیادہ تحفظ حاصل ہوا۔ زرعی اصلاحات کے نتیجے میں تقریباً پچاس ساٹھ ہزار بے زمین یا کم زمین والے کاشتکاروں کو اراضی دستیاب ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جس ملک کی 75 فیصد آبادی دیہات میں بستی ہو ان کی زندگی میں قومی بنیادوں پر کوئی بڑی تبدیلی واقع نہ ہو سکی۔ نیز ان اصلاحات کو بے اثر بنانے کے لئے بڑے بڑے زمینداروں نے پہلے ہی اپنی اراضی اپنے عزیز و اقارب اور اپنے وفادار ملازموں اور دوستوں کے نام منتقل کر دی تھی۔ لیکن بلا معاوضہ بڑے زمینداروں سے زمین حاصل کر کے بلا قیمت مزارعین میں تقسیم کرنے کے اصول نے بے زمین اور گزاہ یونٹ سے کم اراضی کے مالکان میں امید کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔

بھٹو حکومت نے دوسرا بڑا قدم صنعتی شعبے میں اٹھایا۔ ایوب خاں کے دور میں (جس کی حکومت میں بھٹو صاحب ایک عرصہ تک ایک بڑے ستون رہے تھے) یہ حقائق سامنے آ چکے تھے کہ پاکستان کے 80 فی صد اثاثے بائیس خاندانوں کے قبضے میں ہیں اور پاکستان کے یہ خاندان اپنی اجارہ داریاں قائم کرنے کی راہ پر گامزن ہیں لہٰذا ایک طرف اگر فیوڈل خاندانوں کی طاقت کو توڑنا ضروری تھا تو دوسری طرف 1971ء کے واقعات کسی وجہ سے واقع ہونے والی ریاست کی کمزور معیشت کو سنبھالا دینے کے لئے بھی ان سرمایہ دارانہ داروں کو قومی ملکیت میں لینا ایک اہم ضرورت تھی۔ تیسرے صنعتوں اور بنکوں کے اداروں کو حکومت کی تحویل میں لینا عوام کے وسیع حلقوں کی تسلی اور تشفی کے لئے بھی ضروری تھا۔ چنانچہ یکم جنوری 1972ء کی معاشی اصلاحات کے حکم کے تحت بھٹو حکومت نے 32 صنعتی اداروں کو حکومت کی تحویل میں لے لیا۔ ان میں حسب ذیل صنعتیں شامل تھیں۔

(1) لوہے اور فولاد کی صنعتیں
(2) بنیادی دھاتوں کی صنعتیں
(3) بھاری انجینئرنگ کی صنعتیں
(4) بجلی کی بھاری صنعتیں
(5) موٹروں کی تیاری اور جوڑنے کے کارخانے
(6) ٹریکٹروں کو جوڑنے اور تیاری کے کارخانے
(7) کیمیکل کی صنعتیں
(8) پیٹرو کیمیکل صنعتیں

(9) سیمنٹ کے کارخانے (10) پبلک ضروریات کے ادارے

(11) بجلی پیدا کرنے اور تقسیم کی صنعتیں (12) گیس اور تیل صاف کرنے کے کارخانے

○ اگست 1973ء میں ایسے قوانین وضع کئے گئے جن کے تحت معاوضے کی ادائیگی کی بنیادوں پر ان صنعتوں کے حصص خریدے جا سکتے تھے۔ مارچ 1974ء میں منڈی کے بھاؤ کے مطابق ان مالکان کو معاوضہ ادا کرنے کے قوانین بنائے گئے۔

○ مینجنگ ایجنسیوں کا نظام ختم کر دیا گیا۔ اس نظام کے ذریعے ہی چند گھرانے صنعتی سیکٹر اور ملک کے 80 فیصد اثاثوں پر قابض ہو گئے تھے۔

○ 2- ستمبر 1973ء کو بناسپتی گھی پیدا کرنے کے 26 صنعتی یونٹوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ ان میں سے 14 پنجاب اور 12 سندھ میں تھے۔

○ جنوری 1974ء میں ایک قانون کے ذریعے جہاز تیار کرنے کی صنعت کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔

○ تمام سکولوں اور کالجوں کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔

○ پرانی نوکر شاہی کو کمزور کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کے لئے نئی نوکر شاہی وجود میں لائی گئی اور براہ راست بھرتی کا سلسلہ رائج کیا گیا۔

○ مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے نئے قوانین بنائے گئے جن سے کچھ حد تک ملازمت کو تحفظ دیا گیا۔

سیاسی شعبوں میں بھی بھٹو دور میں نئی جہتوں میں درج ذیل پیش رفت ہوئی :

○ تیسری دنیا کو جگانے اور اسلامی ممالک کو اپنے مسائل کے حل کے لئے متحد کرنے اور فلسطینی حریت پسندوں کی حمایت کے سلسلے میں بھی بھٹو حکومت نے بے شمار اہم اقدامات کئے۔ لاہور میں اسلامی چوٹی کانفرنس اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔

○ 1971ء کی جنگ کے نتیجے میں بھارت کی قید میں چلے گئے 90 ہزار پاکستانی فوجیوں کو رہا کروانے کے لئے اور دوسرے باہمی تنازعات کو حل کرنے کے لئے انہوں نے بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کیا۔

○ غیر جانبدار اور غیر وابستہ خارجہ پالیسی اپنانے کے لئے کچھ حد تک جدوجہد کی اور دو طرفہ تعلقات استوار کرنے کی پالیسی اختیار کی۔

○ سوویت یونین کی مدد سے کراچی میں لگنے والے فولاد کے کارخانے کی تعمیر کے لئے

پیش رفت ہوئی۔

○ ملک میں روز افزوں بے روزگاری کے مسئلے کے حل کے لئے محنت کشوں کو بیرون ملک ملازمت دلانے کی پالیسی کو اپنایا گیا۔

زرعی اور صنعتی شعبوں میں ان اصلاحات نے محنت کشوں اور عوام کے دوسرے وسیع حلقوں کے ذہنوں میں مثبت جمہوری خیالات کو مستحکم کیا۔ بڑے زمینداروں کی اراضی بلا معاوضہ لے کر بے زمین کاشتکاروں میں بلا قیمت تقسیم کرنے کے اصول اور گماشتہ سرمایہ داروں کی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کے اقدامات خواہ کتنے ہی نامکمل تھے اور ان میں کتنی ہی کج رویاں تھیں مگر پاکستان کی جمہوری تحریک میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

1968-69ء کی عظیم قومی اور عوامی جمہوری تحریک کے جلو میں دور دراز علاقوں میں غریب، پس ماندہ اور مظلوم لوگوں نے پہل قدمی کر کے بغیر کسی بیرونی امداد کے پیپلز پارٹی کی تنظیمیں قائم کیں اور پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کے بعد یہ تنظیمیں نہایت بے باکی کے ساتھ تھانوں اور تحصیلوں میں مقامی رجعت پسندوں اور استحصال کرنے والے چودھریوں اور وڈیروں کے خلاف آواز بلند کرتی رہیں اور حکومتی لیبل کی وجہ سے اکثر ان کی پذیرائی بھی ہوتی رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن حالات میں اور جس طریقے سے پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی تھی اور اس کے جھنڈے تلے جس طرح بے پناہ غیر منظم ہجوم اور پیدا گیروں کے گروہ جمع ہو گئے تھے، اس نے بے شمار بے راہرویوں، قباحتوں اور بداخلاقیوں کو بھی جنم دیا اور کرپشن سماج کے نچلے طبقوں میں بھی سرایت کر گئی لیکن محنت کش طبقوں کے مثبت کردار اور سماجی زندگی میں ان کے نئے مقام کے مثبت پہلوؤں سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں اس دور میں اکثر دیکھنے میں آیا کہ حکومت کے جن اداروں اور ایوانوں میں بڑے زمیندار، سرمایہ دار اور صاحب ثروت لوگ بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے اور جہاں غریب لوگوں کی کبھی شنوائی نہیں ہوتی تھی وہاں بے بسیوں، مجبوریوں اور ناامیدیوں میں گھرے ہوئے تھے یہ لوگ اور ان کے نمائندے بے دھڑک براجمان نظر آنے لگے۔ اقتدار تک پہنچنے سے پہلے پیپلز پارٹی میں اکثر غریب لوگوں نے شمولیت کی تھی اور بڑے بڑے لوگ خال خال تھے چنانچہ عیسائی، مصلی، دیندار، مزارعین، کھیت مزدور، چھوٹے دکاندار، چھوٹے مالکان اراضی اور غریب اور نچلے درمیانے طبقے کے لوگ بے شمار مقامی یونٹوں میں پیپلز پارٹی کے عہدیدار بن گئے اور تھانیداروں، تحصیلداروں اور ان سے بھی بڑے افسروں کے برابر

کرسیاں پانے لگے۔ پرانی فیوڈل قدروں کے وارث بڑے لوگوں کے لئے یہ صورت حال کلجگ سے کم نہ تھی۔ لیکن نئی جمہوری تحریک کی بدولت غریبوں کے لئے ریاستی اقتدار کی طاقت کا یہ مزہ انہیں للکار رہا تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ جمہوری خیالات کی وسیع پیمانے پر نشوونما اور جمہوری اقدامات نے کئی سال تک علاقے کے بڑے بڑے زمینداروں کو بے دخلیاں بند کرنے اور دوسرے مظالم ڈھانے سے نہ صرف روک دیا بلکہ کسانوں میں نئی سیاسی اور تنظیمی بیداری پیدا کی۔ انہوں نے زمینداروں اور حکومتی اداروں کے مسلح دستوں سے کئی بار نبرد آزمائی کی اور کئی کامیابیاں حاصل کیں۔ ٹریڈ یونین تحریک ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی اور نہایت ہی پس ماندہ علاقوں میں بھی محنت کشوں نے نئے قوانین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی یونینوں کو منظم کرنا شروع کر دیا اور اپنے مسائل کے حل کے لئے ہڑتال کا حق استعمال کیا۔ فیکٹریوں پر قبضے کئے۔ پہیہ جام ہڑتالیں کیں۔ مارچ 1970ء میں پنجاب کسان کمیٹی نے نیپ بھاشانی کے تعاون سے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک عظیم الشان کسان کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ اس کانفرنس نے کسانوں میں جس جوش و جذبے اور سپرٹ کو جنم دیا وہ بھٹو دور میں ہر چہار سو پھیل گئی۔ اصطلاحات کے بعد پہلی بار پٹ فیڈر (بلوچستان) کے علاقہ میں بھی کسانوں نے اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ اسی زمانے میں ہشت نگر (سرحد) میں کسانوں نے بھی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا بے شمار قربانیاں دیں اور بے دخلیوں کو بند کروانے اور مزارعین کو حقوق دلوانے میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا۔

اگرچہ جدوجہد کے اس طریقے پر کئی زاویوں سے تنقید کی جا سکتی ہے لیکن یہاں ہم ان پہلوؤں کے متعلق گفتگو نہیں کر رہے۔

دیہات میں پانچ مرلہ سکیم نے لاکھوں کھیت مزدوروں' مزارعین اور دبے کچلے پس ماندہ لوگوں کو سر چھپانے کے لئے نہ صرف جگہ مہیا کی بلکہ انہیں نیا حوصلہ بھی دیا اور وہ لوگ جو زمینداروں کی مرضی کے خلاف اپنے مویشیوں کا گوبر بھی نہیں بیچ سکتے تھے' آزادی کی فضا میں سانس لینے لگے۔ اندھا دھند بے دخلیوں کو روکنے کے لئے جو قوانین بنائے گئے اس سے مزارعین میں نئی ہمت اور توانائی پیدا ہوئی اور وہ اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کی راہ پر چل نکلے۔

ان تمام اقدامات نے جمہوریت کی تحریک کو فروغ دیا اور عوام کے وسیع ترین حلقوں کو

نئی آزادیاں اور نئے حقوق عطا کئے۔ وہ خیالات و جذبات اور جوش و ولولہ جو نئے پیداواری اوزاروں اور نئے پیداواری تعلقات نے پیدا کیا تھا اور جن کی بدولت 1970ء کے انتخابات میں بڑے بڑے زمینداروں' وڈیروں اور ان کے گرگوں کی درمیانہ طبقے کے نمائندوں نے ضمانتیں تک ضبط کروا دی تھیں' اب یہ نمائندے پیپلز پارٹی کی حکومت کی ان اصلاحات کو نافذ کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

انہی طاقتوں اور تحریک کی وجہ سے 1973ء میں بھٹو کی رہنمائی میں آئین ساز اسمبلی نے پاکستان کے وجود میں آنے کے 25 سال بعد ملک کا پہلا جمہوری آئین تقریباً متفقہ طور پر پاس کیا۔ اس آئین کی رو سے عوام کی بہتری اور بہبود کے لئے ضرورت پڑنے پر نجی جائیداد کو قومی ملکیت میں لیا جا سکتا تھا۔ اس میں عوام کے بنیادی حقوق کو جلی حروف میں لکھا گیا۔ اور صوبائی مختیاری کے مسئلے کو حل کرنے کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ گویا کہ 1973ء کا آئین پاکستان میں بورژوا جمہوریت کے قیام کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں جمہوریت مخالف اقدامات!

قیام پاکستان کے بعد سیاست کے افق پر بھٹو سے زیادہ درخشاں ستارہ نمودار نہ ہوا تھا۔ ملک کے مایوس و محروم عوام میں اس کی ہردلعزیزی بے پایاں تھی اور لوگ والہانہ انداز سے اس کی گرویدہ تھے۔ بھٹو نے زرعی اور صنعتی اصلاحات نافذ کر کے اور 1973ء کا آئین بنا کر جمہوریت کے قیام کے لئے بہت بڑے اقدامات کئے لیکن ان سب اقدامات، کے باوجود نہ معاشی ترقی آگے بڑھی اور نہ ہی جمہوریت نے نشوونما پائی۔ اس لئے سیاسی کارکنوں کے لئے یہ بہت بڑا الجھا ہوا معمہ بنا ہوا ہے کہ ان پالیسیوں میں آخر کونسی خرابی تھی جس نے معاشی اور سیاسی ترقی کو مسخ کر دیا' جس نے ہر چہار سو بے چینی کو جنم دیا اور جس نے آخر 1977ء میں 1973ء کے آئین کے تحت قائم ہونے والی حکومت کا تختہ الٹ کر پاکستان میں تیسرا مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور جمہوریت کی شاہراہ پر جو ایک قدم آگے کی طرف بڑھا تھا اسے دو قدم پیچھے ڈال دیا۔

اس سانحہ کی اصل اور بنیادی وجہ وہ پالیسی ہے جو پیپلز پارٹی نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد پاکستان کی ترقی کے لئے اختیار کی۔ ماضی کی طرح اس پالیسی کا بنیادی مقصد بھی سامراج کے مشروط قرضوں اور امداد سے جاگیری ملکیتی رشتوں کو قائم رکھتے ہوئے سرمایہ

داری نظام کی نشوونما تھا۔

معاشی اصلاحات کی منصوبہ بندی میں یہ سوال بھی بہت اہم ہوتا ہے کہ کس شعبہ میں اصلاحات کو اولیت حاصل ہے۔ اور کس کو موخر کیا جانا چاہئے چنانچہ 73-1972ء میں پاکستان میں اولیت امریکی سامراج کے مشروط قرضوں سے نجات حاصل کرنے کو ہونی چاہئے تھی لیکن نہ صرف یہ کہ امریکی سامراج کے مشروط قرضوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کوئی اقدام نہ کیا گیا بلکہ پاکستان کی معیشت کو پہلے سے بھی زیادہ اس کا محتاج بنا دیا گیا۔ اور امریکی سامراجی اداروں کو پاکستان کی معاشی زندگی میں کھلی مداخلت کے مواقع فراہم کر دیئے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روپے کی قیمت میں 120 فیصدی کمی کر دی گئی۔ سامراجی قرضوں کا بوجھ خود بخود اسی حساب سے مزید بڑھ گیا۔ اصل اور سود کی رقم میں اضافہ ہو گیا۔ درآمدات کی قیمتیں حد سے زیادہ بڑھ گئیں۔ سامراجی مشروط قرضوں سے اس عرصے میں کوئی بنیادی اور بھاری صنعت نہ لگ سکی بلکہ وقتی طور پر پنجسالہ منصوبہ بندی کو بھی خیرباد کہہ دیا گیا پاکستان پہلے کی طرح ہر قسم کی مشینیں، ٹرک، ٹریکٹر فالتو پرزے وغیرہ درآمد کرنے کے سلسلہ میں محتاج ہو کر رہ گیا اور امریکی سامراج کو پاکستان کی سیاست، معیشت اور ثقافتی زندگی میں بدستور مداخلت کا موقع فراہم ہوتا رہا۔ ترقی اور جمہوریت کے راستے پر آگے بڑھنے کے لئے معاشی اصلاحات کے میدان میں دوسرا بڑا شعبہ زرعی شعبہ تھا۔ جب نہایت ہی طمطراق سے زرعی اصلاحات کا "عہد آفریں" اعلان کیا گیا تو اس سے جاگیرداری نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی بجائے سامراجی ماتحتی میں زراعت میں سرمایہ دارانہ طریق کاشت رائج کرنے کا راستہ اختیار کیا گیا۔ زرعی اصلاحات کے تحت ملک بھر میں ساڑھے چار لاکھ ایکڑ کے قریب زمین بڑے زمینداروں اور وڈیروں سے حاصل کی گئی اور زرعی ترقی کے لئے سامراجی قرضے حاصل کرنے، ٹریکٹر کیڑے مار دوائیاں اور کھاد کے استعمال پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جانے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیہات میں جاگیرداروں کی جو گرفت بالکل ڈھیلی پڑ رہی تھی ازسرنو نئے حالات میں نئے طریقوں سے مضبوط ہونے لگی اور درمیانے زمیندار بھی نئی طرز کے جاگیرداروں کی صفوں میں شامل ہونے لگے۔ لیکن دیہات میں چونکہ مزدوروں کی اجرتیں بہت کم تھیں اور ساری دیہاتی زندگی پس ماندگی میں گھری ہوئی تھی اس لئے انہوں نے شہروں کا رخ اختیار کیا۔ لیکن ان مزدوروں کو شہروں میں جذب کرنے کے لئے کارخانے اور فیکٹریاں لگانے کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ بغیر کسی طویل المیعاد منصوبہ بندی کے صنعتوں اور

بنکوں کو قومیا لیا گیا تھا اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو پٹی بورژوا خیالات پر مبنی بے ہنگم ہلڑ بازی اور نعرہ بازی اور دھان چھڑنے' آٹا پیسنے اور کپاس بیلنے کے چھوٹے کارخانوں کو سرکاری تحویل میں لے لینے کی وجہ سے چھوٹے سرمایہ داروں کی صفوں میں بھی بے چینی پھیلنے کے حالات پیدا ہو گئے اور نجی شعبہ بالکل بے یقینی سے دوچار ہو گیا چونکہ نجی شعبے کا کسی منصوبہ بندی کے تحت تعین نہیں کیا گیا تھا' نتیجہ یہ نکلا کہ اس شعبے میں جمود پیدا ہو گیا۔ صنعتی ترقی رک گئی۔ سرمایہ ملک سے باہر منتقل ہونے لگا۔ پیداواری شعبے میں ترقی کی رفتار کم ہو گئی۔ سرمایہ دار درآمد' برآمد کی تجارت اور بڑے بڑے پلازے بنانے کی راہ پر گامزن ہو گیا جبکہ معروضی حالات کا تقاضا تھا کہ پرانے پیداواری رشتوں اور زمینی ملکیتی رشتوں کو توڑ دیا جائے۔ اور وسیع پیمانے پر پبلک اور نجی شعبوں میں بھاری' بنیادی اور ہلکی صنعتوں اور توانائی اور تیل پیدا کرنے کے لئے ٹھوس منصوبہ بندی کر کے ترقی کی راہ پر گامزن ہوا جاتا لیکن ایسا کرنے کی بجائے بے چینی' بے روزگاری اور غربت کو دور کرنے کے لئے محنت کشوں اور کاریگروں کو ملک سے باہر ملازمتیں ڈھونڈنے کے لئے ترغیب اور سہولتیں دی جانے لگیں جس کی وجہ سے لاکھوں محنت کش جنہیں اپنا وطن باعزت زندگی دینے کی سکت نہیں رکھتا تھا پاکستان کی سرزمین کو خیرباد کہہ کر مشرق وسطیٰ اور یورپین ممالک میں چلے گئے۔ گو وہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران 13 ارب روپے کا زر مبادلہ کما کر پاکستان کی معیشت کو سہارا دے رہے تھے اور اندرون ملک بیروزگاری کا دباؤ کم کر رہے تھے لیکن ان کی ہجرت سے پاکستانی معیشت کاریگروں کے بغیر بانجھ ہونے لگی۔ جن کی خالی جگہوں کو پر کرنے کے لئے چند سال درکار تھے جو ان حالات میں میسر نہ آ سکے۔

پیپلز پارٹی کی قیادت پر چونکہ خود بھٹو' کھر اور جتوئی کی اعانت سے آہستہ آہستہ بڑے زمیندار چھا گئے تھے لہٰذا انہوں نے زرعی اصلاحات کے ان پہلوؤں کو بھی اجاگر نہ ہونے دیا جن سے عوام کی زندگی میں تھوڑی بہت تبدیلی آ سکتی تھی اور ان کی کبڑی کمر کا بوجھ ہلکا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے آبیانہ اور بیج کی قیمت کی ادائیگی کے قانون کو اپنی آبائی طاقت' اثر و رسوخ اور مختلف حیلے بہانوں سے عمل میں ہی نہ آنے دیا۔ دیہات میں کسانوں اور مزارعین کی تنظیمیں نہ ہونے کے برابر تھیں جو ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد کرتیں اور پیپلز پارٹی کی بالائی قیادت اپنی ہی پارٹی کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات پر عملدرآمد کروانے کے لئے تیار نہ تھی بلکہ اکثر اوقات زرعی اصلاحات سے بچنے کے لئے قانون کی آڑ لینے کی

کوشش کرتی رہی۔

بھٹو صاحب نے معاشی اصطلاحات کے میدان میں اولیت صنعتی شعبے کو دی اور معیشت کی ناگفتہ بہ حالت کو بہتر بنانے کے خیال سے اور بپھرے عوام کی اشک شوئی کے لئے سب سے پہلے بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا اور بعد میں بنکوں اور دوسری صنعتوں کو بھی سرکاری تحویل میں لے لیا۔ اس طرح گویا ریاستی سرمایہ داری کو مضبوط کیا اور قومیائی ہوئی صنعتوں کو بغیر کسی تیاری کے کرپٹ اور بے ایمان افسر شاہی کے سپرد کر دیا جنہوں نے ان صنعتوں کو جی بھر کر لوٹا۔ اور بحران کو کم کرنے کی بجائے اسے اور بھی گہرا کر دیا۔

لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے اندر پیٹی بورژوا نعرہ بازوں نے اس معاشی پالیسی کو "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کے انتہا پسندانہ قسم کے نعرہ کی عملی تصویر بنا کر پیش کیا جس سے ایک طرف سوشلزم کو بدنام کیا گیا اور دوسری طرف اس سائنٹیفک حقیقت کو محض نعرے بازی میں گم کر دیا گیا کیونکہ ان معروضی حالات میں سوشلزم کے نفاذ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس دور میں صرف سائنٹیفک سوشلسٹ ہی قومی یا عوامی جمہوریت کی تکمیل کے لئے کوئی پالیسی مرتب کر سکتے تھے کیونکہ جاگیرداری نظام کے قائم رہتے ہوئے محض چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینے سے بھلا سوشلزم کیسے قائم ہو سکتا تھا۔ یوں تو 1947ء سے پہلے بھی پبلک سیکٹر میں بے شمار صنعتیں بنک اور ادارے موجود تھے۔ لیکن وہ سوشلزم کے قیام کے لئے نہیں بلکہ برطانوی سامراج کے سامراجی کردار کو مضبوط اور پائیدار بنانے کے لئے وجود میں لائے گئے تھے۔ اس عمل اور نعروں نے ترقی پسند جذباتی کارکنوں میں سخت الجھنیں پیدا کر دی جو آج تک ان کے ذہنوں میں اٹکی ہوئی ہیں اور وہ ہر محاذ پر متواتر پسپائی اور شکست کے باوجود ایسے حالات میں اس اصطلاح سے چمٹے ہوئے ہیں جبکہ سماجی حالات ابھی اسے عمل میں لانے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے۔

بھٹو صاحب کا تیسرا بڑا نعرہ "جمہوریت ہماری سیاست ہے" ایوب حکومت کے خلاف عوامی تحریک کے دوران نہایت ہی مقبول عام نعرہ تھا۔ ایک طرف تو ان معروضی حالات کا یہ تقاضا تھا جو سرمایہ داری (گو وہ محتاج اور گماشتہ سرمایہ داری ہی تھی) کی نشوونما کی وجہ سے پیدا ہوئے اور دوسری طرف عوام دس سالہ گھٹن کے طویل دور کے خاتمے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے اور نیا درمیانہ طبقہ' محنت کش اور پیٹی بورژوا عناصر ان خیالات اور جذبات کا اظہار کرنے کے لئے تڑپ رہے تھے' جو ان کے ذہنوں میں ان حالات کی وجہ سے پیدا

ہوئے تھے اور جیسے جیسے پیداواری اوزار بدل رہے تھے' پیداواری تعلقات بھی بدل رہے تھے اور بدلتے ہوئے پیداواری اوزار اور تعلقات انسانوں کے ذہن بھی بدل رہے تھے' نظریات اور سوچ بھی بدل رہی تھی۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر امریکی سامراج کی ویتنام میں پے در پے شکستیں' چین میں ثقافتی انقلاب کے نعرے (ان نعروں کا اثر اندرون چین خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو' پاکستانی عوام کو جدوجہد کے راستے پر ڈالنے میں ضرور مدد و معاون ثابت ہوا۔) فلسطینی عوام کی امریکی سامراج اور اسرائیل کے خلاف دلیرانہ جدوجہد بھی پاکستانی سماج کے نئے اور پرانے طبقوں کے ذہنوں میں تبدیلیاں لا رہی تھی۔

لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ بھٹو نے جمہوریت کے اس نعرے کو عملی جامہ نہ پہنایا بلکہ اپنے ہی بتائے ہوئے 1973ء کے نوزائیدہ آئین کو وجود میں آنے کے چند ہی ہفتے بعد عملی طور پر منسوخ کر دیا۔ اور ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا۔ پاکستان بھر میں اور خصوصاً پنجاب اور کراچی میں مسلسل دفعہ 144 کا نفاذ رہا۔ متفقہ آئین میں تبدیلیاں کر کے عدالت عالیہ کے اختیارات کو محدود کر دیا گیا۔ اور عدالتوں کو پیپلز پارٹی کی باندی بنا کر رکھ دیا حتیٰ کہ حیدر آباد میں ایک سیشن جج کو عدالت میں ہی ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔

آئین میں درج صوبائی خود مختاری کے متعلق دفعات کو طاق نسیاں پر رکھتے ہوئے بلوچستان کی نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کی منتخب حکومت کو ختم کر دیا گیا۔ اور وہاں زبردستی پیپلز پارٹی کی حکومت قائم کر دی گئی حالانکہ وہاں پیپلز پارٹی کا ایک بھی نمائندہ انتخاب میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس اقدام کے خلاف احتجاج کے طور پر صوبہ سرحد کی نیپ حکومت نے استعفیٰ دے دیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے ان تمام مرکزی رہنماؤں کے خلاف سپریم کورٹ میں ایک ریفرنس پیش کر دیا جنہوں نے پیپلز پارٹی سے تعاون کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے' ملک میں جمہوریت کے قیام کی خاطر' کچھ عرصہ پہلے 1973ء کے آئین پر اپنے دستخط ثبت کئے تھے۔ اس کے بعد نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں کے خلاف بے بنیاد اور بیہودہ الزامات کے تحت حیدر آباد جیل میں مقدمہ چلایا گیا مگر جس افسر کے ذریعے ان رہنماؤں کے خلاف پرچہ دیا گیا تھا اس نے عدالت میں یہ بیان دیا کہ اسے نہیں معلوم کہ ملزمان کے خلاف کون سے جرم کا اطلاق ہوتا ہے۔

بھٹو کے دور حکومت میں سیاسی حریفوں کے جلسوں کو درہم برہم کرنے کے لئے غنڈہ گردی کے تمام حربے استعمال کئے گئے۔ لیاقت باغ میں نیشنل عوامی پارٹی کے جلسہ پر اندھا

دھند فائرنگ کر کے بے شمار بے گناہ لوگوں کا خون بہایا گیا پختون خواہ سے اس جلسے میں شمولیت کے لئے آنے والوں کی بسوں کو آگ لگوا دی گئی۔ سیاسی مخالفین کے خلاف بھینسوں کی چوری کے جھوٹے مقدمات بنوائے گئے اور لوگوں کو جگ ہنسائی کا موقع فراہم کیا۔ اپنے ہی مقرر کئے ہوئے جانشینوں (معراج اور کھر) کو اختلاف رائے کی بنا پر پارٹی سے باہر نکال دیا۔ معراج محمد خان کئی سال تک جیل میں بند رہے۔ کھر کے حامیوں کو ولائی کیمپ میں غیر قانونی طور پر محبوس کر دیا گیا اور عدالت عالیہ میں پولیس افسروں سے جھوٹے بیان حلفی داخل کروائے گئے کہ انہیں ان کے متعلق کچھ علم نہیں' الغرض اپوزیشن کے خلاف غنڈہ گردی کی ایسی فضا قائم کر دی گئی کہ الامان والحفیظ۔

عطاء اللہ مینگل کے صاحبزادے کو گھر سے اغواء کر کے قتل کروایا گیا جمہوری جدوجہد کے ایک پرانے رہنما خواجہ رفیق کو دن دہاڑے لاہور میں قتل کیا گیا۔ ڈاکٹر نذیر بھی اسی زمانہ میں قتل ہوا۔ اصغر خان کے قتل کے لئے ایف ایس ایف کے ایک ملازم نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر ٹائم بم رکھنے کی کوشش کی۔ جب اس وقت کے آئی جی پولیس راؤ رشید نے اس واقعہ کی طرف بھٹو کی توجہ دلائی تو صرف "اچھا دیکھیں گے" کا مختصر جواب سا دیا گیا' پیپلز پارٹی کے ایم این اے احمد رضا قصوری کے قتل کے لئے ایف ایس ایف نے فائرنگ کی جس سے اس کا والد احمد خان مارا گیا اور اسی واقعہ کی وجہ سے آخر بھٹو کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

قتل و غارت کے ان واقعات کے علاوہ حزب اختلاف کے رہنماؤں اور کارکنوں پر جیلوں اور حوالاتوں میں بے پناہ مظالم ڈھائے گئے اور اخلاقیات سے گری ہوئی بہیمانہ کاروائیاں کی گئیں۔ حتیٰ کہ ملتان میں پیپلز پارٹی کے ایک سرکردہ رہنما نے اپنی ذاتی نگرانی میں حزب اختلاف کے باعزت رہنماؤں کو اپنی مقعر میں لینے کے لئے بینگن' گاجر' مولی وغیرہ کا انتخاب کرنے کے لئے پولیس کے ذریعے تجویز پیش کی۔ ملک قاسم پر ایسا تشدد کیا گیا کہ اس کی کمر میں دائمی درد رہنے لگا۔ حوالات میں جماعت اسلامی کے طفیل محمد کی بے عزتی کی گئی۔ جیل میں ایک نوجوان باریش مولوی کے ساتھ ایک فاحشہ عورت کو ننگا ایک ہی چارپائی پر سلایا گیا۔ ایک نوجوان نظربند کے سامنے اس کی رشتہ دار عورت کے ساتھ زنا کی دھمکی دی گئی اور اپنی مرضی کا بیان لکھوایا گیا۔ ظلم و تشدد حزب اختلاف پر ہی روا نہ رکھا گیا بلکہ پیپلز پارٹی کے اندر بھی اگر کسی نے چون و چرا کی تو اس پر بھی ایسا ہی تشدد کیا گیا جسے رحیم

جیسے معمر شخص (جو مرکزی وزیر بھی تھے) کی ایک چھوٹی سی بات پر بے عزتی کے ساتھ ٹھکائی کی گئی اور وزارت سے برطرف کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے ساڑھے پانچ سال ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ اور یوں محسوس ہونے لگا کہ غنڈہ گردی کا نام جمہوریت رکھ دیا گیا ہے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد کراچی میں مزدوروں پر اندھا دھند گولی چلائی گئی جس سے درجنوں محنت کش جان بحق ہو گئے۔ اس سانحہ عظیم کے پیچھے مقتدر اشخاص کا ہاتھ تھا لیکن بھٹو صاحب نے اس واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیق کروانے کی بجائے یہ اعلان کر دیا کہ یہ اس کے خلاف ایک سازش کے تحت کروایا گیا ہے۔ چنانچہ اس سانحہ کے بعد محنت کشوں کے رہنماؤں کے خلاف پکڑ دھکڑ اور تشدد کی پالیسی اختیار کر لی گئی۔

پیپلز پارٹی کے ابتدائی دور میں "عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں" کا نعرہ بہت مقبول تھا لیکن بھٹو صاحب جونہی مسند اقتدار پر براجمان ہوئے انہوں نے اس نعرہ کو آہستہ آہستہ خیرباد کہہ دیا۔ اور اقتدار اعلیٰ کی حفاظت کے لئے تمام تر انحصار افسر شاہی پر کرنے لگے۔ گو پارٹی میں لاکھوں عوام جمع ہو گئے تھے لیکن انہیں جمہوری بنیادوں پر منظم کرنے کی نہ صرف کوشش نہیں کی گئی بلکہ پارٹی کو بھی افسر شاہی کے ذریعے چلانے کا راستہ اپنایا گیا افسر شاہی کے ذریعے ہی مزدوروں، کسانوں، عورتوں اور طلباء کے ہفتے منائے گئے اور لاکھوں روپیہ گندی نالی میں بہا دیا گیا۔ حتیٰ کہ 1977ء کے انتخابات کے لئے ٹکٹ دینے کے لئے بھی افسر شاہی پر تکیہ کیا گیا۔ اور ضلعی ڈپٹی کمشنروں اور پولیس افسروں کی رپورٹوں پر امیدواروں کا انتخاب کیا گیا۔ افسر شاہی نے اکثر متوقع امیدواروں سے رشوت لے کر ان کے حق میں رپورٹیں کیں۔ خود پیپلز پارٹی کی صفوں میں یہی وبا پھیل گئی اور پیپلز پارٹی کے عہدے بکاؤ مال بن گئے۔ اس طرح جمہوریت کی خود ہی نفی کر دی گئی۔ اور "طاقت کے اس سرچشمے" کو بتایا جانے لگا کہ بھٹو صاحب ہر فن مولا ہیں اور وہی سب دکھوں کے مشکل کشا ہیں اور وہ مافوق الفطرت انسان ہیں اور بڑے سے بڑے الجھے ہوئے مسائل حل کرنے میں یکتا ہیں۔ وہ بحرانوں کے آدمی ہیں اور بحران میں ان کی اڑان اور بھی اونچی ہو جاتی ہے۔ وہ سیاست کی شطرنج کے بہترین کھلاڑی ہیں اور کوئی دوسرا ان سے بہتر چال نہیں چل سکتا۔ چنانچہ پیپلز پارٹی کے عوام اور کارکن آخر دم تک یہی سمجھتے رہے کہ بھٹو صاحب اپنی ذہانت، اپنی

ڈپلومیسی، سحر بیانی اور جوڑ توڑ سے آخری بحران پر بھی قابو پا لیں گے حتیٰ کہ وہ تختہ دار پر لٹک گئے۔

بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کی سب سے بڑی غلطی سیاسی حکمت عملی کی غلطی تھی۔ وہ خود سندھ کے ایک وڈیرہ خاندان کے چشم و چراغ تھے، جدید علوم سے بہرہ ور ہونے کے باوجود وہ اپنے ماضی کے نظریات سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ وہ ایک جاگیردار کی طرح جمہوریت کی نفی کرتے ہوئے بلا شرکت غیرے اقتدار کی کرسی پر براجمان رہنا چاہتے تھے۔ وہ صوبائی سطح پر بھی اقتدار میں کسی کو شامل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کو اقتدار میں حصہ دار بنانے کی بجائے اس کے ساتھ ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کی۔ تمام جمہوری طاقتوں کا متحدہ محاذ بنانے کی بجائے انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کو کچلنے کی راہ اختیار کی اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی حکومت کو ختم کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلوچ پہاڑوں پر چڑھ جانے پر مجبور ہو گئے۔ سیاسی مفاہمت کی بجائے بلوچوں کو فوج کے ذریعے کچلنے کا راستہ اختیار کیا گیا۔ اور فوج کئی سال تک ایک بار پھر اپنے ہی عوام کو فتح کرنے پر لگی رہی۔ بلوچوں کے خلاف اس جنگ میں شاہ ایران کے ہیلی کوپٹر بھی حصہ لیتے رہے۔ ساڑھے چار ہزار بلوچ مارے گئے۔ اور چار ہزار کے قریب فوجی بھی کام آئے۔ اس فوجی عمل سے ایک بار پھر ذلت کے گڑھے میں گری ہوئی فوج کو اعلیٰ مقام دے دیا گیا اور اس احساس اور جذبہ کو پروان چڑھایا گیا کہ فوج کی بالادستی اور استعمال کے بغیر نہ صرف پاکستان کی آزادی اور سالمیت کو قائم نہیں رکھا جا سکتا بلکہ سویلین حکومت بھی خود اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔

آخر 1977ء مارچ کے عام انتخابات کے دوران چند سیٹوں پر بھٹو حکومت نے اس قدر بھونڈی اور پرتشدد طریقے سے دھاندلی کی کہ "قومی اتحاد" نے صوبائی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ اور عوام کے اوپری حصے نے بھٹو حکومت کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ جوں جوں تحریک پر تشدد کیا گیا تحریک بڑھتی گئی اور پس پردہ قوتوں، امریکی سامراج اور پاکستان کے رجعت پسندوں کی ملی بھگت سے بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور 5- جولائی 1977ء کو ملک میں امریکی سامراج کی مدد اور شہ پر تیسرا مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اور پاکستان کو ایک بار پھر ننگی آمریت کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا۔

بھٹو کی سیاسی زندگی کے اٹھارہ سال مجموعہ اضداد تھے۔ وہ اپنے فیوڈل پس منظر اور اعلیٰ

تعلیم کی وجہ سے کسی قسم کی سیاسی جدوجہد کئے بغیر برطانوی سامراج کے پروردہ اور امریکی سامراج کے دلدادہ افسر شاہی کے ایک بڑے مہرے "سکندر مرزا" کی ذاتی ناؤ و نوش کی دوستی اور نگاہ التفات کی وجہ سے 1958ء کے آخر میں پہلے مارشل لاء کی پہلی حکومت میں خراماں خراماں داخل ہو گیا تھا۔ وہ ذہین تھا' جدید علوم سے گہری واقفیت رکھتا تھا۔ ہٹلر کی کتاب "میری زندگی" سے اسے گہری رغبت تھی۔ سوشلسٹ نظریات کو وہ خوب جانتا تھا۔ وہ پیٹی بورژوا اور لمپن پرولتاریہ کی سٹریٹ پاور کو استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں بلا شرکت غیرے اقتدار کے حصول کے لئے کوشاں تھا۔ وہ ایوبی آمریت کے دور میں مختلف وزارتوں پر فائز رہا۔ 1964ء میں صدارتی انتخاب کے دوران جمہوری قوتوں کے خلاف ایوب حکومت کی انتخابی مہم کا ناظم اعلیٰ تھا۔ اور آخر 1965ء کی پاک ہند جنگ' جو اس کی ایماء اور مشورے پر بھارتی کشمیر میں پاکستانی گوریلے داخل کرنے کی وجہ سے چھڑی تھی' بھارت کے خلاف ہزار سال جنگ کرنے کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر نعروں کے جلو میں گماشتہ سرمایہ داری اور سبز انقلاب کی نشوونما سے پیدا ہونے والے نئے طبقات اور غریب عوام کے دلوں میں جاگزین ہو گیا۔

وہ نہایت ہی زیرک نگاہ تھا اور وقت کی نبض پر اس کا ہاتھ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عوام کیا چاہتے ہیں اور وہ جو چاہتے تھے۔ اسے اس نے اپنے منشور کے سرورق پر چار نعروں میں سمو دیا تھا۔ "اسلام ہمارا دین ہے" کے نعرے کے باوجود وہ گول باغ لاہور کے جلسہ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ تھوڑی سی پی لیتا ہے۔ "جمہوریت ہماری سیاست ہے" کے اعلان کے ساتھ وہ آمرانہ انداز اختیار کئے ہوئے تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی پارٹی کے انتخاب کروانے سے گریزاں رہا اور ایف ایس ایف کے ذریعے حکومت کرنے کو ترجیح دیتا رہا۔ "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کا نعرہ لگا کر اس نے ملتان کے زمینداروں کو رام کرنے کے لئے بیان دیا کہ وہ سوشلزم کا راستہ روکنے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ "عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں" کا نعرہ لگانے کے باوجود جب قومی اتحاد کی تحریک نے اسے گھیرے میں لے لیا تو اس نے ٹیلی ویژن پر تقریر کرتے ہوئے بظاہر زور دار لیکن شکستہ آواز میں کرسی کے بازو پر ہاتھ مار کر کہا "اگر میں کمزور ہوں تو یہ کرسی تو کمزور نہیں ہے۔" حالانکہ عوام جو حقیقی معنوں میں طاقت کا سرچشمہ ہیں اس وقت بھی اس کے ساتھ تھے اور کرسی کو مضبوط بنانے والی طاقتیں جن کی طرف وہ اشارہ کر رہا تھا اس کے خون کی پیاسی تھیں۔

اس کی مقناطیسی شخصیت کی وجہ سے انسانوں کا ایک انبوہ عظیم اس کے اردگرد جمع ہو گیا تھا۔ جیسے شہد کے چھتے پر مکھیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ چھتہ مکھیاں خود اپنی محنت اور قربانی سے بناتی ہیں' لیکن پیپلزپارٹی بھٹو کی رنگا رنگ شخصیت کا کرشمہ تھی۔

وہ بحرانی کیفیت پیدا کر کے اس سے فائدہ اٹھانے کا گر جانتا تھا۔ وہ بے بنیاد باتیں گھڑ کر بھی ان سے اپنے آپ کو تقویت دینے پر حاوی تھا۔ جیسا کہ تاشقند کے اعلان کے پیچھے راز سے پردہ اٹھانے کے متعلق وہ آخری دم تک ڈٹا رہا۔ لیکن مرتے دم تک کوئی راز ظاہر نہ کیا کیونکہ کوئی راز تھا ہی نہیں۔ وہ نہایت ہی والہانہ انداز میں پاکستان کی شاہراہوں اور گلیوں پر "ہے جمالو" اور "دما دم مست قلندر" کے ولولہ انگیز مبہم بولوں سے نئی پود کے نوجوانوں کے دلوں کو گرما سکتا تھا۔ اس کی آواز' چال اور انداز میں ایسا جادو تھا کہ صدیوں سے کچلے ہوئے' منوں پس ماندگی کے نیچے دبے ہوئے مجبور انسانوں کو سڑکوں پر یوں اٹھا لایا جیسے مائیکل جیکسن کے ایک گانے اور ناچ کی تھاپ پر مردے بھی قبرستان سے اٹھ کر ناچنے لگتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا میں ہر طرف ہوچی من کا غلغلہ تھا' چی گویرا کی داستانیں تھیں اور مغربی دنیا میں ہپی ازم چھائے جا رہی تھی۔

نئی پیداواری قوتوں نے جن نئے طبقات کو جنم دیا تھا ان کی آواز سیل بیکراں کی طرح خاموشی اور بے بسی کے بندوں کو توڑ کر ملک کے کونے کونے میں چھا جانے کے لئے بیقرار تھی۔ عین اس وقت بھٹو نمودار ہوا۔

اس کا المیہ یہ ہوا کہ جونہی اس نے خود تاشقند کا رخ کیا "سفید ہاتھی" نے اسے پاؤں تلے روند دیا۔ جبکہ اس کے جادو کا طلسم آہستہ آہستہ ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا اور یوں اسے زندہ جاوید کر دیا۔ مردہ بھٹو' زندہ بھٹو سے زیادہ طاقتور' زیادہ ہردلعزیز اور زیادہ بااثر ہو گیا۔ اس کی روح' اس کی آواز' اس کے قاتلوں کا ہر جگہ' ہر وقت پیچھا کرنے لگی اور ان کی نیندیں حرام ہو گئیں اور ان کی تمام پالیسیاں اس کی روح' اس کی آواز کے خلاف حصار بنانے کے لئے کوشاں رہنے پر مجبور ہو گئیں۔

یہ تھا وہ بھٹو جو موجودہ پاکستان کے عوام کی سب سے عظیم اور ہمہ گیر تحریک کا ان معروضی حالات میں اپنی صلاحیتوں اور زیرک نگاہی سے' اپنے سماجی پس منظر کی وجہ سے بلا شرکت غیرے رہنما بن گیا تھا۔

وہ ایک فیوڈل سوشلسٹ اور ہردلعزیز رہنما تھا۔ طاقت کا سرچشمہ عوام اس کے لئے

کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اپنے فیصلے کے خلاف ہلکی سی تنقید سننے کی بھی تاب نہ رکھتا تھا خواہ وہ جے رحیم جیسی نحیف آواز ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ہر ایسے شخص کو فوراً" فکس اپ کرنے کا حکم صادر کر دیتا تھا جو اس کے احکام کے خلاف انگلی اٹھاتا تھا۔ یہی اس کے تنزل کا باعث بنا اور آخر اسے تختہ دار تک لے گیا۔

ضیاء الحق کا طویل مارشل لاء

5- جولائی 1977ء کو انہی طاقتوں نے 1973ء کے "جمہوری آئین" کو ختم کر کے مارشل لاء کا نفاذ کر دیا جنہوں نے 1951ء میں ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں کو قتل کروایا تھا اور جنہوں نے 1954ء میں خواجہ ناظم الدین کی حکومت کا تختہ الٹ کر محمد علی بوگرا کو واشنگٹن سے درآمد کر کے وزیراعظم بنایا تھا اور ایوب خان بیک وقت فوجوں کا سربراہ اور وزیر دفاع بن گیا تھا۔ جنہوں نے 1958ء میں عین اس وقت جب 1956ء کے آئین کے تحت انتخابات کے انعقاد کی تاریخ کا اعلان ہونے والا تھا' ملک میں پہلا مارشل لاء نافذ کر دیا تھا۔

یہ طاقتیں تھیں فوجی اور سول افسر شاہی' جو برصغیر میں برطانوی سامراج کے انخلاء کے بعد پاکستان کی سماج میں سب سے منظم اور بااثر تھیں اور جنہیں عوام پر حکومت کرنے کے لئے جدید ترین تربیت دی گئی تھی اور جو سالہا سال تک برطانوی سامراج کے زر خرید ایجنٹ کے طور پر اس خطہ کے لوگوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنے کا مکروہ کام نہایت ہی خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہی تھیں۔ ان کے سب سے بڑے حلیف بڑے بڑے جاگیردار تھے جو اب سرمایہ دارانہ طریق کاشت کے میدان میں قدم رکھ رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی گماشتہ اور بڑے سرمایہ دار تھے جو پچھلے تیس سال میں پاکستانی عوام کے بے پناہ استحصال سے کافی مضبوط ہو چکے تھے۔ انہیں پاکستان کی عدلیہ کا تحفظ بھی حاصل رہا کیونکہ پاکستان کی عدلیہ بھی برطانوی سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھی اور پاکستانی عوام سے دوری اور علیحدگی اس کی جبلت میں شامل تھی اور وہ اپنے آپ کو سماج کے کرخت' کھردرے اور بھونڈے حقائق سے ماورا جنتی مخلوق سمجھتی تھی چنانچہ تمیزالدین کیس میں چیف جسٹس نے گورنر جنرل غلام محمد کے عوام دشمن اور ملک دشمن اقدام کو قانونی تحفظ دے دیا اور 25 سال بعد چیف جسٹس انوارالحق نے 1973ء کے آئین کے ہوتے ہوئے ضیاء الحق کی عوام اور پاکستان دشمن ننگی

آمریت کو نظریہ ضرورت کے تحت تحفظ دینا ضروری سمجھا۔

ان سب طاقتوں کی مددگار اور محافظ طاقت امریکی سامراج تھی جو عالمی سرمایہ داری نظام کو دوام بخشنے کے لئے ایک طرف مشرق وسطیٰ کے تیل کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا ہے اور دوسری طرف سوشلسٹ سوویت یونین کی روز افزوں اور بڑھتی ہوئی نظریاتی' سیاسی' معاشی اور فوجی طاقت کے مقابلہ کے لئے پاکستان کی سرزمین کو فوجی اڈوں اور فوجی ساز و سامان کی ترسیل اور سٹوریج کے لئے استعمال کرنا ضروری سمجھتا ہے اور اس لئے پالیسی کے طور پر پاکستان میں کسی ایسی حکومت کو برسر اقتدار نہیں دیکھ سکتا جس سے اس کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو۔ اسی وجہ سے وہ صرف فوجی آمروں کو ہی اپنا دوست اور مربی اور بااعتماد ایجنٹ سمجھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مخصوص حالات میں وہ ایک بدنام زمانہ آمر کی جگہ کسی اکوری اکینو کو بھی اقتدار پر براجمان ہونے میں مدد کر سکتا ہے لیکن پاکستان میں باوجود تمام قیاس آرائیوں کے فی الحال کوئی ایسا امکان نہیں۔

5 جولائی 1977ء کو مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان کرتے وقت ضیاء الحق' چیف آف سٹاف نے یہ کہا "میرے کوئی سیاسی عزائم نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے محض اسلام کے ایک سپاہی کے طور پر کیا ہے۔ پاکستان میں ایک عبوری حکومت قائم کر دی گئی ہے اور ملک میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کروانے کے بعد اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کر دیا جائے گا اور اس لائحہ عمل سے ہرگز انحراف نہیں کروں گا۔ انتخابات کے طریق کار کا اعلان بھی جلد ہی کر دیا جائے گا اور آئندہ تین ماہ میں انتخابات پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھوں گا۔"

5 جولائی 1977ء کو جمہوری طاقتیں باہم دست و گریبان تھیں اور ایک دوسرے سے نبرد آزما تھیں۔ بھٹو حکومت کی ناعاقبت اندیش پالیسیوں اور جمہوریت کے منافی اقدامات نے نیشنل عوامی پارٹی' جو غیر قانونی کر دیئے جانے کے بعد نیشنل ڈیمو کریٹک پارٹی کی شکل میں از سرنو کام کرنے لگی تھی اور کچھ دوسری جمہوری قوتوں اور افراد کو دائیں بازو کی نیم فاشٹ پارٹی جماعت اسلامی اور دوسری مذہبی جماعتوں کے متحدہ محاذ کی صفوں میں دھکیل دیا تھا۔

بائیں بازو کے مختلف گروہ اپنی کم مائیگی اور شرمناک کمزوری اور انتشار کے باعث الگ تھلگ کھڑے اب پھر سے متحد ہونے کے متعلق سوچ رہے تھے لیکن سیاسی صورتحال پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔ ان حالات سے ضیاء الحق نے نہایت ہی چابکدستی سے فائدہ اٹھایا اور ایسی چالیں چلیں جس سے ظاہر ہو کہ وہ بھٹو حکومت کا تختہ الٹنے کے باوجود

اس کا مداح ہے۔ چنانچہ پیپلز پارٹی کے بے شمار جیالے یہ سمجھ رہے تھے کہ چونکہ وہ بھٹو کا پروردہ ہے اس لئے حق نمک ادا کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کی حکومت کو بچانے کے لئے آگے بڑھا ہے۔

ضیاء الحق کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ سیاسی جماعتوں کو جمہوریت کی جدوجہد کے لئے متحد نہ ہونے دے اور قومی اتحاد کی پارٹیوں میں سے جو اس کے ساتھ اتحاد پر آمادہ ہو ان کی مدد لے کر انتخابات کے انعقاد کو ملتوی کر دے۔ چنانچہ اس نے پاکستان میں عوام کے سامنے اور خانہ کعبہ میں خضوع و خشوع سے تین ماہ کے اندر اندر انتخابات کروانے کے اعلان سے انحراف کرتے ہوئے "پہلے احتساب پھر انتخاب" کا سہارا لے کر انتخابات ملتوی کر دیئے۔ اور قومی اتحاد کی پارٹیوں' پگاڑا مسلم لیگ' جماعت اسلامی اور پاکستان ڈیمو کریٹک پارٹی کے نمائندوں اور کچھ "ماہرین" کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

چنانچہ بھٹو حکومت کی انتخابی دھاندلیوں کے خلاف آزادانہ' منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے لئے اور حقیقی جمہوریت کی بحالی کی مہم کے جھنڈے جھلاتی قومی اتحاد کی یہ جماعتیں آمریت کی ساجھے دار اور نقیب بن گئیں۔ پھر ان سب کی ملی بھگت سے انتخابات میں مثبت نتائج حاصل کرنے کا نعرہ لگایا گیا۔ انتخابات میں مثبت نتائج حاصل کرنے کے لئے ملک کے جمہوری انتخابی قوانین کو بدل دیا گیا اور مخلوط طریق انتخاب کی جگہ جداگانہ انتخابات کا طریقہ رائج کیا گیا اور اس طرح 1973ء کے متفقہ آئین کی جگہ نیا شوشہ کھڑا کر کے اس آئین کی بنیادوں پر دوسرا گھرا وار کیا گیا۔ اس کے علاوہ سیاسی پارٹیوں کو رجسٹر کرنے اور حکومت کو حساب کتاب پیش کرنے کا قانون بنایا گیا۔ تاکہ حکومت اپنی مرضی سے جس پارٹی کو بھی چاہے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے نااہل قرار دے سکے۔

اس دوران ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف محمد احمد خان کے قتل کا مقدمہ بنایا گیا اور مقدمہ کی طویل کارروائی کے بعد آخر 4 اپریل 1979ء کو سپریم کورٹ کے چار پنجابی ججوں کے ایک کی اکثریت سے کئے گئے فیصلے کے مطابق تختہ دار پر لٹکانے کا حکم بحال رکھ کر انتخابات میں مثبت نتائج حاصل کرنے کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔

ایک بار پھر اکتوبر 1979ء میں عام انتخابات کروانے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پگاڑا لیگ' جماعت اسلامی اور پاکستان ڈیمو کریٹک پارٹی کے نمائندے جو ضیاء الحق کی فوجی کابینہ میں شامل تھے انہوں نے یہ اعلان کر کے استعفے دے دیئے کہ جن مقاصد کے

حصول کے لئے وہ آمرانہ حکومت کے کابینہ میں شامل ہوئے ہیں' وہ حاصل ہو گئے ہیں۔ یعنی عام انتخابات کے انعقاد کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ نئے طریق کار نے بہت سی سیاسی پارٹیوں کو انتخاب میں حصہ لینے کے نااہل قرار دے دیا تھا لیکن پھر بھی فوجی حکمرانوں کے دل کا کھٹکا ختم نہ ہوا۔

وہ پارٹیاں جنہوں نے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کروا کر بزعم خود ایک بہت بڑا معرکہ سر کر لیا تھا اور اپنے لئے مثبت نتائج کا بندوبست کیا تھا ایک بار پھر ذلت سے دوچار کر دیئے گئے کیونکہ اچانک ان انتخابات کا پروگرام بھی ملتوی کر دیا گیا۔ اور بجائے سیاسی سرگرمیاں بحال کرنے کے تمام سیاسی پارٹیوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ اور ایک عبوری آئین (Provisional Constitutional Order) نافذ کر دیا گیا۔ ہائی کورٹ کے اختیارات محدود کر دیئے گئے۔ اور رہی سہی سیاسی آزادیاں بھی ختم کر دی گئیں۔ سیاسی پارٹیاں غیر قانونی قرار دے دی گئیں۔ اس حکم کے نفاذ کے بعد ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے کچھ ججوں نے استعفیٰ بھی دے دیئے حتیٰ کہ چیف جسٹس پاکستان انوارالحق بھی مستعفی ہو گئے۔ حالانکہ اسی چیف جسٹس نے بھٹو کے مقدمہ کی اپیل سننے کے دوران کارہائے نمایاں ادا کئے تھے۔

14 جون 1981ء کو مارشل لاء کا ضابطہ 51 جاری کر دیا گیا۔ جس کے ذریعے حکومتی اداروں' دفاتر' کارپوریشنوں اور دوسرے سرکاری محکموں وغیرہ میں کام کرنے والے ملازمین کے بچے کھچے ٹریڈ یونین حقوق بھی چھین لئے گئے اور ان کی معمولی سی خلاف ورزی کرنے والوں کو بھی پانچ سال قید اور کوڑوں کی سزا کا مژدہ سنایا گیا۔ اس کے بعد پی آئی اے اور کئی دوسرے اداروں سے بلاوجہ ہزاروں ٹریڈ یونین کارکنوں کو نکال دیا گیا۔

1981ء میں 1973ء کے آئین کو عملی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے ملک کا نیا سیاسی ڈھانچہ بنانے کے لئے پولیس افسر شاہی اور فوجی انٹیلی جنس کی سفارشات کی بنا پر ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی گئی اور 1982ء کے شروع میں یہ پراپیگنڈا کروایا گیا کہ ضیاء الحق ایک قومی حکومت قائم کرنے والا ہے۔ جو مجلس شوریٰ وجود میں آئی وہ پٹھوؤں' مفاد پرستوں' اور چمچوں پر مشتمل تھی۔ پارلیمنٹ کی بجائے اسے شوریٰ کا نام دیا گیا تاکہ آمریت کے حواریوں کو عوام کے سامنے اسلامی نظام کے نمائندگان کے طور پر پیش کیا جائے۔

ایم آر ڈی کے اس اعلان کے بعد کہ وہ 14- اگست 1983ء سے ضیاء الحق کی مارشل لاء حکومت کو اقتدار سے علیحدہ کرنے کے لئے بھرپور اور منظم تحریک چلائے گی ضیاء الحق نے

12- اگست 1983ء کو ایک نئے "سیاسی عمل" اور نئے سیاسی ڈھانچے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے مطابق غیر سیاسی اور غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرائے جانے کا مژدہ سنایا گیا۔ اس کے بعد پہلے نہایت ہی بھونڈے اور مضحکہ خیز طریقے سے صدر کے عہدہ کے لئے ریفرنڈم کرایا گیا۔ عوام سے پوچھا کہ "وہ پاکستان میں اسلامی نظام چاہتے ہیں؟ کوئی سات فیصد ووٹروں نے ریفرنڈم میں حصہ لیا۔ ان کا جواب "ہاں" میں تھا۔ اس پر ضیاء الحق نے اعلان کر دیا کہ ضیاء الحق پانچ سال کے لئے صدر منتخب ہو گیا ہے۔ اس کامیابی پر مبارکبادیں وصول کی گئیں۔ جب ضیاء الحق پانچ سال کے لئے یعنی 1990ء تک پکے صدر بن گئے تو غیر سیاسی اور غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کروائے گئے۔ جن کے نتیجے میں نہایت ہی کرپٹ اور بددیانت اسمبلیاں وجود میں آ گئیں۔ لوٹ مار' سمگلنگ' گروہی اور نسلی اور مذہبی منافرتوں نے عوام کو اپنے زہریلے پنجوں میں دبوچ لیا۔ ڈاکو' رہزن' مافیا ہر سو چھا گئے۔ اور عوام عدم تحفظ اور بے بسی کا شکار ہو گئے۔ افسر شاہی نے رشوت' غبن اور جعلسازی کے ریکارڈ قائم کر دیئے۔

یہ طریق انتخاب اس لئے اختیار کیا گیا کہ لوگوں میں سیاسی عمل کے سوتوں کو پھوٹنے سے روکا جا سکے۔ تاکہ لوگ خارجہ پالیسی کے متعلق خیالات نہ سن سکیں تاکہ جاگیرداری نظام کی قباحتوں اور غیر جمہوری روائتوں کے متعلق اظہار خیال لوگوں تک نہ پہنچ سکے۔ تاکہ ہر شعبہ زندگی میں بے پناہ رشوت اور انحطاط کی طرف لوگوں کا غم و غصہ نہ ابھرے۔ تاکہ نئے سرے سے کمزور ہو چکی سامراجی زنجیروں کے روز بروز مضبوط ہوتے ہوئے شکنجوں کے متعلق لوگ آگاہ نہ ہوں۔ تاکہ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی اشیائے صرف کی قیمتوں' کالجوں اور سکولوں میں بچوں کو داخلے نہ ملنے اور روز بروز مہنگی ہوتی ہوئی تعلیم و علاج' رشوت' دھاندلی' لوٹ مار اور مکانات کی قلت کے متعلق لوگ زبان نہ کھولیں۔ تاکہ مختلف وحدتوں کے حقوق اور خود اختیاری کے متعلق آواز نہ اٹھائی جا سکے۔

تاکہ لوگ ان تمام مسائل کے متعلق قومی سطح پر نہ سوچ سکیں اور قومی سطح پر کوئی لائحہ عمل مرتب نہ کر سکیں۔

بلکہ قبائلی اور جاگیرداری عہد کے پرانے دقیانوسی' رجعتی اور پس ماندہ خیالات جو پاکستان کی ترقی کے راستے میں بری طرح حائل رہے ہیں اور جن کا طلسم نئی پیداواری قوتوں کی نشوونما کی وجہ سے ٹوٹ رہا ہے' کو قائم رکھنے اور مضبوط کرنے اور مستقبل کے پانچ سالہ

خود ساختہ آفتاب کی پرستش کرنے اور اس کے زیردست رہنے کے لئے اور ملک و قوم کے اندر یک جہتی کی بجائے قبائلی عصبیتوں اور برادری ازم کی بنیادوں پر گروہی جتھے بندیوں کو مضبوط کرنے کے لئے کروائے گئے تھے۔

ان انتخابات سے یہی نتائج پیدا ہو سکتے تھے۔ ان کے ذریعے عوام کی ذہنی پس ماندگی کو مزید تقویت پہنچانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

1970ء کے انتخابات میں عوام کو جو ذہنی شعور ملا تھا اور انہوں نے ذات برادری اور جاگیرداری اثر و رسوخ اور رجعت پسند ملاؤں کے فتوؤں کو چکنا چور کر کے رکھ دیا تھا' اسے ایک بار پھر مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جن رجعتی خیالات اور گروہ بندیوں کے قلع قمع کے لئے اسلام کے نام پر پراپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے' انہیں کو آج اسمبلی میں پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

ضیاء الحق نے ایم آر ڈی کی جدوجہد کے مسلسل دباؤ' بین الاقوامی طاقتوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور پاکستان کے اندر ہر شعبہ زندگی میں بگڑتی ہوئی صورتحال کی مجبوریوں اور اپنے ذاتی اقتدار کو مزید طویل کرنے کے لئے چیف آف سٹاف کی زیر نگرانی غیر سیاسی اور غیر جماعتی جمہوریت کے نظام حکومت کو وضع کیا ہے۔ نئی اسمبلی کے وجود میں آنے سے پہلے ہی آئین میں ترامیم کر کے اسے بالکل بے دست و پا اور مجہول بنا دیا ہے۔ اور ساری طاقت کا سرچشمہ خود فرد واحد بن گیا ہے۔ 1990ء تک وہ چیف آف سٹاف بھی رہے گا اور صدر بھی۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو غیر سیاسی' غیر جماعتی انتخابات کے ذریعے وجود میں آنے والی جونیجو حکومت بھی پھلتی پھولتی رہے گی۔ حکومتی ذرائع ابلاغ کے ذریعے بار بار یہ شوشے چھوڑے جاتے رہے ہیں کہ ضیاء الحق اور جونیجو کے درمیان کش مکش بڑھ رہی ہے۔ حالانکہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ آٹھ سال تک سیاسی پارٹیوں کے وجود کے خلاف پراپیگنڈہ کرتا رہا ہے اور سیاسی جماعتوں کے وجود کو غیر اسلامی قرار دیتا رہا ہے لیکن جونہی حالات کا تقاضا ہوا ہے اس نے راتوں رات مسلم لیگ پر شب خون مار کر اپنی باندی مسلم لیگ بنا لی ہے۔ اس کے مرکزی دفتر پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ اسمبلی کی اکثریت کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنا لیڈر چنے اور پھر صدر اسے وزارت بنانے کی دعوت دے۔ بلکہ صدر جو' چیف آف آرمی سٹاف بھی ہے کو سب اختیارات حاصل ہیں کہ وہ جس کو چاہے وزارت عظمیٰ بنانے کی پیش کش کر دے اور جس وقت چاہے اسے ہٹا دے اس طرح عملی

طور پر وزیراعظم اور اسمبلی کی حیثیت اس کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہی کیفیت صوبائی اسمبلیوں کی ہے۔

اس طرح ضیاء الحق نے پہلی بار آئین میں فوج کو سیاسی کردار تفویض کر دیا ہے۔

"ایکشن فیر پلے" کے آغاز کے وقت ضیاء الحق نے 90 دن کے اندر اندر آزادانہ' منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کرانے کا اعلان کیا تھا اور پھر اسی اعلان کو خانہ کعبہ میں دہرایا تھا۔

اس نے یہ وعدہ کبھی پورا نہیں کیا۔

پھر انتخابات کے اعلان سے انحراف کرتے وقت اس نے "پہلے احتساب پھر انتخاب" کا سہارا لیا۔

لیکن اس نے بھٹو کو پھانسی دے دیا اور کوئی احتساب نہیں کیا۔

پھر دوسری بار انتخابات ملتوی کرتے وقت اس نے اسلام کے نفاذ کا نعرہ لگایا۔ لیکن مکمل طور پر بااختیار ہونے کے باوجود اس نے کوئی اسلام نافذ نہیں کیا۔

قراردلو مقاصد کو آئین کا حصہ بناتے وقت اس عوام کو باور کرانے کی کوشش کی اب اسلام کے نفاذ کے لئے تمام راستے صاف ہو گئے ہیں۔

لیکن جماعت اسلامی کے ذریعے اسمبلی میں شریعت بل پیش کروا کر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو باہم دست و گریبان کر دیا۔

1973ء کے آئین کی جمہوری روح ختم کرنے کے لئے ضیاء الحق نے مختلف ترامیم من مانے طریقے سے کی ہیں۔ جن میں سے سب سے پہلی ترمیم جداگانہ انتخابات کے متعلق تھی۔ اس ترمیم کے ذریعے اس نے پاکستانی عوام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اقلیتوں کو مسلمان عوام سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اور انہیں ایک گھٹیا درجے کے شہری قرار دے دیا ہے۔ اس ترمیم کا بنیادی مدعا یہ تھا کہ ترقی پسند اور جمہوری پارٹیاں اقلیتوں کے ووٹروں کے بل بوتے پر انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس طرح ضیاء الحق نے قائداعظم کی 11- اگست 1947ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں پہلی تقریر کی مکمل طور پر نفی کر دی ہے۔ جس میں انہوں نے فرمایا تھا۔ "تم آزاد ہو۔ تم مندروں میں جانے کے لئے آزاد ہو۔ تم اپنی مسجدوں میں جانے کے لئے آزاد ہو۔ تم کسی بھی مذہب' ذات یا مسلک سے تعلق رکھ سکتے ہو۔ اس کا ریاستی امور سے کوئی تعلق نہیں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اسے

اپنے آدرش کے طور پر سامنے رکھنا چاہئے اور تم وقت گزرنے کے ساتھ دیکھو گے ہندو' ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی نقطہ نظر سے نہیں کیونکہ وہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے۔ بلکہ سیاسی نقطہ نظر سے۔ اس ریاست کے ایک شہری کی حیثیت سے۔"

1973ء کے آئین میں نویں ترمیم کے ذریعے 1961ء کے فیملی لاز کو ترمیم کرنے کا قانون پاس کر دیا گیا ہے۔ فیملی لاز کے ذریعے پاکستان کی عورتوں کو کچھ تحفظات دیئے گئے تھے۔ انہیں واپس لینے کے لئے راستہ کھول دیا گیا ہے۔

قانون شہادت میں ترمیم کر کے اور دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر قرار دے دیا گیا ہے اور پچھلے چودہ سو سال میں جو سماجی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں اور نئے زمانے کے نئے تقاضے جو مطالبہ کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کو اس سماج میں برابری کا درجہ دیا جائے' کی نفی کر دی گئی ہے۔

جمہوریت کی روح کو بالکل ختم کرنے اور اس کی مکمل بحالی کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے کے لئے جماعت اسلامی اور چند دوسرے رجعت پسند علماء کے ذریعے اسمبلی میں شریعت بل پیش کر دیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ضیاء الحق یا اس کے جانشین صدر کے نامزد شدہ فیڈرل شریعت کورٹ کو اسمبلی اور سپریم کورٹ کے بنائے ہوئے قانون اور قانونی فیصلوں پر نظر ثانی کرنے کا اختیار ہو گا۔ اگر یہ بل پاس ہو جائے تو ایک نہایت ہی خطرناک صورت حال پیدا ہو جائے گی اور پاکستان کو ایک فاشٹ ریاست بنا دیا جائے گا۔ پاکستان میں پہلے ہی اقلیتوں کے حقوق محفوظ نظر نہیں آتے۔ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے بعد ان کے متعلق رویہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے متعلق تمام بلند بانگ دعوؤں کی نفی کی جا رہی ہے۔ فیڈرل شریعت کورٹ نے تو یہاں تک فیصلہ کر دیا ہے کہ کوئی احمدی وکیل کسی شرعی بنچ کے سامنے پیش نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اس قانون کے ذریعے فیڈرل شریعت کورٹ کو یہ اختیار حاصل ہو جائے گا (اور یہ کورٹ صدر کی نامزد شدہ ہو گی اور اس میں ملاؤں کی بالادستی ہو گی) کہ وہ کسی پالیسی کو' کسی پارٹی کو' کسی بھی اقدام کو غیر اسلامی قرار دے کر غیر قانونی' اسلام دشمن اور ملک دشمن قرار دے دے۔ اور بیسویں صدی کی آخری دہائی میں جبکہ انسان خلا میں بستیاں بنانے کے منصوبے بنا رہا ہے پاکستان میں اجتہاد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے' قرون وسطیٰ کے انداز حکمرانی

اختیار کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ یہ نہایت ہی رجعت پسند اقدام ہو گا اور پاکستانی سماج اور عوام کی جمہوری آزادیوں اور جمہوری روایتوں کے لئے زہر قاتل ہو گا۔

ضیاء الحق کے مارشل لاء کے خلاف جمہوری جدوجہد

5 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے عین اس وقت پاکستان میں تیسرا طویل ترین مارشل لاء لگا دیا جبکہ ذوالفقار علی بھٹو اور قومی اتحاد کے درمیان صبر آزما لمبی گفت و شنید کے ذریعے ملک کو درپیش آئینی اور انتخابی مسائل کے متعلق سمجھوتہ ہونے ہی والا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ مارشل لاء اس مجوزہ سمجھوتے کو فیل کرنے کے لئے لگایا گیا۔

ضیاء الحق کے مارشل لاء کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مارشل لاء کا پہلا دور 5 جولائی 1977ء سے شروع ہو کر ذوالفقار علی بھٹو کی محمد احمد خان کے مقدمہ قتل میں گرفتاری پر ختم ہو گیا۔ مارشل لاء کا یہ دور فوجی "ایکشن فیر پلے" کا بظاہر مشفقانہ دور تھا۔ اس دور میں قومی اتحاد کی پارٹیوں اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو غیر جانبدار اور منصفانہ انتخابات کے ایسے خوبصورت نعرے دیئے گئے کہ سب پارٹیاں بجائے 1973ء کے آئین کی بیخ کنی کے خلاف آواز بلند کرتیں وہ ایک فوجی آمر کے چھتر تلے انتخابات لڑنے کے لئے لنگر لگوٹے کس کر میدان میں اتر آئیں۔ اور اپنی اپنی انتخابی مہم شروع کر دی۔ عجب ستم ظریفی تھی کہ جنہوں نے جمہوریت کی بالادستی کے لئے سینکڑوں نوجوانوں کو شہید کروا دیا تھا اور جنہوں نے "منتخب جمہوری" حکومت کی بقاء کے لئے سینکڑوں نوجوان کو شہید کر دیا تھا اور جیلوں کو سیاسی قیدیوں سے بھر دیا تھا۔ وہ سبھی ایک نہایت ہی شاطر آمر کے بزور شمشیر اقتدار پر قابض ہونے کو لبیک کہہ رہے تھے اور اس کے 90 دن کے اندر اندر غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات کروانے کے جھوٹے اور پرفریب اعلان کے دام میں گرفتار ہو گئے۔ یہ رویہ ان پارٹیوں کی جمہوریت پسندی اور سیاسی بصیرت کا المناک شاہکار تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سوچا کہ ملک کے پہلے متفقہ جمہوری آئین پر جو آرے چل گئے ہیں وہ اپنے دامن میں کیا نتائج لئے ہوئے ہیں۔

ضیاء الحق نے اس دور میں نہایت ہی چابکدستی سے انتخابات کی تاریخ مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ پہلے احتساب پھر انتخاب کا شوشہ چھوڑ کر قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے درمیان اختلافات کو بروئے کار لا کر پیپلز پارٹی کی مقبولیت (جو بھٹو کے دورہ لاہور اور گول باغ میں بیگم بھٹو کے جلسہ سے منظر عام پر آئی) کا ہوا دکھا کر انتخابات ملتوی کرنے کے لئے زمین

ہموار کر لی۔

چنانچہ اس دور میں مارشل لاء کے خلاف جمہوریت کی علمبردار کسی بھی بڑی پارٹی نے نہ تو آواز بلند کی اور نہ ہی کسی قسم کی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔

مارشل لاء کا دوسرا دور بھٹو کے مقدمہ قتل میں گرفتاری سے شروع ہوا اور اکتوبر 1979ء میں سیاسی پارٹیوں کو غیر قانونی قرار دینے اور تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے پر ختم ہوا۔

اس دور میں ضیاء الحق نیا خوبصورت نعرہ لے کر اترا اور احتساب کی جگہ اسلام کے نفاذ کا نعرہ لگایا قومی اتحاد کی سیاسی پارٹیوں کو اسلام کے نفاذ کے نام پر اپنے کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی۔ اور پگاڑا مسلم لیگ' جماعت اسلامی اور پاکستان ڈیمو کریٹک پارٹی جھٹ سے اچک کر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے کابینہ میں شامل ہو گئیں۔ اس طرح ان پارٹیوں کے رہنماؤں نے اپنی جمہوریت پسندی اور اسلام پسندی کو بے نقاب کر دیا اور ثابت کر دیا کہ یہ محض اقتدار کے بھوکے لوگ ہیں اور ملک کی نہایت ہی رجعت پسند قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نواب زادہ نصراللہ خان جو جمہوریت کے بہت بڑے علمبردار مانے جاتے ہیں' بھی اس دام فریب میں گرفتار رہے۔

اس دور میں پیپلز پارٹی بیگم بھٹو کی رہنمائی میں مارشل لاء کے خلاف جدوجہد کرتی رہی۔ اور بائیں بازو کے مختلف گروہ اور پارٹیاں اور ٹریڈ یونین بھی مارشل لاء کے خلاف حتی المقدور جدوجہد کرتے رہے۔ لیکن باوجود کوششوں کے پیپلز پارٹی کی ہٹ دھرمی اور کوتاہ نظری کی وجہ سے ان کا متحدہ محاذ وجود میں نہ آ سکا۔

پیپلز پارٹی کے نوجوانوں نے خود سوزی کے مظاہرے کئے۔ لیکن وہ کوئی منظم جدوجہد ملک گیر پیمانے پر نہ کر سکے۔ پیپلز پارٹی نے اکیلے ہی بار بار مظاہرے کرنے اور تحریک چلانے کی کوشش کی لیکن عوام نے مارشل لاء کی سختیوں اور عوام میں تقسیم کی وجہ سے جدوجہد کا ساتھ نہ دیا۔

1978ء کے آخر میں ہی لاہور ہائی کورٹ کے وکلاء مارشل لاء کے خلاف آواز بلند کرنے لگے تھے اور انہوں نے 1978 کو پہلی بار 5 جولائی 1977ء کے بعد کئے گئے غیر معمولی اقدامات کو واپس لئے جانے' مارشل لاء ریگولیشنز کے خاتمے' عدالتوں کے اختیارات کی بحالی اور مارشل لاء کے قوانین کے تحت سیاسی اور ٹریڈ یونین کارکنوں کو دی گئی سزاؤں کے خلاف

قرارداد پاس کی تھی۔ 21-1-79 کو پیپلز پارٹی کے وکلاء کی ہائی کورٹ بار کی رکنیت بحال کر دی گئی جن کی رکنیت مارشل لاء کے نفاذ کے فوراً" بعد غیر جمہوری طور پر ختم کر دی گئی تھی۔ 9-4-80 کو نوڈیرو میں طلبا پر گولی چلانے کی مذمت کی گئی' 28-5-80 کو ہائی کورٹ کے رٹ کے اختیارات بحال کرنے کی قرارداد پاس کی اور 19-4-80 کو پنجاب بھر کے وکلاء کا کنونشن منعقد کیا گیا جس پر نیلا گنبد کے قریب پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور 80 کے قریب وکلاء کو گرفتار کر لیا۔ اس کنونشن اور جلوس میں حزب اختلاف کی تقریباً تمام پارٹیوں کے وکلاء شامل تھے۔ یوں مارشل لاء کے خلاف حزب اختلاف کی متحدہ تحریک نے جنم لیا۔ وکلاء نے اس کے بعد کراچی اور پشاور میں بھی کنونشن منعقد کئے گئے۔

آخر 8 فروری 1981ء کو وکلاء کی کوششیں باآور ہوئیں اور ملک کی نو سیاسی پارٹیوں نے تحریک بحالی جمہوریت کا (ایم۔ آر۔ ڈی) حسب ذیل متفقہ پروگرام کی بنیاد پر تشکیل کا اعلان کر دیا۔

1- مارشل لاء کا خاتمہ۔

2- 1973ء کے آئین کی بحالی۔

3- عام انتخابات کا انعقاد۔

4- اور پاکستان کی وفاقی اکائیوں کے حقوق کی بحالی۔

18-2-81 کو لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے ایک قرارداد کے ذریعے ایم آر ڈی کے بحالی جمہوریت کے اعلان کا پرزور الفاظ میں خیر مقدم کیا۔

22-3-81 کو مارشل لاء حکومت نے بحالی جمہوریت کی اس تحریک کو دبانے کے لئے ملک بھر میں جمہوریت کے نام لیوا تمام سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں اور وکلاء کو ایک منصوبہ بندی کے تحت گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا۔

22-3-81 کو عارضی آئین حکم (پی سی او) جاری کر دیا گیا اور ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کے ججوں کو ایک بار پھر اپنے حلف سے انحراف پر مجبور کر دیا۔ اور تمام ناپسندیدہ ججوں کو نکال دیا اور عدلیہ کے مزید اختیارات چھین لئے اب مارشل لاء کے چھوٹے سے چھوٹے افسر کا حکم پاکستان کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ میں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

26 فروری 1981ء کو بیگم بھٹو کی سرکردگی میں ایم آر ڈی کے بچے کھچے رہنماؤں کی میٹنگ لاہور میں منعقد ہوئی جس میں بیگم بھٹو نے تین مارچ 1981ء کو عام ہڑتال کا نعرہ دے

دیا حالانکہ انہیں سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہڑتال نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ ایم آر ڈی کو وجود میں آتے ہی مفلوج کر دیا گیا اور اسے ابھی منظم کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ 3 مارچ 1981ء کو ہڑتال کروانے پر تلی ہوئی تھیں شائد ان کو خیال تھا کہ دو مارچ 1981ء کو جہاز کے اغوا کے بعد تحریک ابل پڑے گی۔

ایم آر ڈی کے قیام سے پہلے بیرون ملک پناہ لینے والے پیپلز پارٹی کے نوجوانوں نے بھٹو برادرز کی رہنمائی میں پہلے لبریشن فرنٹ اور پھر الذوالفقار کی بنیاد رکھی جو ایک خبرنامے کے ذریعے پاکستان کے اندر اکا دکا بموں کے دھماکوں اور دوسری دہشت گردی کی وارداتوں کو نشر کرتے رہے۔ لیکن یہ دہشت گردی کی وارداتیں جمہوری تحریک کے لئے مزید مشکلات کا باعث بنیں اور ان گنت نوجوانوں پر بہیمانہ مظالم کا ذریعہ بن گئیں اور سینکڑوں نوجوان ملک سے باہر پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

2 مارچ 1981ء کو تین مہم جو نوجوانوں نے جو اپنے آپ کو الذوالفقار تنظیم کا رکن بتاتے تھے' نے پی آئی اے کا ایک طیارہ جس میں 100 سے زیادہ مسافر سوار تھے' اغوا کر لیا۔ اور کابل کے ہوائی اڈہ پر طارق رحیم نامی ایک فوجی سفارت کار کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔

انہی ایام میں بریگیڈیئر عثمان نے لیبیا میں ایک دہشت گرد تنظیم کی بنیاد رکھی اور اس کے نام پر کروڑوں روپے ہضم کر گئے۔ لیکن یہ تنظیم بھی کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہ دے سکی اور اس کے اکثر اراکین کچھ کئے بغیر ہی گرفتار ہو کر سزا پا گئے۔

ہوائی جہاز کے اغواء کے واقعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارشل لاء حکومت کا تشدد دوچند ہو گیا عوام میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اور مختلف جماعتوں کے رہنماؤں اور سیاسی کارکنوں میں شک و شبہات اور وسوسوں نے جنم لیا۔

ان سینکڑوں نوجوانوں نے جنہوں نے مارشل لاء کی سختیوں کے خلاف انقلابی راستہ سمجھتے ہوئے دہشت گردی کا راستہ اختیار کیا وہ یا تو بھٹو برادرز کے جاں نثار تھے اور یا پیپلز پارٹی کے الٹرا لیفٹ سوشلسٹ رہنماؤں کے پیروکار۔ ان میں سے بعض نے انفرادی بہادری اور سرفروشی کے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے اور .بعضوں نے تختہ دار کو مسکراتے ہوئے انقلابی نعرے لگاتے ہوئے چوم لیا۔ اور اس طرح پاکستان میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ ان میں سے 54 کے قریب نوجوانوں نے جن پر کوٹ لکھپت جیل میں ایک فوجی بریگیڈیئر کی عدالت میں مقدمہ کی سماعت ہو رہی تھی یہ جانتے

ہوئے کہ جس مقدمہ میں انہیں ملوث کیا گیا ہے اس کی سزا موت ہے نہایت ہی بے باکی سے اس عدالت کے خالق ضیاء الحق کی آئینی حیثیت کو چیلنج کیا اور اعلان کیا کہ غدار وہ ہے جس نے ملک کا پہلا آئین (1973ء) توڑ کر ملک و قوم سے غداری کی ہے اور وہ محب وطن نے جو اس آئین کی بحالی کے لئے جدوجہد کے میدان میں سر پر کفن باندھ کر نکلے ہیں۔

فروری 1981ء میں ملک بھر میں ایم آرڈی اور اس سے باہر کی کئی جمہوریت پسند پارٹیوں کے کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود ایم آرڈی کی پارٹیوں کے بچے کھچے رہنماؤں نے روپوشی کی حالت میں مارشل لاء کے سخت ترین دور میں جمہوری تحریک کو منظم کرنے کے لئے بے مثال جدوجہد کی اور ایم آرڈی کی تنظیم کو آگے بڑھایا۔

ایم آرڈی کے کارکنوں اور رہنماؤں کی 1981ء کے آخر میں رہائیاں شروع ہوئیں۔ اور 1982ء کے آخر تک سارے رہنما رہا ہو گئے۔ اس کے بعد ایم آرڈی نے اگست 1983ء میں ملک گیر تحریک چلانے کے لئے منصوبہ بندی شروع کر دی اور آخر 12- اگست 1983ء سے تمام پارٹیوں کے کارکنوں نے منصوبہ کے مطابق گرفتاریاں پیش کرنی شروع کر دیں۔ مارشل لاء کو چیلنج کیا گیا۔ گرفتاریاں پیش کرتے وقت جلوس نکالنے کی کوششیں کی گئیں۔ اور اس طرح جمہوری جدوجہد کو کامیاب کرنے کے لئے ہزاروں کارکن اور رہنما جیلوں میں چلے گئے۔

ایم آرڈی کی بحالی جمہوریت کی اس تحریک نے سندھ کے کئی اضلاع کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور یہ حقیقی معنوں میں ایک عوامی تحریک بن گئی۔ سندھی عوام نے جمہوری جدوجہد کے نئے باب اپنے خون سے رقم کئے۔ سندھ میں تحریک کو کچلنے کے لئے فوج کو نہایت ہی ظالمانہ طریقے سے استعمال کیا گیا۔ قرآن خوانی کرتے ہوئے شاہراہ پاکستان پر سینکڑوں نوجوانوں اور بوڑھوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ لوگوں نے نہایت بے جگری سے فوج کا مقابلہ کیا۔ اور مارشل لاء اور فوج کو چیلنج کرتے ہوئے میلوں لمبے جلوس نکالے گئے جن میں نئی کروٹ لیتی ہوئی سندھی نیشنلزم سے سرشار کسانوں اور کئی وڈیروں نے بھی حصہ لیا۔ ضیاء الحق کا منہ چڑانے کے لئے سینکڑوں گدھوں پر ضیاء الحق کا نام لکھ کر ان کی پریڈ کرائی گئی۔ ضیاء الحق کے ہیلی کاٹر پر فوج کی حفاظت میں اترنے پر بھی ہلہ بول دیا گیا جہاں سے ضیاء الحق بمشکل جان بچا کر نکلا۔ اس تحریک کے دوران سینکڑوں سندھیوں نے جان کا نذرانہ پیش کیا

حتیٰ کہ بچوں اور عورتوں نے بھی نہایت بے باکی سے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور فوج کا والہانہ انداز سے مقابلہ کیا اور کئی فوجی بھی عوام کو گولیوں کا نشانہ بناتے ہوئے عوام کے عتاب کا نشانہ بنے۔ کئی مقامات پر باقاعدہ فوج کی گولی کا گولی سے مقابلہ کیا گیا۔

بلوچستان میں بھی ایم آرڈی کی آواز پر مارشل لاء حکومت کے خلاف جلوس نکالے گئے جہاں پولیس نے گولی چلائی اور چند نوجوانوں کو شہید کر دیا۔

اس تحریک نے ضیاء الحق کے مارشل لاء حکومت کی چولیں ہلا دیں۔

ضیاء الحق نے تحریک کو شکست دینے کے لئے پیش بندی کے طور پر 12- اگست 1983ء کو اپنے نئے آئینی فارمولے کا اعلان کر دیا جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ اور تحریک کو کچلنے کے لئے ایک ہاتھ میں نیا آئینی فارمولا لئے اور دوسرے میں رائفل تھامے ہوئے بحالی جمہوریت کی اس تحریک کو خون میں ڈبو دیا۔

اور آخر 1984ء کے آخر میں ریفرنڈم کا ڈھونگ رچایا اور بعد میں غیر جماعتی اور غیر سیاسی بنیادوں پر انتخابات کروا کر اپنی حکومت کو دوام بخشنے کے لئے جونیجو حکومت کو سامنے لایا گیا۔

1983ء کی ایم آرڈی کی تحریک گو مارشل لاء ختم نہ کر سکی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کے اندر مارشل لاء کے خلاف اس تحریک نے جو کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے اور پاکستان کی جمہوری جدوجہد کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ اس تحریک کی بدولت عوام کو آج تھوڑی بہت جمہوری آزادیاں نصیب ہوئی ہیں۔ مگر ضیاء الحق جونیجو حکومت کے دور میں بھی ایم آرڈی کی یہ جمہوری جدوجہد جاری رہی۔ 1986ء کے یوم آزادی کے موقع پر ایم آرڈی کو موچی دروازہ میں جلسہ عام کرنے سے روک دیا گیا۔ اور 12- اگست کو پنجاب کے تمام رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ 14- اگست کو جب لوگ موچی دروازہ لاہور کی جلسہ گاہ کی طرف جا رہے تھے تو پولیس نے ان کا راستہ روک لیا اور لوہاری دروازہ کے قریب ان پر اندھا دھند فائرنگ کر کے بے شمار لوگوں کو زخمی کر دیا اور چند نوجوانوں کو موقع پر ہی جان بحق کر دیا۔ یہ فائرنگ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لوگوں کو قتل کرنے کے لئے کی گئی تھی کیونکہ جو نوجوان جان بحق ہوئے ان کے سروں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا اور ان کے بھیجے باہر بہنے لگے تھے۔ یہ لاشیں کس قدر بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں۔ ضیاء الحق جونیجو کی جمہوریت کی طرف پیش رفت کرنے والی غیر سیاسی، غیر جماعتی

حکومت کا یوم آزادی کے موقعہ پر پنجاب کے عوام کو یہ تحفہ دیا گیا تھا۔

موجودہ سیاسی صورتحال اور جمہوری قوتوں کی جدوجہد

موجودہ حالات میں جمہوری جدوجہد نئی صورت حال سے دوچار ہو گئی ہے پاکستانی عوام کو نئے گھمبیر مسائل نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ پاکستان کی فیڈریشن کی آزادی اور یک جہتی کو ہر چہار سو سے خطرے درپیش ہیں۔

پاکستان کی معیشت مکمل طور پر امریکی سامراج اور کثیرالاقوامی کارپوریشنوں اور کمپنیوں کے شکنجے میں ہے۔ پاکستان تقریباً پونے تین صد ارب روپے کا مقروض ہے اور پرانے قرضوں کی ادائیگی کے لئے نئے قرضے لینے پر مجبور ہے۔ کثیرالاقوامی کمپنیوں کا اکثر و بیشتر اشیائے صرف پر مکمل ملکیتی کنٹرول ہے۔ چائے، سگریٹ، مشروبات اور ادویات کا ستر سے 90 فیصدی ان کمپنیوں کی ملکیت میں ہے۔ سبز انقلاب نے اندرونی مارکیٹ کو وسیع کرنے میں مدد دی ہے اور ایسی اشیاء کی بکری کے ذریعے ملک کے کونے کونے سے پاکستانی عوام کا خون کشید کیا جا رہا ہے۔

پاکستان اپنی ضروریات کا 90 فیصدی اسلحہ امریکی سامراج اور کثیرالاقوامی کمپنیوں سے خریدنے پر مجبور ہے۔ تمام بڑی مشینیں، ٹرک، بسیں، موٹریں اور فاضل پرزہ جات سامراجی کمپنیوں سے ہی خریدے جاتے ہیں۔ ان کی قیمتیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں اور پاکستانی عوام پر بہت بوجھ ڈال رہی ہیں۔ آج سے سات سال پہلے ایک ڈالر نو روپے نوے پیسے کا تھا۔ لیکن آج پونے اٹھارہ روپے کا ہے۔ دھڑا دھڑ نوٹ چھاپ کر اور پبلک سیکٹر کی صنعتیں بیچ کر حکومت کا کاروبار چلایا جا رہا ہے۔ پاکستانی برآمدات کی قیمتیں درآمدات کے مقابلے میں نہیں بڑھ رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تجارتی خسارہ اربوں تک پہنچ گیا ہے۔ پاکستان نہ صرف امریکی سامراج کے معاشی شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہے بلکہ امریکی سامراج کی عالمی پالیسیوں کو آگے بڑھانے اور ان کی کامیابی کے لئے نئے اقدامات نے پاکستان کے لئے ایک بالکل نئی صورت حال پیدا کر دی ہے۔

ایک طرف مشرق وسطیٰ کے تیل اور شیوخ اور شاہان کی حفاظت کے لئے ایران کے خلاف امریکہ کے جنگی جہاز خلیج پر چڑھ دوڑے ہیں اور پندرہویں سولہویں صدی کے بحری قزاقوں کی طرح دھونس اور دھاندلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور ایران کے ایک جہاز کو ڈبو دیا

ہے اور دوسری طرف دوسرے مغربی ملکوں کے جنگی بیڑے بھی امریکی سامراج اور عالمی سرمایہ داری نظام کے مفادات کی حفاظت کے لئے خلیج کا رخ کر رہے ہیں۔ امریکی سامراج نے 105 دن کے لئے پاکستان کو ملنے والی امریکی امداد کو بند کر دیا ہے اور حکومت پاکستان کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ خلیج میں ضرورت پڑنے پر پاکستانی فوج کو استعمال کرنے کے لئے رضامند ہو اور افغانستان میں امریکی سامراج کی ایما اور مدد سے غیر اعلان شدہ جنگ کو جاری رکھنے کا بوجھ اٹھائے رکھے۔

مشرق وسطیٰ کے کچھ ممالک میں آج بھی پاکستانی فوج کے کرائے کے سپاہی تعینات ہیں اور عوامی تحریکوں کو کچلنے اور شیوخ کے تخت و تاج کو بچانے کے لئے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ صرف عمان میں چالیس ہزار کے لگ بھگ براہ راست بھرتی کئے ہوئے میکرانی فوجی موجود ہیں۔ سعودی عرب میں دو ڈویژن پاکستانی فوج تعینات ہے جن کی تنخواہوں کا کچھ حصہ خود پاکستانی حکومت حاصل کر رہی ہے۔

امریکی سامراج بلوچستان میں 35 کے قریب فوجی ہوائی اڈے بنانے میں مصروف ہے۔ امریکی اخبار ڈیفنس ویک کے مطابق ایسے اڈوں میں پاکستان کے ارباب اقتدار بھی بلا اجازت داخل نہیں ہو سکتے۔ اس طرح پاکستان کی آزادی اور حاکمیت اور خود اختیاری کو کھلے عام بیچا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس امریکہ کے جنگی جہاز کراچی کی بندرگاہ پر بے روک ٹوک لنگر انداز ہونے لگے ہیں۔ اس طرح پاکستانی حکومت نے امریکی سامراج کے مشروط قرضوں کے عوض یہ نیا طوق غلامی پہن لیا ہے۔ نیوزی لینڈ جیسے چھوٹے سے ملک نے بھی ایٹمی ہتھیاروں سے لیس امریکی جہازوں کو اپنی بندرگاہوں میں لنگر انداز ہونے سے روک دیا ہے۔ لیکن چونکہ ضیاء الحق امریکی قرضوں اور اس کی حمایت سے ہی قائم ہے۔ اس لئے وہ ایسے اقدامات کی مخالفت نہیں کر سکتی۔

امریکی سامراج انقلاب افغانستان کو کمزور کرنے اور سوویت یونین کی سرحد پر سامراج کی حمایتی حکومت تشکیل دینے اور سوویت یونین کی بین الاقوامی ساکھ کو خراب کرنے اور عالمی امن کے لئے کی جانے والی جدوجہد کے راستے میں روڑے اٹکانے کے لئے پاکستان کی سرزمین کو بنیاد پرست اور رجعت پسند نام نہاد مجاہدین کی تربیت اور پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے اور پاکستان کے ذریعے اسلحہ کی بہم رسانی کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ اور

پاکستان کی سرزمین سے افغانستان میں امن و امان کو تہس نہس کرنے اور سکولوں' ہسپتالوں اور مسجدوں کو تباہ کرنے کے لئے جدید ترین اسلحہ سٹنگر مزائیل' بلو پائپ مزائیل' مارٹر وغیرہ مہیا کئے جا رہے ہیں۔ اور نجیب حکومت کی امن اور ملی مصالحت کی پالیسی کو امریکی سامراج کے دباؤ کے تحت رد کیا جا رہا ہے۔

پچھلے دس سالوں میں پاکستان کی مغربی سرحدیں محفوظ نہیں رہیں۔ اور ہر لحظہ پاکستان کی یک جہتی اور آزادی خطرے سے دوچار نظر آتی ہے۔ مشرقی سرحدوں پر بھی از سرنو خطرات کے بادل منڈلانے لگے ہیں۔ ہندوستان کی حکومت کے نمائندے کئی بار حکومت پاکستان پر یہ الزام لگا چکے ہیں کہ وہ خالصتان کے حمایتی دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کو فوجی ٹریننگ دے رہے ہیں۔ پاکستان حکومت برابر اس الزام کی تردید کرتی چلی آ رہی ہے۔ لیکن حال ہی میں آزاد خالصتان کی بیرون ملک قائم ہونے والی حکومت کے ایک نام نہاد وزیر خارجہ چانن سنگھ کو پاکستان کے طول و عرض میں دورے کرنے کی کھلی چھٹی دی گئی ہے اور یہ شخص دعویٰ کر رہا ہے کہ اسے جلد ہی پاکستان کی شہریت ملنے والی ہے۔ یہ شخص پرچار کر رہا ہے کہ آزاد خالصتان اور پاکستان کو ملا کر ایک نئے ملک کی تشکیل کی جائے گی جس کا نام خالص پاکستان رکھا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کی مشرقی سرحدوں پر بھی نئے خطرات کو دعوت دی جا رہی ہے۔

یہ تمام خطرناک صورت حال ضیاء الحق حکومت کی پاکستان اور عوام دشمن خارجہ پالیسیوں اور تجارتی اور مالیاتی پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ان پالیسیوں نے اندرون ملک جمہوریت کے کمزور پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور ابھی تک اس کی بحالی اور نشوونما کے راستے میں بری طرح حائل ہے۔

پچھلے دس سال آمرانہ دور میں ایک اور گھمبیر مسئلہ' جو پہلے دبا ہوا تھا' نے پوری قوت سے سر اٹھایا ہے۔ یہ مسئلہ چھوٹی قومیتوں کی محرومیوں سے پیدا ہوا ہے۔ پاکستانی فوج کی مارشل لائی حکومتوں نے اسے شدید اور تیکھا کر دیا ہے۔ چھوٹی قومیتوں کے عوام سیاسی' سماجی اور معاشی حقوق کے فقدان کا شکار ہیں اور فوج اور نوکر شاہی جو زیادہ تر پنجاب سے تعلق رکھتی ہے' اپنے خود غرضانہ استحصالی مفادات کو قائم رکھنے کے لئے پورے امتیازی جاہ و جلال اور اندھی فوجی طاقت اور "اسلامی یک جہتی" کے نام پر اور جھوٹے اور بے سروپا پراپیگنڈے کے بل بوتے پر اپنی حکمرانی کو امریکی سامراج کی مدد اور اعانت سے دوام بخشے

ہوئے ہے۔ ملک کے پہلے منتخب وزیراعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو جو سندھ سے تعلق رکھتے تھے' چار پنجابی ججوں کے فیصلہ کے ذریعے پھانسی دینے کے عمل نے ان محرومیوں کو سندھ میں دوچند کر دیا ہے۔ اور لاکھوں سندھیوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔ 1983ء کی ایم آرڈی کی جمہوریت کی بحالی کی تحریک کے دوران انہیں جذبات نے سندھی عوام کو فوج کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے بڑی جدوجہد کے بعد ایم آرڈی نے مرکز کو چار سبجیکٹ سونپے جانے اور باقی ماندہ تمام اختیارات وفاق کی وحدتوں کو سپرد کرنے کے متعلق تجاویز کو منظور کیا ہے۔ لیکن اس پالیسی کو عوام تک نہیں پہنچایا جا رہا اور نہ ہی حکومت یا تمام سیاسی پارٹیاں اس روز بروز گہرے اور ہمہ گیر ہوتے ہوئے بحران کو حل کرنے کے لئے سر جوڑ کر بیٹھنے کو تیار ہیں۔ چھوٹی قومیتیں جمہوریت کی جدوجہد میں اپنے انہی حقوق کے حوالے سے شامل ہوتی ہیں۔ ایسی ہی وجوہات نے کراچی میں لسانی اور نسلی بنیادوں پر بار بار نہایت ہی بھیانک اور خون آشام فسادات کو جنم دیا ہے۔ یہ حالات جمہوری جدوجہد کے لئے زہر قاتل ثابت ہو رہے ہیں۔

ایسی ہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر مری قبیلے کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں پاکستان سے ہجرت کر کے افغانستان جا رہے ہیں۔ اس ہجرت کے دامن میں ہزاروں چنگاریاں سلگ رہی ہیں جو کسی وقت بھی ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گی۔

اس کے ساتھ ساتھ مختلف مذہبی فرقوں کے رہنماؤں کو بھی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ جس قدر چاہیں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلائیں۔ خاص طور پر شیعہ اور سنی فرقوں میں بعد اور باہمی نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ کہیں شیعہ منظم ہو رہے ہیں تو کہیں سپاہ صحابہ وجود میں آ گئی ہے۔ اور وہ اپنے اپنے مورچوں میں آنے والے کل کے لئے ہتھیار بند ہوئے باہمی کش مکش کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں۔

ملک کی دو بڑی سیاسی پارٹیوں' جن کے جھنڈوں پر قومی جمہوریت اور سوشلزم کے نعرہ کندہ تھے' کے رہنما اپنی اپنی پارٹی کی صفوں سے سوشلسٹوں اور ترقی پسندوں کو نکالنے کے اعلان کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ اس جمہوریت کی خود ہی نفی کر رہے ہیں' جس کے جھنڈے وہ لہرا رہے ہیں۔ اور جمہوری قوتوں کی صفوں میں بجائے اتحاد و یک جہتی کی نشوونما کے انتشار کی قوتوں کو جنم دے رہے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ترقی پسند اور جمہوری قوتوں کی صفوں سے جب بھی سوشلسٹوں

اور کمیونسٹوں کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو سوشلسٹ اور کمیونسٹ دشمن طاقتوں کا یہ عمل غیر جمہوری اور آمرانہ قوتوں کو تقویت دینے کا باعث بنا ہے اور ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں سوشلسٹوں کے خلاف جدوجہد کرنے والے عموماً امریکی سامراج کے حلقہ بگوش بن جاتے ہیں۔ آج یہ کوششیں بھی جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد کے راستے میں رکاوٹ بن رہی ہیں اور سامراج کی دوست غیر جمہوری ضیاء الحق جونیجو حکومت کو مضبوط کر رہی ہیں۔ اور جمہوری قوتوں کی صفوں میں انتشار پیدا کر رہی ہے۔

ضیاء الحق کی آمریت کے پچھلے دس سال میں جہاں تمام جمہوری اداروں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے وہاں سامراجی مفادات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ فیوڈل ازم کے ملکیتی نظام کو بھی قائم رکھا گیا ہے۔ کاشتکاری کے شعبہ میں سرمایہ دارانہ طریق کاشت پر زور دیا جا رہا ہے۔ جس سے دیہات کے پرانے فیوڈل خاندان اب سرمایہ دار فیوڈل خاندان بنتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی سیاسی طاقت ایک بار ابھر رہی ہے ضیاء الحق کی حکومت نے ملک کے سیاسی ڈھانچے کو جوں کا توں قائم رکھا ہے۔ بلکہ پبلک سیکٹر کی صنعتوں کو بیچنے کی پالیسی پر گامزن ہو کر اور پبلک سیکٹر میں نئی صنعتیں نہ لگانے کی پالیسی اپنا کر ملک میں جمہوری ترقی کو دو قدم پیچھے دھکیل دیا ہے۔ کثیرالاقوامی اجارہ دار کمپنیوں کو پاکستان میں سرمایہ لگانے کی کھلی دعوت دی جا رہی ہے اور نجی شعبے میں بڑے بڑے گماشتہ سرمایہ داروں کو سرمایہ لگانے اور استحصال کے لئے بالکل بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے۔ ٹیکسوں کا سارا بوجھ عوام پر لادا جا رہا ہے۔ دھڑا دھڑ نوٹ چھاپے جا رہے ہیں۔ افراط زر بڑھ رہا ہے قیمتیں متواتر بڑھ رہی ہیں اور وزیر خزانہ محبوب الحق کے مطابق پاکستان میں اس وقت ایک کروڑ تیس لاکھ کے قریب لوگ بیروزگار ہیں۔ تعلیم اور علاج پر نہایت ہی قلیل خرچ کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں شرح خواندگی بہت ہی کم ہے۔ اور ہزاروں لوگ بلا علاج ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں' ذرائع آمدورفت کی سہولتیں بھی عوام کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ لیکن حکمران طبقے اور افسر شاہی پاکستان کے گوشت پوست کو گدھوں کی طرح نوچ رہی ہے۔ اور تمام حکومتی محکموں میں بڑے پیمانے پر لوٹ مار جا رہی ہے۔ ہر روز اخبارات اربوں روپے کے غبن اور رشوت کے انکشاف کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں حتیٰ کہ ڈیڑھ ارب روپے کے قریب لئے گئے قرضے "بڑے آدمیوں" کو معاف کر دیئے گئے ہیں لیکن اس کے برعکس وہ غریب کاشتکار جو چھوٹے موٹے قرضے لیتے ہیں ان سے وصولی کے لئے

بے پناہ سختیاں کی جاتی ہیں۔ انہیں جیلوں میں بند کیا جاتا ہے اور ان کی جائیدادیں قرق کی جاتی ہیں۔

عوام کو دبانے اور ان کو بے بس کرنے کے لئے نت نئے قوانین بنائے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں جلد از جلد مقدمات کو نمٹانے کے لئے جو قانون بنایا گیا ہے اس نے حکومت کو بے پناہ اختیارات سونپ دیئے ہیں اور وہ ملک کے عام قانون کو بالائے طاق رکھ کر جس مقدمہ کو چاہے اس قانون کے تحت بنائی گئی عدالتوں میں منتقل کر سکتی ہے۔ اور اپنے مخالفین کو کچل سکتی ہے۔

پاکستان کا معاشی اور سیاسی ڈھانچہ سامراج کے مشروط قرضوں' بیرون ملک گئے ہوئے محنت کشوں کا کمایا ہوا پچاس ارب روپے کا زر مبادلہ' امریکی سامراج کے فوجی اور سول نوکر شاہی اور بڑے زمینداروں اور گماشتہ سرمایہ داروں کے ساتھ جمہوریت دشمن گٹھ جوڑ سے عبارت ہے۔

پاکستان میں عام آدمی کو لگاتار پراپیگنڈہ کے ذرائع ابلاغ نے یہ باور کرا دیا ہے کہ پاکستان میں وہی نظام قائم ہو گا' وہی حکومت بنے گی جس کی پشت پناہی امریکی سامراج کرے گا۔ جس کی اجازت وائٹ ہاؤس دے گا۔ اس مفروضے کو فلپائن کے واقعات نے بہت تقویت دی ہے۔ چنانچہ ہر طرف اقتدار کی دیوی کے متلاشی امریکی سامراج کے گن گاتے پھر رہے ہیں۔

ان حالات میں پاکستان میں جمہوریت کی جدوجہد کو آگے بڑھانا ہے۔ اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں اور مشکلات ہیں۔ ان مشکلات اور رکاوٹوں پر عبور حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جمہوریت کی دشمن طاقتوں کا جائزہ لیا جائے کیونکہ ان طاقتوں کو شکست دیئے بغیر جمہوریت کا قیام محض اک سراب ہے۔

پاکستان میں جمہوریت کی مخالف طاقتیں

امریکی سامراج---- پچھلے چالیس برس میں حقیقی جمہوریت قائم کرنے کے لئے جدوجہد ہو رہی ہے۔ لیکن جمہوریت کا قیام ابھی تک سراب کی مانند نظر آتا ہے۔ جونہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت کی منزل آن پہنچی' منزل اور دور ہو جاتی ہے۔

پاکستان جیسے پس ماندہ نو آبادیاتی ملک میں جمہوریت کا اس وقت تک کوئی تصور ہی نہ تھا

جب تک برطانوی سامراج سے آزادی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ دراصل محکوم ملکوں میں جمہوریت کی جدوجہد کا اولین تقاضا بدیسی سامراج کی غلامی کے خلاف جدوجہد ہوتی ہے۔ جو ملک غلام ہیں ان میں اس وقت تک حقیقی جمہوریت قائم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب تک وہ غلامی کا جوا اتار نہ پھینکیں۔ محکوم ملکوں کی آزادی بھی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ معاشی آزادی حاصل نہ کر لیں۔ ایشیا اور افریقہ کے تقریباً 100 سے زیادہ ممالک نے طویل جدوجہد اور ان گنت قربانیوں کے بعد سامراج سے سیاسی آزادی حاصل کی ہے۔ لیکن ابھی تک ان کی سیاسی آزادی خطرے میں ہے اور بالکل محدود ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ وہ معاشی آزادی حاصل نہیں کر پائے۔ وہ سامراجی شکنجوں میں ابھی تک جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کی معیشت' ثقافت اور سیاست پر بالادست سامراجی ممالک ابھی تک چھائے ہوئے ہیں۔ جہاں بھی نو آزاد پس ماندہ ممالک حقیقی آزادی اور جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں سامراج اور خاص طور پر امریکی سامراج اپنی معاشی اور فوجی طاقت کے بل بوتے پر انہیں کچلنے کے لئے چڑھ دوڑتا ہے۔ ڈو منکین ریپبلک' کیوبا' گھانا' انڈونیشیا' کانگو' ویت نام' کمپوچیا' ایران' افغانستان' گرینڈا چلی' موز میق' انگولا اور نکاراگوا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

متحدہ ہندوستان کے عوام نے ایک طویل اور عظیم جدوجہد کے بعد برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کی تھی اور پاکستان میں 14_ اگست 1947ء میں جمہوریت قائم ہوئی وہ اسی جدوجہد کا ثمر تھی۔ لیکن 1951ء کے بعد امریکی سامراج نے معاشی "امداد" اور مشروط قرضوں کی آڑ میں آہستہ آہستہ پاکستانی معیشت پر قبضہ کر لیا اور پاکستان میں متحدہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے دباؤ کی وجہ سے جو محدود جمہوریت قائم ہوئی اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ پاکستان کو بغداد پیکٹ اور پھر سیٹو اور سنٹو کے معاہدوں میں جکڑ دیا گیا اور پاکستان کی سرزمین پر امریکی سامراج نے اپنا اڈہ قائم کر لیا جس قدر سامراجی غلبہ زیادہ ہوا اسی قدر جمہوریت کمزور ہوتی چلی گئی۔

امریکی سامراج کے اشارہ پر اس کے مفادات کے حصول کے لئے حکومتوں میں اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہی اور آخر 1958ء میں ایوب خان نے مارشل لاء لگا دیا اور 1956ء کے آئین کے تحت ہونے والے انتخابات کو سابوتاژ کر دیا۔ اور چار سال بعد "بنیادی جمہوریت" کی بنیاد رکھ دی۔ ان تمام اقدامات میں اسے امریکی سامراج کی مکمل حمایت حاصل رہی۔ اور

پاکستان مکمل طور پر امریکی سامراج کا طفیلی ملک بن گیا۔ امریکی سامراجی ذرائع ابلاغ نے پاکستان میں امریکی "امداد" اور مشروط قرضوں کی وجہ سے برپا ہونے والے سبز انقلاب کو دنیا بھر کے پس ماندہ ممالک کے لئے ایک نمونے کے طور پر پیش کرتے رہے۔

1962ء میں بڑابیر سے اڑنے والے جاسوسی جہاز یوٹو کو سوویت یونین میں مار گرایا۔ اس واقعہ نے پاکستان کے سیاسی حلقوں کو چونکا دیا اور امریکی سامراج کی بالادستی کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔

1965ء کی جنگ کے دوران امریکی سامراج کی پاکستان کے ساتھ دوستی کی قلعی کھل گئی۔ امریکی سامراج نے پاکستان کو فاضل پرزے اور اسلحہ دینا بند کر دیا۔ اس وجہ سے پاکستان کے طول و عرض میں امریکی سامراج کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور تاشقند کانفرنس کے بعد امریکی سامراج کا اثر و رسوخ کم ہونے لگا۔

ایک بار پھر 1977ء میں بھٹو حکومت کا تختہ الٹے جانے کے بعد امریکی سامراج نے ضیاء الحق کی مدد سے پاکستان پر یلغار کر دی۔ ایران اور افغانستان کے انقلاب کے بعد پہلے 301 بلین ڈالر اور پھر 402 بلین ڈالر کے مشروط قرضے پاکستان میں ضیاء الحق کی آمرانہ حکومت کو قائم رکھنے کے لئے منظور کئے۔ افغانستان میں امریکی مفادات کی حفاظت اور آبیاری کے لئے پاکستان کے ذریعے "مجاہدین" کو ہتھیاروں کی سپلائی کی جانے لگی۔ ایٹمی ہتھیاروں والے امریکی جنگی جہاز کراچی کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہونے لگے۔ بلوچستان میں 35 کے قریب ہوائی اڈے تعمیر کئے جانے لگے اور گوادر کی بندرگاہ کے قریب ایسا اڈہ تعمیر کیا جانے لگا جس میں پاکستانیوں کا داخلہ بھی بڑابیر کی طرح ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ پچھلے دس سال میں امریکہ سامراج کی مدد سے ہی ضیاء الحق حکومت قائم چلی آ رہی ہے۔

لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء الحق کی دس سالہ حکومت کے جابرانہ دور کی وجہ سے اس نظام کے خلاف پیدا ہونے والی بے چینی کے پیش نظر وہ ایک نیا پینترا بدلنے کی راہ پر گامزن ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔ فلپائن میں جنرل مارکوس کو ہٹا کر اکوری اکینو کی حکومت کے قیام میں امریکی حکومت نے بھرپور مدد کی تاکہ امریکہ کے بحری جنگی اڈے فلپائن کی سرزمین پر قائم رکھے جا سکیں اور فلپائن میں جمہوریت اور آزادی کا بھرم بھی قائم رہے۔

پاکستان میں بھی یہ قیاس آرائیاں عام ہیں کہ اب اس سفید ہاتھی کی نظریں جس نے بھٹو کو پاؤں تلے روند دیا تھا اس کی ہردلعزیز دختر بے نظیر پر گڑی ہوئی ہیں۔ یہ ایک عظیم

المیہ ہے کہ برصغیر کی موجودہ دور میں سب سے ہردلعزیز پارٹی جس کی صفوں میں لاکھوں عوام امریکی سامراج کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اب امریکی سامراج کی مدد سے اقتدار حاصل کرنے کی امید میں سامراج دشمن جذبات کو ٹھنڈا کر رہی ہے۔ جب اصغر خان کابل میں ڈاکٹر نجیب سے ملاقات کر رہا تھا اور مولانا کوثر نیازی سوویت یونین کے دورے کے لئے جانے کی تیاری میں مصروف تھا بے نظیر اسلام آباد میں امریکی سفیر سے ملاقات کر رہی تھی۔ وہ بے نظیر جو 10- اپریل 1986ء میں وطن واپسی پر لاکھوں لوگوں کے ہجوم سے خطاب کرتی ہوئی اکیلے ہی خزاں میں انتخاب کروانے کا مطالبہ کر رہی تھی اس مطالبہ سے دستبردار ہو کر 1990ء تک انتخابات کے لئے انتظار کرنے کا پرچار کر رہی ہے اور اس کے ترقی پسند جواری عوام کو یہ باور کرانے پر لگے ہوئے ہیں کہ بھٹو کی پھانسی کے پیچھے امریکی سامراج کا کوئی ہاتھ نظر نہیں آیا اور جو نظر آیا ہے وہ امریکی صدر کی بھٹو کی جان بخشی کے لئے کئے جانے والی اپیل ہے۔ اس طرح امریکی سامراج پاکستان میں اپنے اثر و رسوخ کو قائم رکھنے کے لئے اپنی نئی حکمت عملی پر بظاہر عمل کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ لیکن یہ معاملہ اتنا بھی سادہ نہیں ہے۔ امریکی سامراج کو اس خطہ میں استعمال کے لئے پاکستانی فوج کی ضرورت ہے۔ اس لئے اس کی مرضی کے بغیر کوئی دوسری حکومت بننا بعید از قیاس ہے۔

حال ہی میں ایک خبر کے مطابق امریکی سامراج نے پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور اپنے تابع مہمل بنانے اور اپنی پسندیدہ پارٹی کی حکومت بنانے کے لئے سی آئی اے کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں منتقل کر دیا ہے۔

ان حالات میں پاکستان میں جمہوریت کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ امریکی سامراج کے خلاف پہلے سے بھی زیادہ مستعد طریقے سے جدوجہد کی جائے۔ کیونکہ اپنے مفادات کے حصول کے لئے امریکی سامراج جمہوریت کا سب سے بڑا اور قاتل دشمن ہے۔

جاگیرداری نظام

برطانوی سامراج نے جب ہندوستان پر غلبہ حاصل کیا تو اس نے اپنے تجارتی اور استحصالی مفادات کے لئے پرانے خود کفیل دیہی نظام کو ختم کر دیا اور ہندوستان کی معیشت کو برطانوی سامراجی معیشت کی ماتحتی میں دے دیا اور اپنی لوٹ مار اور استحصال کو دوچند کرنے کے لئے ایک طرف تو اس نے راجاؤں اور نوابوں کا سہارا لیا اور دوسری طرف بڑے بڑے

جاگیردار پیدا کئے اور انہیں ہزاروں لاکھوں ایکڑ زمین بخش دی۔ اور ان کا عوام پر رعب اور دبدبہ قائم رکھنے کے لئے آنریری مجسٹریٹ ذیلدار اور سفید پوش بنایا گیا۔ ان کے بچوں کو فوج اور سول سروس میں افسر بھرتی کیا گیا۔ چنانچہ ان کے مفادات بحیثیت ایک طبقے کے برطانوی سامراجی مفادات کے ساتھ مدغم ہو گئے اور وہ برطانوی سامراج کی امداد اور اپنے عوام کی اندھی لوٹ مار کے سہارے جینے لگے۔ چنانچہ وہ ہندوستان کی آزادی اور جمہوریت کے خلاف اس وقت تک سینہ سپر رہے جب تک انہیں یقین نہ ہو گیا کہ ان کا آقا برطانوی سامراج چند دنوں کا مہمان ہے۔

ہندوستان کی سیاسی آزادی اور جمہوری مراعات ہندوستان کے سرمایہ دار طبقہ کی رہنمائی میں حاصل ہوئیں۔ جو بیک وقت برطانوی سامراج سے آزادی بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کا استحصالی کردار بھی خود سنبھالنا چاہتا تھا اور محنت کشوں کی بڑھتی ہوئی یلغار کے پیش نظر سامراج سے سمجھوتہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو یہ ان علاقوں پر مشتمل تھا جو صنعتی طور پر نہایت ہی پس ماندہ تھا اور آبادی کا تقریباً 95 فیصدی حصہ دیہات میں رہتا تھا۔ ان حالات میں تمام معیشت اور سیاست پر جاگیردار چھائے ہوئے تھے۔ وہ ان جمہوری اداروں سے خوف زدہ تھے جو انہیں متحدہ ہندوستان کی تحریک آزادی سے ورثے میں ملے تھے کیونکہ ان اداروں کے ذریعے ان کے بے پناہ اختیارات اور طاقت اور دبدبے کو چیلنج کیا جا سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 1956ء تک حیلے بہانوں سے ملکی آئین ہی نہ بننے دیا اور 1958ء تک ملک میں مرکزی پارلیمنٹ کے انتخابات نہ ہونے دیئے۔ اور 1947ء سے ہی سامراجی عہد کے تمام استبدادی اور غیر جمہوری قوانین (پبلک سیفٹی ایکٹ، بنگال ریگولیشن اور سکیورٹی ایکٹ) روز افزوں جمہوری تحریک کے خلاف بے دریغ استعمال کرتے رہے۔ حتیٰ کہ 1958ء میں مارشل لاء کا نفاذ کر دیا گیا۔ 58-1947ء تک پاکستان میں جو لنگڑی لولی جمہوریت قائم رہی وہ دراصل برسر اقتدار طبقوں۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور فوجی اور سول افسروں کے رحم و کرم پر تھی اور انہیں کے مفادات کی حفاظت کرتی تھی۔ اور عوام کی عظیم اکثریت مزدوروں، کسانوں، درمیانے طبقے اور دانشوروں اور طلباء کے مفادات کے خلاف کام کرتی تھی۔ گو کاغذی طور پر عوام اور اللہ کی حاکمیت تسلیم کی گئی تھی لیکن عملی طور پر عوام کا حکومت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس دور میں جتنے بھی قوانین بنے ان میں سے اکثر انہیں طبقات کے مفادات کی حفاظت کے لئے بنائے گئے اور اگر کوئی قانون عوام کے دباؤ کی

وجہ سے محنت کشوں اور کسانوں کے حق میں بنانے کا اعلان بھی کیا گیا تو محض ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اور اپنے آپ کو ترقی پسند اور عوام دوست ثابت کرنے کے لئے بنایا گیا۔ جیسا کہ دولتانہ کی زرعی اصلاحات سے ظاہر ہے۔ جن کے ذریعے مزارعین کی مزارعت کے تحفظ کے لئے نہایت ہی چھوٹا سا قدم اٹھایا گیا تھا۔ لیکن جاگیردار طبقہ نے اس قانون پر بھی عمل نہیں ہونے دیا۔ اور افسر شاہی کے گٹھ جوڑ سے اسے فیل کر دیا۔

اس دور میں امریکی سامراج کی مدد اور اعانت سے یکے بعد دیگرے چھ حکومتیں جاگیرداروں، فوجی اور سول افسروں اور نوخیز تجارتی سرمایہ داروں کی باہمی کش مکش اور محلاتی سازشوں کے ذریعے وجود میں آئیں اور ختم ہو گئیں۔ لیکن کبھی بھی عوام کو اپنے نمائندے چننے کا موقع نہ دیا گیا۔ اور ان سے کبھی نہ پوچھا گیا وہ کیسی حکومت چاہتے ہیں اور کس کی حکومت چاہتے ہیں حالانکہ کاغذی طور پر وہی عوام حاکم تھے۔ حتیٰ کہ جب 1956ء کے آئین کے تحت انتخابات ناگزیر ہو گئے تو 1958ء میں ایوب خان نے مارشل لاء لگا دیا اور اس طرح جاگیرداروں اور نوخیز تجارتی سرمایہ داروں پر فوجی اور سول نوکر شاہی نے مکمل بالا دستی حاصل کر لی۔

بڑے بڑے جاگیردار افسر شاہی کے جونیئر حصہ دار بن گئے اور آمریت کی تقویت کا باعث بنے۔ سبز انقلاب کی برکتوں سے اب یہی جاگیردار سرمایہ دار جاگیردار بنتے جا رہے ہیں۔ لیکن ان کے کردار میں یہ تبدیلی انہیں جمہوریت کا موافق نہیں بنا سکی۔ اس لئے پاکستان میں جمہوریت کے قیام کے لئے امریکی سامراج کے ساتھ ساتھ جاگیرداری نظام کے خاتمے کے لئے جدوجہد ضروری ہے۔

اجارہ دار اور گماشتہ سرمایہ دار

پاکستان کے اندر پرانی طرز کی جمہوریت کو جسے سامراج دشمن تحریک نے اپنے خون سے سینچا تھا، ختم کرنے والی دوسری بڑی طاقت اجارہ دار سرمایہ داروں اور گماشتہ سرمایہ داروں کی ہے۔ پاکستان کے قیام کے وقت سرمایہ دار طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ متروکہ جائیداد کی لوٹ مار اور کوریا کی جنگ نے تجارتی سرمایہ داری کی نشوونما میں بہت مدد کی اور تجارتی سرمایہ دار اپنے آپ کو مزید مضبوط بنانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ ان تجارتی سرمایہ داروں کی مزید نشوونما کے لئے امریکی سامراج ہی مدد کر سکتا تھا۔ کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد

دوسری سرمایہ دار طاقتیں یا تو مکمل طور پر شکست کھا چکی تھیں اور یا جنگ کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ سرمایہ داری نظام کی ترقی کے راستے میں جاگیرداری نظام حائل تھا لیکن جاگیردار انگریز کی پروردہ افسر شاہی کے دست بستہ غلام چلے آ رہے تھے اور افسر شاہی دن بدن حکومت کا سارا کاروبار سنبھالتی جا رہی تھی اور اس کے نمائندے غلام محمد' اسکندر مرزا' ایوب خان وغیرہ جلد از جلد امریکی سامراج کی حلقہ بگوشی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ملک کا پہلا وزیراعظم جو خود امریکہ کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا اسی سازشی افسر شاہی کا شکار ہوا۔ ناظم الدین کی حکومت بنی تو وہ بھی اسی سامراج دوست افسر شاہی نے ختم کر دی۔ 1958ء تک تجارتی سرمایہ دار مضبوط ہو کر صنعتی سرمایہ داری کے دور میں داخل ہو چکے تھے نئے نئے بنک کھل رہے تھے۔ انشورنس کمپنیاں بن رہی تھیں۔ ٹیکسٹائل کی صنعت ترقی کر رہی تھی۔ 1958ء میں ایوب خان نے جب مارشل لاء لگایا تو یہ نئے ابھرتے ہوئے سرمایہ دار ایک پائیدار اور مضبوط حکومت کے اپنے مفادات کے لئے ہمنوا اور مددگار بن گئے اور ایوب خاں کے آمرانہ دور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کے 85 فیصدی اثاثوں پر بائیس خاندان قابض ہو گئے۔ آمریت میں ان کے استحکام اور ترقی کا راز مضمر تھا۔ لہٰذا وہ اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے جمہوریت کی مخالف صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ حالانکہ عالمی جمہوری دور کے آغاز میں سرمایہ دار طبقہ ہی اس کا رہبر اور رہنما تھا اور ہمسایہ ملک بھارت میں بھی سرمایہ داروں کی رہنمائی میں ہی جمہوریت کا قیام عمل میں آیا لیکن چونکہ پاکستان کا بڑا اور اجارہ دار سرمایہ دار طبقہ امریکی امداد اور امریکی قرضوں کا مرہون منت تھا اور پاکستانی سماج کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوا تھا اس لئے اس کی جڑیں عوام میں نہ تھیں جن پالیسیوں نے ان 22 خاندانوں کو جنم دیا انہوں نے 1970ء تک ملک کو 1700 کروڑ روپے کا مقروض کر دیا تھا اور پاکستان کو ہر سال 100 کروڑ روپے بطور سود کے ادا کرنے پڑ رہے تھے۔ یہ قرضے آج بڑھ کر 12 بلین ڈالر کے قریب پہنچ گئے ہیں (اس وقت ایک ڈالر برابر ہے 17 روپے 60 پیسے کے) اور ہر سال پاکستان کو ایک ارب ڈالر قسط اور سود وغیرہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی صورت حال پاکستان میں جمہوریت کو پنپنے نہیں دیتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ جمہوریت کے قیام کے لئے اجارہ دار گماشتہ سرمایہ داری کے خلاف بھی جدوجہد کو منظم کیا جائے۔

افسر شاہی

قیام پاکستان کے وقت جن علاقوں پر یہ ملک مشتمل تھا وہ نہایت ہی پس ماندہ علاقے

تھے۔ صنعتی ترقی برائے نام تھی اور جاگیرداری نظام کا ہر طرف بول بالا تھا۔ ایک طرف بڑے بڑے دقیانوسی اور رجعت پسند جاگیردار تھے لیکن دوسری طرف برطانوی سامراج کی انتظامی اور فوجی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آنے والی چاک و چوبند افسر شاہی (فوجی اور سول) موجود تھی۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے وقت جاگیردار طبقہ کے سرکردہ افراد عام رواج کے مطابق ہر مہینے کمشنروں' ڈپٹی کمشنروں اور دوسرے افسروں کی خوشنودی کے لئے ڈالیاں لئے قطاروں میں کھڑے شرف ملاقات کے لئے انتظار کرتے تھے۔ گو افسر شاہی کو انگریزی میں (Public Servant) یعنی عوام کا خادم کہا جاتا تھا لیکن حقیقت میں وہ عوام کے حاکم تھے۔ اور ان کی تربیت عوام کی خدمت کے لئے نہیں کی جاتی تھی بلکہ انہیں عوام پر حاکمیت کے طور طریقے سکھائے جاتے تھے اور ان کی ساری ذہانت' ساری مہارت انگریزی سرکار کے راج کو دوام بخشنے کے لئے صرف ہوتی تھی۔ عرف عام میں انہیں "صاحب" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

آزادی کے بعد اقتدار میں آنے والے مسلم لیگی رہنماؤں میں سے سوائے چند ایک کے باقی سب ان کے حلقہ بگوش تھے اور کل تک انہیں ڈالیاں پیش کرنے والوں کی صفوں میں شامل تھے۔ فیوڈل ہونے کی بنا پر خود جاگیردار حکمرانوں کا کردار اپنے طبقے کے مفاد کے لحاظ سے جمہوریت مخالف تھا۔ انگریز کے جانے کے بعد افسر شاہی اپنے آپ کو بہت برتر انسان اور ماورا مخلوق سمجھتی تھی۔ اور نعرے مارنے والے' جلوس نکالنے والے' جینے کا حق مانگنے والے' انسانوں کی عزت و ناموس کی بحالی کے لئے آواز اٹھانے والے اور آزادی کا مطالبہ کرنے والے لوگ ان کی نظروں میں شرپسند بدمعاش اور ناپسندیدہ اشخاص تھے۔

چنانچہ اس افسر شاہی نے بجائے عوام کی خدمت کا راستہ اختیار کرنے اور انگریز سے گلو خلاصی کے بعد عوام کے جمہوری حقوق کی آبیاری کرنے کے اپنی حاکمیت کو دو چند کر دیا۔ اور اپنی جدید تربیت اور علم و مہارت کے ذریعے جاگیردار حکمرانوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچانے لگے اور آخر 1954ء میں مسلم لیگی حکومت کو توڑ پھوڑ کر کے افسر شاہی کی بالادستی قائم کر دی۔ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو ڈسمس کر دیا گیا۔ ایوب خان کو افواج پاکستان کا کمانڈر انچیف ہوتے ہوئے وزیر دفاع بنا دیا اور پہلے مسلم لیگ اور پھر بعد میں ری پبلکن پارٹی کو اپنی باندی بنا لیا اور آخر 1958ء میں جب 1956ء کے آئین کے تحت انتخابات ناگزیر ہو گئے فوجی افسر شاہی نے عنان حکومت امریکی سامراج کی اعانت اور مدد سے خود سنبھال لی

اور یوں ٹوٹے پھوٹے جمہوری اداروں کو بالکل ختم کر دیا۔ اور ملک اور حکومت پر فوج کی مکمل بالادستی قائم ہو گئی۔ 1958ء سے آج تک باوجودیکہ 69-1968ء کی عظیم جمہوری تحریک نے پاکستان کے طول و عرض میں جمہوری خیالات کو بہت پھیلایا اور مضبوط کیا لیکن پھر بھی فوجی اور سول افسر شاہی کی بالادستی کے سائے ہمیشہ چھائے رہے۔ حتیٰ کہ بھٹو جیسے دلعزیز رہنما اور پیپلز پارٹی جیسی ہردلعزیز پارٹی کی حکومت کے دوران بھی یہی افسر شاہی پس پردہ حکمران رہی اور آخر 5 جولائی 1977ء کو فوجی افسر شاہی نے ملک کے پہلے جمہوری آئین کو روندتے ہوئے مارشل لاء کی طویل ترین حکومت قائم کر دی اور تمام جمہوری اداروں کو تہس۔نہس کر دیا اور تمام ذرائع ابلاغ کو یہ ثابت کرنے پر معمور کر دیا کہ جمہوریت اسلام کے خلاف ہے' پاکستانی عوام کے ذہنوں کے خلاف ہے اور پاکستانی ریاست کی آزادی اور یک جہتی کے منافی ہے۔ اسی فوجی اور سول افسر شاہی کی ملی بھگت نے 1985ء میں اپنی ماتحتی میں نئے سویلین نظام کو قائم کیا ہے جس میں غیر جماعتی' غیر سیاسی انتخابات کروا کر حکومت کی تشکیل کے بعد مسلم لیگ جماعت کو اپنی کٹھ پتلی کے طور پر کھڑا کیا ہے جو حکومتی اقتدار کے بغیر چار دن بھی نہیں چل سکتی۔ اس مسلم لیگی حکومت کا یہ عالم ہے کہ پنجاب کا وزیراعلیٰ اپنے مستقبل کے مفادات کو محفوظ کرنے کے لئے ایک پولیس افسر کی ترقی کے بعد اس کے دفتر میں جا کر حاضری دیتا ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کرتا ہے۔

اس دور میں افسر شاہی نے حکومت کے ہر شعبے میں رشوت اور لوٹ مار کو اپنی پالیسی کا بنیادی پتھر بنا لیا ہے۔ پچھلے دس سال میں یہ افسر شاہی زمینوں' پلاٹوں' فیکٹریوں اور تجارتی اداروں وغیرہ کی مالک بن گئی ہے اور پبلک سیکٹر کی صنعتوں' محکموں اور عوام کی جیبوں پر دن دیہاڑے ڈاکے ڈالنا معمول بن گیا ہے اور اپنی اور حکومت کی بقاء کے لئے امریکی سامراج سے گہرا رشتہ قائم کر لیا ہے فوجی اور سول افسر شاہی کی ان پالیسیاں نے ملک کے اندر گونا گوں مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ مشرق و مغرب اور شمال میں ہماری سرحدوں پر خون آشوب خطرات منڈلا رہے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں بموں کے دھماکوں سے انسانوں کی تکا بوٹی ہو رہی ہے۔ کراچی میں نسل کی بنیاد پر مسلمان مسلمان کی گردن پر چھریاں چلا رہے ہیں ملک کی چھوٹی قومیتوں کی وحدتوں میں محرومی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ پاکستان فیڈریشن کی بنیادیں ہل رہی ہیں سندھ میں کمشنروں' بڑے بڑے سیٹھوں اور عوام کو دن دیہاڑے ڈاکو اغوا کر رہے ہیں اور لاکھوں روپیہ تاوان دے کر ان سے رہائیاں حاصل کی جا رہی ہیں۔ اس

مال غنیمت کی تقسیم میں افسر شاہی بھی شریک ہے۔ ان حالات میں یہ فوجی اور سول افسر شاہی جمہوری جدوجہد کو کچلنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے اس لئے جمہوری جدوجہد کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس فوجی اور سول افسر شاہی کے سامراج' جاگیرداروں اور گماشتہ سرمایہ داروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے خلاف بھی جدوجہد کی جائے۔

ہم نے "جمہوریت کا واحد راستہ" کے آخر میں جمہوریت کی دشمن طاقتوں کی نشاندہی کی ہے۔ جمہوریت کی دوست طاقتوں کون سی ہیں' اور انہیں جمہوریت کے قیام کے لئے سیاسی جدوجہد کی کون سی حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے۔ جدوجہد کے طریقے' کام اور تنظیم کے طریقے کونسے اختیار کرنے چاہئیں اور پاکستان کے مخصوص حالات میں اس تحریک کو کیسے منظم کرنا چاہئے اور اس تحریک کے نعرے کیا ہونے چاہئیں؟ وغیرہ سوالات کو ہم علیحدہ کتابچے میں پیش کریں گے۔

ان سطور کے لکھے جانے کے چند سال بعد بین الاقوامی سرمایہ داری نظام کی ریشہ دوانیوں' سازشوں اور 7 ٹریلین ڈالر کی کثیر رقم خرچ کر کے سوویت یونین کے نظام کو وسیع پیمانے پر پیدا ہونے والی بااثر بیوروکریسی اور گورباچوف اور یلسن جیسے غداروں کی مدد سے بالکل تہ و بالا کر دیا ہے۔ اور وہ عظیم سوویت یونین جو غریب عوام اور محکوم ملکوں کے لئے روشنی کا مینار تھا اسے تباہی اور بربادی سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ آج اس ملک میں جہاں بے روزگاری 1929ء میں ختم کر دی گئی تھی' جہاں ہر بچے کو تعلیم مہیا کی گئی تھی' جہاں مفت علاج کا بندوبست کیا گیا تھا بے سروسامانی' غربت اور افلاس سے دوچار ہے۔ اور ہر طرف بدمعاشوں اور ظالموں اور لٹیروں کے گروہوں کے مافیا پیدا ہو گئے ہیں جو کھلے بندوں عوام کو لوٹ رہے ہیں اور انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔ نئی سرمایہ داری کے نظام کی مضبوطی کے لئے وہ چینی قومیت کو ان کے تیل کی دولت کو ہتھیانے کے لئے تہ و بالا کر رہا ہے اور بین الاقوامی سطح پر سرمایہ داری نظام کا سرغنہ امریکہ دندناتا پھر رہا ہے۔ وہ عراق جیسے نہتے اور چھوٹے ملکوں پر ہزارہا ٹن بم برسا کر تباہیاں مچا رہا ہے اور بے قصور لوگوں کا خون بہا رہا ہے اور ان کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ عراق نے کچھ طاقتور ہتھیار چھپا رکھے ہیں جس سے دنیا کو خطرہ ہے۔ حالانکہ خود امریکہ نے ایٹم بموں کے انبار لگا رکھے ہیں اور لیزر ریز اور کئی دوسری ٹیکنالوجیوں پر عبور حاصل کر کے دنیا کی جان کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ امریکہ واحد ملک ہے جس نے ایٹم بموں کا استعمال کیا اور ناگا ساکی

اور ہیروشیما کے شہریوں کو ہزاروں کی تعداد میں پلک جھپکتے میں بھسم کر دیا۔

لیکن بار بار تباہ کن بمباری کر کے وہ عراق کو سر نہیں کر سکا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد بھی کیوبا' شمالی کوریا' ویت نام اور چین جیسے ممالک سوشلزم کی تعمیر میں اپنے اپنے حالات کے مطابق جدوجہد میں مصروف ہیں۔ سوویت یونین کے اندر بھی کیمونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیاں پرانی لیڈرشپ کی غلطیوں اور کج رویوں سے سیکھ کر آگے بڑھ رہی ہیں کہ امریکی سامراج ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے اب چین کو بھی اندر سے کھوکھلا کر کے تہ و بالا کرنے کے راستے اختیار کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس وقت تک تو چینی رہنما ان خطرات سے آگاہ ہیں' اور وہ کسی صورت میں بھی کیمونسٹ پارٹی کی تنظیم ختم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگر وہ اپنے ان ارادوں پر قائم رہیں اور اندرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں پر قابو پائے رکھیں تو یقیناً چین 2010 عیسوی تک ہر لحاظ سے سوشلزم کے راستے پر گامزن طاقت بن جائے گا۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے دنیا میں 1/6 حصہ پر سوشلزم کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اسی حقیقت سے عالمی سرمایہ داری نظام کانپ رہا تھا۔ آج تو 1/4 حصہ سے زائد دنیا میں سوشلزم کی تعمیر جاری ہے اور دوسرے بے شمار ملکوں میں بدلے ہوئے حالات میں ترقی پسند کارکن نئے طور طریقوں سے جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہر ترقی پسند قاری کے لئے یقیناً یہ حالات نہایت ہی تکلیف دہ ہیں۔ اور وہ یورپ میں سوشلسٹ ریاستوں کی اس اچانک شکست سے سخت دل برداشتہ اور پست ہمت ہوا ہے۔ سطحی سوچ رکھنے والے تو مایوسی کے عالم میں جدید ترین ٹیکنالوجی کی چکا چوند کر دینے والی نت نئی ایجادوں کے گرداب میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ اور عالمی سرمایہ داری نظام کے گلوبلائزیشن کے بھنور میں غوطہ زن ہیں۔ لیکن چند ہی سالوں میں عالمی سرمایہ داری نظام کے اندر بحرانی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ اور سرمایہ داری کے عالموں کے تمام مفروضے ایک ایک کر کے شکست سے دوچار ہو رہے ہیں۔ اور نج کاری کی تمام کامیابیاں زنگ آلود ہو کر ڈوب رہی ہیں۔ اور امریکی سامراج کے نئے عالمی نظام کی ایک طاقتی دنیا ختم ہو رہی ہے اور اس کے مد مقابل چین جبکہ دوسری سرمایہ دار ریاست بھی اپنے مفادات کے لئے کمربستہ ہو رہی ہے۔ انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ داری نظام کی مضبوطی اور مزید نشوونما کے لئے پروگرام بنانے کے لئے امریکی شہر سیٹل میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس کو منظم مزدوروں اور دوسری ترقی پسند

تنظیموں نے زبردست مظاہرے کر کے نہ صرف فیل کر دیا ہے بلکہ اس کا انعقاد ہی مشکل بنا دیا ہے۔ یہ واقعہ سرمایہ داری نظام کے خاتمے کے لئے نئے اشارے دے رہا ہے۔

سوویت یونین اور مشرقی یورپ کی ریاستوں میں سوشلزم کی شکست کے اسباب اور سوشلزم کے مستقبل کے متعلق ایک علیحدہ کتاب لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ جسے ہم پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس مضمون کو ایک ترقی پسند کالم نویس منو بھائی کے اس کالم کا من و عن دے کر جو انہوں نے 20 اگست 1998ء کے روزنامہ جنگ میں "وہ جو روس ہوتا تھا" کے عنوان سے لکھا پر ختم کرتے ہیں۔

وہ جو روس ہوتا تھا

ابھی چند سال پہلے تک دنیا کی دوسری "سپرپاور" کے مرکزی شہر ماسکو کے ہوائی اڈے پر ہمیں لندن کی فلائٹ حاصل کرنے کے لئے تین گھنٹے انتظار کرنا ہو گا تو کیوں نہ ماضی کی کچھ باتیں کی جائیں تقریباً 80 سال پہلے اس ملک (روس) میں انسانی جدوجہد کی تاریخ کا ایک بہت ہی بڑا تجربہ کیا گیا تھا جو "انقلاب روس" کہلاتا ہے۔ 1917ء میں زار روس کا یہ ملک موجودہ ہندوستان سے بھی زیادہ پسماندہ تھا۔ کسان لکڑی کے ہل چلاتے تھے زار کی بادشاہت چار صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ صنعتی مزدور ایک چھوٹی سی اقلیت میں تھے۔ پندرہ کروڑ کی آبادی میں صرف چالیس لاکھ' ستر فیصدی آبادی ناخواندہ تھی۔ سرمایہ داری نظام غیر ملکی سرمائے کی بیساکھیوں پر چلتا تھا۔ فرانس' برطانیہ' جرمنی' بلجیم اور دوسرے مغربی ملکوں کے سرمایہ دار روس کی نوے فیصد معدنی کانوں پر قابض تھے' 50 فیصد کیمیکل انڈسٹری' 40 فیصد انجینئرنگ اور 42 فیصد بینکنگ نظام بھی ان کے تصرف میں تھا۔ 1917ء کے انقلاب روس کے ساتھ جو انقلابی اقتصادی منصوبہ بندی کی گئی اس نے بعض حیران کن اور تعجب انگیز نتائج برآمد کئے۔ 1913ء سے 1963ء تک کے عرصے میں دو عالمی جنگوں' متعدد بیرونی مداخلتوں' خانہ جنگیوں اور دیگر آفات کے باوجود روس کی صنعتی پیداوار میں باون گنا سے زیادہ اضافہ ہوا جبکہ اس عرصہ میں امریکہ کی صنعتی پیداوار میں صرف چھ گنا اضافہ ہوا اور برطانیہ اس پیداوار کو محض دوگنا کر پایا۔ یہی وہ عرصہ ہے جس میں روس ایک انتہائی پسماندہ زرعی ملک سے ابھر کر ایک عالمی طاقت بن گیا جس کی زبردست صنعتی بنیاد تھی اور جس کے

پاس امریکہ اور جاپان سے زیادہ سائنس دان تھے۔

مذکورہ بالا پچاس سالوں کے عرصہ میں صنعتی مزدوروں کی پیداواری صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ امریکہ میں یہ اضافہ 332 فیصد اور برطانیہ میں 73 فیصد تھا جبکہ روس میں صنعتی مزدوروں کی پیداواری صلاحیت میں ایک ہزار تین سو دس فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ اس نصف صدی میں وہ 1930ء کی دہائی بھی آئی جو سرمایہ دار دنیا کے بحران کی دہائی تھی جس میں 1929ء اور 1933ء کے عرصہ میں امریکی صنعتی پیداوار 48 فیصد کم کر دی اور غربت اور بیروزگاری کا طوفان کھڑا کر دیا مگر روس اس بحران سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔ "امریکی قومی تحقیقاتی لیگ" نے اندازہ لگایا کہ مارچ 1933ء میں امریکہ میں ایک کروڑ 80 لاکھ صحت مند اور ہنرمند لوگ بیروزگار تھے جبکہ جرمنی میں ایسے بیروزگاروں کی تعداد ساٹھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ 1913ء سے 1963ء تک کے عرصے میں سابق سوویت روس میں جہاں کی آبادی میں 15 فیصد اضافہ ہو رہا تھا فنی ماہرین کی تعداد میں 55 گنا اضافہ ہوا۔ کل وقتی تعلیم میں 6 گنا اضافہ ہوا۔ کتابوں کی اشاعت 13 گنا بڑھ گئی۔ ہسپتالوں کے بستروں میں دس گنا اضافہ ہوا۔ نرسری کے بچوں میں ایک ہزار تین سو پچاسی گنا اضافہ ہوا۔ ایک لاکھ لوگوں کے لئے 2005 ڈاکٹر ہوتے تھے جبکہ اٹلی میں اتنے لوگوں کے لئے 170 آسٹریا میں 150 امریکہ میں 150 مغربی جرمنی میں 144 برطانیہ میں 110 اور سویڈن میں 101 ڈاکٹر تھے۔ اس نصف صدی کے دوران روس میں زندگی کی میعاد میں دو گنا اضافہ ہوا۔ بچوں کی اموات کی شرح نو گنا کم ہو گئی۔ صرف 1955ء اور 1959ء کے چار سالوں میں شہری مکانوں میں تین گنا اضافہ ہوا۔ 1970ء میں روسی ڈاکٹروں کی تعداد ایک لاکھ 35 ہزار سے بڑھ کر چار لاکھ 84 ہزار ہو گئی اور ہسپتالوں کے بستر سات لاکھ اکانوے ہزار سے بڑھ کر بائیس لاکھ چوبیس ہزار ہو گئے۔

حیران ہونے کی بات نہیں ہے مجھے یہ تمام اعداد و شمار زبانی یاد نہیں۔ بابا ٹیڈ گرانٹ کی کتاب سے نقل کر رہا ہوں جن کا کہنا ہے کہ سٹالن کی جبری زرعی مشقت کے باوجود' جس نے روس کی زراعت کو زبردست نقصان پہنچایا اور جس سے روس کی زراعت کبھی بھی پوری طرح صحت مند نہیں ہو پائی' اتنی ترقی ضرور ہوئی کہ لوگوں کے پاس ان کی ضرورت کا اناج میسر تھا۔ اتنے کم عرصہ میں اتنی زرعی ترقی دنیا میں اور کہیں بھی نہیں ہوئی۔ اس عرصہ میں روس کے زیر کاشت رقبے میں کہیں بھی اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ 1953ء اور 1956ء کے تین سالوں میں تین کروڑ پچاس لاکھ نوے ہزار ہیکٹر قابل کاشت رقبے کا اضافہ کسی معجزے

سے کم نہیں ہے۔ یہ رقبہ کینیڈا کے مجموعی قابل کاشت رقبے کے برابر ہے اور یہ حقیقت ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ تیسری دنیا کے ان زرعی ملکوں کے لئے بھی یقیناً حیران کن ہو گی جو زرعی ممالک ہوتے ہوئے دوسرے ملکوں سے زرعی پیداوار درآمد کرنے پر مجبور ہیں۔

زرعی اصلاحات

3- مارچ 1972ء کی رات کو جشن زرعی اصلاحات منانے کے لئے پیپلز پارٹی لاہور نے مشعل بردار جلوس نکالے۔ شاہراہ قائداعظم پر ایسا ہی ایک جلوس نعرہ لگا رہا تھا۔

"جیہڑا واہوے اوہو ای کھاوے"

زرعی اصلاحات کا جشن منانے والے لوگ یہ نعرہ لگا کر دراصل پیپلز پارٹی کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر رد کر رہے تھے۔ دیہات کے لاکھوں محنت کشوں کے دل کی آواز "جیہڑا واہوے اوہو ای کھاوے" لاہور کی اس فیشن ایبل سڑک پر چاروں طرف پھیل رہی تھی اور اس آواز کو ہر سو پھیلانے والے دیہات سے تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ لاہور شہر کے محنت کش طبقے اور نچلے درمیانہ طبقہ کے لوگ تھے۔ اس طرح دیہات کے کسانوں اور شہر کے محنت کشوں اور نچلے درمیانہ طبقہ کے درمیان متحدہ جدوجہد کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔

پیپلز پارٹی کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات کا ہر طرف چرچا ہے۔ کچھ لوگ ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں اور دوسرے ان کو ناکافی اور بے معنی قرار دے رہے ہیں۔ اور دائیں بازو کے رجعت پسند اس بات کا رونا رو رہے ہیں کہ نجی جائیداد کو بلا معاوضہ حاصل کرنا بہت بڑا ظلم ہے اور اسلامی اصولوں اور نظریہ پاکستان کے خلاف ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ پیپلز پارٹی کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات پاکستان کی ترقی اور سالمیت کے لئے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتی ہے اور ان اصلاحات سے پاکستان کے زرعی مسائل حل ہو جائیں گے۔

دوسری طرف یہ سوال اٹھائے جا رہے ہیں کہ کیا پیپلز پارٹی کی زرعی اصلاحات دیہاتی عوام کے مسائل حل کر سکتی ہیں؟ اور کیا وہ دیہاتی عوام کی امنگوں اور خواہشات کی عکاسی کرتی ہیں اور پاکستان کے قومی تقاضوں کو پورا کرتی ہیں؟

یہ سوالات آج ہر جگہ، ہر محفل اور ہر سیاسی اجتماع میں زیر بحث ہیں۔

ان سوالات کا حل ڈھونڈنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ تعین کر لیں کہ پاکستان

کے زرعی مسائل کیا ہیں؟ اور ان مسائل کو حل کرنے کے لئے زمین کے نظام میں کیسی تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے۔

تاریخی پس منظر اور زرعی حقائق

انگریز کی آمد سے پہلے برصغیر ہند و پاکستان کے دیہات میں خود کفیل نظام رائج تھا۔ زمین کی ملکیت کی موجودہ شکل نہ تھی۔ راجے' مہاراجے اور نواب اپنے اپنے علاقوں میں لوگوں کی حفاظت کے نام پر اور اپنی حکومت چلانے کے لئے پیداوار کا کچھ حصہ حاصل کرتے تھے اور جب مرکزی حکومت مضبوط ہوتی تھی اسے بھی اس میں حصہ دیتے تھے۔ لیکن انگریز نے اسی نظام کو اپنے اقتصادی اور سیاسی مفادات کے حصول کے لئے یکسر بدل دیا۔ اور راجوں' نوابوں اور مہاراجوں اور ان کے منشیوں اور اہلکاروں اور ان لوگوں کو جنہوں نے انہیں پنجاب' سندھ' سرحد اور بلوچستان وغیرہ کو فتح کرنے میں امداد دی یا بعد میں ان کی حکومت کو مضبوط کرنے میں ہاتھ بٹایا۔ زمینوں کی ملکیت بخش دی اور بہت سی اراضی براہ راست حکومت کی ملکیت میں لے لی جسے بعد میں انعامات کی شکل میں وقتاً" فوقتاً" اپنے خدمت گذاروں اور کاسہ لیسوں میں تقسیم کیا جاتا رہا۔ برطانیہ میں سوتی ملوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی ضرورت کے پیش نظر جب ان علاقوں میں نہروں کا جال پھیلایا گیا تو پرانے آباد علاقوں میں سے نئے علاقوں میں آباد ہونے والے آباد کاروں کو بھی زمین تقسیم کی گئی۔ آج بھی حکومت کی ملکیتی قابل کاشت اراضی تین کروڑ ایکڑ سے زائد رقبہ پر مشتمل ہے اور ابھی تک انعام و اکرام کے مصرف میں آ رہی ہے۔

ایوب خان کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات کے وقت جو اعداد و شمار دیئے گئے ان کے مطابق موجودہ پاکستان کا کل رقبہ 19 کروڑ۔ بیاسی لاکھ' تیس ہزار ایکڑ ہے۔ اس میں سے دس کروڑ چوبیس لاکھ' ترانوے ہزار ایکڑ رقبہ پیمائش شدہ ہے اور باقی رقبہ کی ابھی تک پیمائش نہیں ہوئی۔ اس رقبہ میں سے تین کروڑ رقبہ غیر مزروعہ ہے اور اس میں سے تین کروڑ' چار لاکھ اونسٹھ ہزار ایکڑ رقبہ قابل کاشت بنجر ہے۔ 29 لاکھ اٹھانوے ہزار ایکڑ رقبہ زیر جنگلات اور تین کروڑ' سترہ لاکھ' اٹھائیس ہزار ایکڑ رقبہ ناقابل کاشت بنجر رقبہ ہے اور دو کروڑ چالیس لاکھ ایکڑ رقبہ نہری ہے۔

پاکستان کی دیہی آبادی 38447 دیہات پر مشتمل ہے پاکستان کے پچاسی فیصدی لوگ

دیہات میں بسے ہوئے ہیں اور ان میں سے نوے فی صدی کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔ دیہات میں بسے ہوئے زمین کے مالکان کی کل تعداد اور ان کے پاس رقبہ حسب ذیل نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱ چارٹ جلد 3 صفحہ نمبر 10

تفصیل مالکان	مالک خاندانوں کی تعداد	کل مالکوں کا فیصدی	کل رقبہ ملکیتی ایکڑوں میں	کل رقبہ کا فیصد	کل زیر کاشت رقبہ	زیر کاشت رقبہ کا فیصد
کل تعداد مالکان	4859983	100	48929583	100	37249561	100
ایک ایکڑ سے کم کے مالکان	742216	15	334356	1	266758	1
ایک ایکڑ سے 2-1/2 ایکڑ سے کم مالکان	855732	18	1345475	3	1134417	3
2-1/2 ایکڑ سے 5 ایکڑ سے کم مالکان	805584	16	2911107	5	2535006	7
5 ایکڑ سے 7-1/2 ایکڑ سے کم مالکان	580952	12	3545720	7	3126465	8
7-1/2 ایکڑ سے 12-1/2 ایکڑ سے کم مالکان	758703	16	7356971	15	6489448	17
12-1/2 ایکڑ سے 25 ایکڑ سے کم مالکان	728909	15	12533019	26	10710438	28
25 ایکڑ سے 150 ایکڑ سے کم مالکان	285882	6	9467641	19	7386959	20
150 ایکڑ سے 150 ایکڑ سے کم مالکان	87624	2	6538883	13	3886204	10
150 ایکڑ سے زائد رقبہ کے مالکان	13981		4896411	10	1693870	5

(مغربی پاکستان کے زراعی اعداد و شمار سلسلہ نمبر 1 مطبوعہ 65-1964ء)

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ پاکستان میں مالکان اراضی کی کل تعداد 48'59'983 جن کے پاس 48'59'983 ایکڑ اراضی ہے پانچ ایکڑ سے کم مالکان اراضی کی تعداد چوبیس لاکھ ہے جو مالکان کی کل تعداد کا 49 فیصدی ہے اور ان کے پاس کل ملکیتی رقبہ صرف 9 فی صدی ہے۔ ساڑھے بارہ ایکڑ سے کم مالکان کی تعداد 37435557 ہے اور پاکستان بھر کے تمام مالکان کا 77 فی صدی ہیں اور ان کے پاس ملکیتی رقبہ 1'54'93'62 ایکڑ ہے جو کل رقبہ کے 32 فی صدی ہے۔

ایسے چھوٹے مالک خاندانوں کی تعداد 8'34'257 ہے جو کچھ اپنی اور کچھ دوسروں سے بٹائی پر حاصل کر کے اراضی کاشت کرتے ہیں۔ بے مالک مزارعوں کی کل تعداد 20'27'990 ہے جو 2'37'70'914 ایکڑ رقبہ کاشت کرتے ہیں۔ تقریباً ہر دوسرا کاشت کار مزارع ہے۔

پاکستان میں زیر کاشت اراضی کی سیرابی کے لئے نہروں کے علاوہ 1960ء میں 14'486 ٹیوب ویل تھے۔ اور 335097 کوئیں استعمال ہو رہے تھے اس اراضی کو 1960ء تک 8'32'053 لوہے کی ہلوں سے کاشت کیا جا رہا ہے۔ 1960ء اور 1970ء کے درمیان ٹریکٹروں کی تعداد تین سو سے بڑھ کر بیس ہزار ہو گئی اور ٹیوب ویلوں کی تعداد 70 ہزار کے قریب پہنچ گئی۔

پاکستان میں ایک اندازہ کے مطابق 25 ایکڑ سے بڑے فارموں میں تقریباً بارہ لاکھ مزدور کام کرتے ہیں۔ جیسے جیسے مشینی کاشت بڑھ رہی ہے ان مزدوروں میں بیروزگاری کا خطرہ بھی بڑھ رہا ہے۔

دیہاتی عوام قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں اور کل مالکان اراضی میں سے تقریباً 29 فی صدی مقروض ہیں۔ ساڑھے بارہ ایکڑ سے 25 ایکڑ کے درمیان مالکان میں سے 35 فی صدی مقروض ہیں۔ اور ان میں سے تقریباً 4879 افراد نے 5 ہزار روپے سے زیادہ قرض لے رکھا ہے۔ اسی طرح ساڑھے سات ایکڑ سے ساڑھے بارہ ایکڑ کے درمیان مالکان میں سے 34 فی صدی مقروض ہیں اور 5 ایکڑ سے ساڑھے سات ایکڑ کے درمیان مالکان میں سے 32 فی صدی مقروض ہیں۔

زرعی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ پاکستان میں فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کا مسئلہ ہے حسب ذیل نقشے سے مختلف زرعی اجناس کی فی ایکڑ اور کل پیداوار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فصل	سال	رقبہ کاشتہ ایکڑوں میں	پیداوار ٹنوں میں	فی ایکڑ منوں میں

	1948ء	10,686000	3,993,000	10.2
	1957-58ء	11,495,000	3,53,000	8.4
	1966-67ء	13,385,000	4,324,000	8.8
	1967-68ء	14,977,000	6,375,000	11.6
کپاس	1948-49ء	26,54,000	980000	1.8
	1957-58ء	36,41000	17,2200	2.3
	1966-67ء	40,39000	26,2000	3.1
	1967-68ء	42,81000	28,22000	3.1

(پاکستان کی اقتصادیات 68-1948ء صفحہ- 60-57)

1948-58ء کے درمیان تمام خوردنی اجناس کی سالانہ اوسط پیداوار 129 لاکھ ٹن تھی- اور 1958-1968ء کے درمیان 162 لاکھ ٹن 68-1967ء میں یہ پیداوار 204 لاکھ ٹن تک پہنچ گئی تھی- لیکن خوردنی اجناس کی پیداوار بڑھتی ہوئی آبادی کے مطابق نہ بڑھ سکی چنانچہ 58-1948ء کے درمیان اوسطاً" چار لاکھ ستر ہزار ٹن خوردنی اجناس درآمد کی جاتی رہیں- لیکن 68-1958ء کے دوران یہ درآمد بڑھ کر اوسطاً" 15 لاکھ ٹن سالانہ ہو گئی- درآمد شدہ گندم کا 60 فی صدی حصہ مغربی پاکستان میں استعمال ہوتا رہا ملک کی مجموعی آمدنی کا تقریباً 1/4 حصہ خوردنی اجناس کی درآمد پر خرچ ہوتا رہا- اور اس طرح پاکستان ایک ارب دس کروڑ روپیہ زر مبادلہ خرچ کرنے پر مجبور ہوا- روپے کی قیمت کم ہونے پر خوردنی اجناس کی درآمد کے لئے کم از کم 12 ارب 10 کروڑ روپیہ خرچ کرنا ہو گا- 65-1964ء تک یہ اجناس پی ایل 480 کے تحت امریکہ سے درآمد کی جاتی رہیں لیکن اس کے بعد دوسرے ملکوں سے بھی خریدی گئیں-

وزارت زراعت اور مرکزی دفتر شماریات کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان نے بیرونی ممالک سے جو گندم' چاول اور چینی درآمد کی وہ ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہے-

سال	گندم	چاول	چینی
1966-67ء	17,70,803	1,90,799	269 ٹن
1967-68ء	21,20,549	1,50,227	1,8,164
1968-69ء	7,54,753	66,000	1,2,57,419

1969-70ء	11,07,369	1,19,929	1,13,292

1971-72ء میں پاکستان نے 15 لاکھ ٹن گندم امریکہ اور کینیڈا سے درآمد کی ہے۔

صوبے کی قابل کاشت اراضی کا تقریباً پچاس فی صد سیم اور تھور سے متاثر ہے۔ اور ایک کروڑ ایکڑ مکمل طور پر سیم کی نذر ہو چکا ہے اور ایک کروڑ بارہ لاکھ ایکڑ رقبہ جزوی طور پر متاثر ہوا ہے اور اپنی پیداواری صلاحیت ضائع کر چکا ہے 50 لاکھ ایکڑ رقبہ تھور سے مکمل طور پر ضائع ہو چکا ہے اور دو کروڑ باسٹھ لاکھ ایکڑ رقبہ جزوی یا کلی طور پر ناکارہ ہو گیا ہے۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق موجودہ پاکستان میں ہر چھ منٹ میں ایک ایکڑ اور سال بھر میں ایک لاکھ ایکڑ اراضی سیم اور تھور سے متاثر ہوتی ہے۔ موجودہ پاکستان میں تقریباً 70 فی صدی اراضی کی کاشت کا انحصار نہروں پر ہے پاکستان کا نہری نظام دنیا بھر کے مثالی منصوبوں میں سے ایک ہے۔ لیکن نوکر شاہی کے غلط طریق کار رشوت ستانی اور بد نظمی نے کاشت کاروں کو بے پناہ مشکلات سے دوچار کر رکھا ہے نہروں کے اولین اجراء کے وقت 2.64 کیوسک پانی ایک ہزار ایکڑ اراضی سیراب کرنے کے لئے کافی سمجھا گیا تھا۔ لیکن گذشتہ ساٹھ سال میں مسلسل نئی زمینیں زیر کاشت آتی چلی گئی ہیں اور نہروں سے سیراب ہونے والی اراضی میں متواتر اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ لیکن پانی کی مقدار میں اضافہ نہ ہوا ہے۔ اس کے برعکس آبیانہ کی شرح 1949ء کے بعد لگاتار بڑھتی چلی گئی ہے جیسا کہ حسب ذیل گوشوارہ سے ظاہر ہے۔

آبیانہ فی ایکڑ

	1948ء	1949ء	1955ء	1959ء	1965ء	1968ء	1969ء
نیشکر	7.75	11.00	12.00	20.00	24.00	28.80	32.16
کپاس	3.56	5.25	6.25	9.50	11.20	13.60	15.24
گندم	2.86	4.25	5.25	6.00	7.20	8.80	9.12
چارہ	1.79	2.50	2.50	3.50	4.80	5.60	6.64
ترقیاتی ٹیکس			0.13	0.25	0.35	0.35	0.35

انگریز نے اپنی حکومت کو چلانے کے لئے دیہاتی عوام پر بے شمار بوجھ ڈال رکھے تھے

ان میں سے ایک بوجھ مالیہ کی صورت میں تھا۔ یہ بوجھ خاص طور پر ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی سے کم مالکان جو تقریباً ساڑھے سینتیس لاکھ گھرانوں پر مشتمل ہیں کے لئے ناقابل برداشت ہے پاکستان بننے کے بعد اس بوجھ میں بھی متواتر اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔ حسب ذیل گوشوارہ سے یہ بات ظاہر ہے۔

مالیہ فی ایکڑ

	1948ء	1949ء	1955ء	1959ء	1965ء	1968ء	1969ء
نیشکر	12.00	20.00	22.00	31.00	38.00	40.00	43.35
کپاس	12.00	16.00	16.00	20.00	22.00	24.60	26.20
گندم	11.00	15.00	15.00	17.00	18.00	19.20	20.35
چارہ	10.00	12.00	12.00	13.00	14.00	16.00	17.65
لوکل ریٹ فی سینکڑہ	12.00	23.75	23.00	30.00	55.00	55.00	55.00

ان اعداد و شمار اور حقائق سے حسب ذیل مسائل کی نشان دہی ہوتی ہے۔

1- پاکستان میں اراضی کی فی ایکڑ پیداوار نہایت ہی کم ہے اور ابھی تک پاکستان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے زرعی اجناس درآمد کرنی پڑتی ہیں۔ ایک زرعی ملک کے لئے یہ صورت حال نہایت ہی تشویشناک ہے۔ کیونکہ جو زر مبادلہ مشینری خریدنے کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے وہ خوردنی اجناس کی نذر ہو جاتا ہے۔

2- تین کروڑ ایکڑ سے بھی زائد اراضی کو زیر کاشت لانے اور ہر سال جو لاکھوں ایکڑ اراضی جو سیم اور تھور کا شکار ہو جاتی ہے اسے بچانے اور بہتر بنانے کا مسئلہ ہے۔

3- حکومت کی کروڑوں ایکڑ ملکیتی اراضی کے بندوبست اور تقسیم کا مسئلہ ہے۔

4- دیہاتی آبادی میں بیس لاکھ سے کچھ زائد گھرانے مزارعین کے ہیں اور تقریباً 24 لاکھ گھرانے 5 ایکڑ سے کم مالکان اراضی کے۔ دیہات کے چوالیس لاکھ گھرانوں کی یہ آبادی دقیانوسی طریق کاشت کو اپنائے ہوئے ہے۔ اور نہایت ہی مفلسی اور جہالت کی زندگی گذار

رہا ہے اور ہر قسم کے ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنی ہوئی ہے اس آبادی کی بیکراں صلاحیتیں خوابیدہ ہیں۔ اور وہ پیداواری عمل میں نہایت ہی بے دلی' بے بسی اور مایوسی کے عالم میں حصہ لیتی ہے دیہاتی آبادی کی قوت خرید نہایت ہی کم ہے اور وہ ٹیکسوں اور قرض کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔

ملک میں اناج کی پیداوار بڑھانے' بنجر زمینوں کو زیر کاشت لانے۔ سیم تھور کی یلغار سے اراضی کو بچانے۔ دیہاتی محنت کشوں کی آمدنی بڑھانے کے لئے مختلف حکومتوں نے حسب ذیل طریقے استعمال کئے ہیں۔

1- مصنوعی کھاد کا استعمال 2- اچھے بیج کا استعمال 3- کیڑے مکوڑے مارنے کی دوائیوں کا استعمال 4- مشینری یعنی ٹریکٹر۔ ٹیوب ویل۔ بلڈوزر' ہارویسٹر اور دوسری گاہنے کی مشینوں کا استعمال 5- سیم اور تھور زدہ اراضی کی اصلاح کے لئے ٹیوب ویلوں کی تنصیب 6- تونسہ بیراج' گدو بیراج' غلام محمد بیراج' سکھر بیراج اور تھل پروجیکٹ کے ذریعے نئی اراضی زیر کاشت لائی گئی۔ 7- مزارعین میں زیادہ اناج اگاؤ سکیم کے تحت سرکاری اراضی کی مزارعین میں پٹے پر تقسیم 8- اشتمال اراضی 9- مزراعین کے حقوق کے تحفظ کے قوانین۔

اس وقت تقریباً 5 لاکھ ٹن مصنوعی کھاد مغربی پاکستان میں استعمال ہو رہی ہے اور اسی کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ اس کھاد میں سے نصف کھاد بیرون ملک سے درآمد کی جاتی ہے۔ چاول۔ گندم اور مکئی کے اچھے بیج اری پاک' میکسی پاک اور ہابریڈ مکئی وغیرہ کی کاشت میں بھی کافی پھیلاؤ ہوا ہے۔ جس سے پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ 58-1957ء کے درمیان تقریباً دو لاکھ خاندانوں کو 10 لاکھ ایکڑ سرکاری زمین 8- ایکڑ سے لے کر ساڑھے بارہ ایکڑ تک فی کاندان کے حساب سے تقسیم کی گئی جسے کسانوں نے بے انتہا محنت سے قابل کاشت بنایا اور اناج کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

سیم تھور کے انسداد کے لئے ایک امریکی منصوبہ کے تحت مغربی پاکستان میں 5866 ٹیوب ویل نصب کئے۔ اور مزید 37 ہزار ٹیوب ویل نصب کرنے کی سکیم پر عمل ہونا باقی ہے۔ فی ٹیوب ویل تقریباً 50 ہزار روپیہ خرچ آتا ہے ان ٹیوب ویلوں میں سے 409 ٹیوب ویل ناکارہ ہو چکے ہیں۔

پنجاب میں سکارپ کے علاقہ میں آبیانہ کی شرح دوگنی ہے۔ علاقہ حافظ آباد میں 106 ٹیوب ویل خراب ہو کر بند پڑے۔ جن پر تقریباً 44 لاکھ روپیہ خرچ آیا تھا۔

اشتمال اراضی کی سکیم کے تحت 1960ء سے لے کر 1968ء تک ایک کروڑ چودہ لاکھ اٹھانوے ہزار ایکڑ زمین کا اشتمال اراضی مکمل ہو چکا تھا۔ اشتمال سے پہلے چونتیس لاکھ پچاسی ہزار پانچ صد چون ملکیتی موٹروں پر مشتمل اراضی کو چودہ لاکھ انتیس ہزار چھ صد بارہ ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ان تمام اقدامات کے باوجود زرعی مسائل جو پاکستان کو درپیش ہیں حل نہیں ہو سکے زمین کی فی ایکڑ اوسط پیداوار میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو سکا۔ سیم اور تھور پر بھی منصوبہ بندی کے مطابق قابو نہیں پایا جا سکا۔ اور ہم بدستور بیرون ملک سے گندم اور دوسری خوردنی اجناس درآمد کرنے پر مجبور ہیں۔ دیہات میں بے روزگاری بڑھتی جا رہی ہے اور ملک کی کل دولت میں دیہاتی آبادی کا حصہ کم ہوتا جا رہا ہے۔

ان مسائل کو حل کرنے کے لئے پاکستان کی مختلف حکومتوں نے بلند بانگ دعوے کئے ہیں۔ اور کئی سکیموں اور منصوبہ بندیوں پر عمل کیا ہے جنہیں زرعی اصلاحات کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ مختلف پارٹیوں نے کب اور کیسی زرعی اصلاحات نافذ کی ہیں اور ان کا ملکی معیشت پر کیا اثر پڑا۔

مختلف حکومتوں کی زرعی اصلاحات

1946ء میں پنجاب مسلم لیگ نے اپنے منشور میں زرعی اصلاحات کرنے اور بے زمین کسانوں کو زمین دینے کا پروگرام پیش کیا تھا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد ان تمام وعدوں کو بھلا دیا گیا۔ 1949ء میں آل پاکستان مسلم لیگ نے زرعی اصلاحات کی ایک کمیٹی مقرر کی جس نے حسب ذیل سفارشات کیں۔

1- جاگیروں اور انعامات کا بلا معاوضہ فوری خاتمہ۔
2- موروثی مزارعین کو حقوق ملکیت دینا اور موروثی مزارعیت کا خاتمہ۔
3- مزارعین سے غیر قانونی جاگیردارانہ ٹیکسوں کی وصولی اور مراعات کا خاتمہ۔
4- مزارعین کے حقوق مزارعت کی خاطر خواہ حفاظت۔
5- زمین کے کاشتکاروں کو پیداوار میں تسلی بخش اور کافی حصہ دلانے کا قانون بنانا۔

1949ء میں پنجاب میں مزارعت کے قوانین کی انکوائری کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے کم سے کم خود کاشت کا رقبہ، موروثی حقوق کا خاتمہ اور دوسرے ٹیکسوں کے خاتمے کے

متعلق سفارشات کیں۔ ان سفارشات کی بنیادوں پر 1950ء کا مزارعین کے حقوق کا تحفظ اور بحالی کا قانون اور پنجاب مزارعین کا ترمیمی ایکٹ 1952ء پاس ہوا۔ ان قوانین میں مزارعین کے حقوق کی حفاظت کے لئے حسب ذیل دفعات شامل کی گئیں۔

1- 100 ایکڑ یا اس سے زیادہ اراضی کے مالکان خود کاشت کے لئے 50 ایکر محفوظ کر سکیں گے۔ (ان میں باغات کا رقبہ شامل نہ ہو گا۔)

2- پیداوار اور حکومت کے واجبات میں مزارعہ اور مالک 60 اور 40 کی نسبت سے بالترتیب حصہ دار ہوں گے۔

3- موروثی مزارعین کو چند شرائط کے مطابق حقوق ملکیت دے دیئے گئے۔

4- ناجائز ٹیکس اور بے گار قانون کے ذریعے بند کر دی گئی۔

سندھ میں مزارعین کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہاری کمیٹی کے نام پر 1947ء میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ جس میں 1948ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کمیٹی کی سفارشات کے مطابق 1950ء میں سندھ مزارعت قانون بنایا گیا۔ جس میں بعد میں وقتاً" فوقتاً" ترامیم کی گئیں۔ اسی قانون نے بیگار اور ناجائز ٹیکسوں کی وصولی بند کر دی اور پیداوار میں 1/3 اور 1/2 حصہ بٹائی مقرر کر دیا۔

صوبہ سرحد میں 1950ء میں قانون مزارعت پاس کیا گیا۔ اور 1952ء میں اسی میں ترمیم کی گئی اور پھر اسی سال مزارعین کے حقوق کی حفاظت اور بحالی کا قانون پاس کیا گیا۔ اس قانون سے موروثی مزارعین کو حقوق ملکیت دے دیئے اور تین سال کے قلیل عرصہ کے لئے مزارعت کے حقوق کی حفاظت دے دی گئی۔

بلوچستان۔ بہاول پور اور دوسری ریاستوں میں زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں کوئی اقدام نہ کیا گیا۔

زرعی اصلاحات کے یہ تمام قوانین اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ حالانکہ ان قوانین کا مقصد زرعی پیداواری رشتوں میں کوئی بنیادی تبدیلی برپا کرنا نہ تھی۔ اور محض مزارع کے حقوق کو تھوڑا بہت قانونی سہارا دینا تھا۔ لیکن چونکہ تمام حکومتیں بڑے زمینداروں کے مفادات کی ترجمانی کرتی تھیں اور مزارعین اور کاشت کاروں کی اپنی تنظیمیں کمزور تھیں اور دیہات کے محنت کش جہالت، ظلم و تشدد، مفلسی اور بے بسی کی زندگی کو اپنا مقدر سمجھتے تھے اس لئے یہ اصلاحات زیادہ تر قانونی کتابوں کی زینت بن کر رہ گئی ہیں۔

1958ء تک مغربی پاکستان کی معیشت گو ابھی تک جاگیرداری نظام کے دقیانوسی اور مضبوط بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ لیکن تجارت اور سرمایہ داری کی نشوونما اور پھیلاؤ نے ایک طرف تو سرمایہ دار صنعتی ترقی کے لئے میدان تیار کر دیا تھا اور اس طرح پرانے جاگیرداری پیداواری رشتوں کو کمزور کرنے کے حالات پیدا کر دیئے تھے اور دوسری طرف دیہات کے محنت کشوں میں ہلکی سی بیداری کی لہر دوڑا دی تھی۔ اس نئی بیداری کو مطمئن کرنے اور پرانے نظام کو نئے حالات میں نئے روپ میں قائم رکھنے اور اس کے ساتھ سرمایہ دارانہ صنعتی ترقی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اور امریکی سامراج کی امداد کے بل بوتے پر سامراج کے طفیلی سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے 1958ء میں ملک بھر میں ایوب خان نے آئینی حکومت کو معطل کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اور اسی سال پنجاب کے گورنر اختر حسین کی زیر قیادت زرعی اصلاحات کا کمیشن مقرر کیا گیا۔ جس نے 20_ جنوری 1959ء کو اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر 1959ء میں مارشل لاء ریگولیشن 64ء کے ذریعے زرعی اصلاحات کا نفاذ کیا گیا۔

> ان زرعی اصلاحات کے متعلق صدر ایوب نے کہا۔ "وہ اس نظام اور ان قدروں کی بقاء کے لئے لازماً" ضروری ہیں جو ہمیں عزیز ہیں اور جنہوں نے پاکستان کو ایک آزاد ریاست کے طور پر جنم دیا ہے۔"

ایوب خاں کی زرعی اصلاحات کے مطابق

1- ہر مالک اراضی 36 ہزار پروڈیوس انڈکس یونٹ کے مطابق اراضی رکھ سکتا تھا۔

2- ہر مالک اراضی 50 ایکڑ اراضی باغ کی صورت میں مزید رکھ سکتا تھا۔

3- ہر مالک مزید اٹھارہ ہزار یونٹ کی زمین اپنے ورثاء کے نام منتقل کر سکتا تھا۔

4- ہر مالک مزید چھ ہزار یونٹ کی زمین ایسی عورت کے نام منتقل کر سکتا تھا جس کی وہ کفالت کرتا ہو۔

5- گھوڑی پال اور اس قسم کے دوسرے فارم بھی مالکان اراضی رکھ سکتے تھے۔

اس کے علاوہ مغربی پاکستان میں ہر قسم کی جاگیریں ختم کر دی گئیں۔ صرف سندھ میں چار صد اسی جاگیریں جو 11 لاکھ ایکڑ اراضی پر مشتمل تھیں ختم کر دی گئیں۔ ان جاگیروں کے

خاتمہ کی وجہ سے حکومت کو 31 لاکھ روپیہ سالانہ کی بچت ہوئی۔

ان زرعی اصلاحات کے تحت 23'52'716 ایکڑ اراضی زمینداروں اور جاگیرداروں سے حاصل کی گئی۔ اس اراضی میں سے 1968ء تک 16 لاکھ ایکڑ اراضی مختلف سکیموں کے تحت بیچ دی گئی۔ اور سات لاکھ پچاس ہزار ایکڑ اراضی ابھی بقایا ہے اس بقایا اراضی میں سے زیادہ تر اراضی ناقص سے پہاڑی یا دریائی گذرگاہوں پر واقع تھی۔ تقریباً دو لاکھ کاشتکاروں کو ان زرعی اصلاحات سے فائدہ ہوا۔ ان میں سے ڈیڑھ لاکھ کاشت کرنے والے مزارعین تھے جن کو وہ زمین بیچ دی گئی 46 ہزار دوسرے مزارعین کو اور چار ہزار چھوٹے مالکان کو اراضی دی گئی۔ یہ تمام اراضی 8 روپے فی یونٹ کے حساب سے دی گئی۔ اس سولہ لاکھ ایکڑ اراضی میں سے موجودہ سرکاری شکار گاہوں کے لئے بھی اراضی مخصوص کی گئی۔ اور دو لاکھ ایکڑ زمین حکومت کے محکموں کو بیچی گئی۔

جن مالکان سے زرعی اصلاحات کے تحت زمین لی گئی انہیں ایک روپیہ سے لے کر 5 روپے تک فی یونٹ کے حساب سے رقم ادا کی گئی۔ ان زمینداروں کو ادا کی جانے والی معاوضہ کی کل رقم 9 کروڑ 26 لاکھ روپیہ بنتی تھی۔ دسمبر 1967ء تک اس رقم میں سے 6 کروڑ 52 لاکھ روپیہ زمینداروں کو ادا کیا جا چکا ہے اور باقی رقم 69-1968ء تک ادا کی جانی تھی۔

ان اصلاحات کے تحت ساڑھے بارہ ایکڑ نہری اور 25 ایکڑ بارانی اراضی کی تقسیم کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اسی طرح اقتصادی قطعات اراضی گذارہ اراضی کے ٹکڑوں کو بیچنے پر پابندی لگا دی گئی تاکہ اراضیات مزید تقسیم ہو کر غیر اقتصادی قطعات نہ بن جائیں۔

ایوب حکومت نے چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کے اشتمال پر خاص توجہ دی اور اس سکیم پر قریباً آٹھ کروڑ روپیہ خرچ کیا۔ اس سکیم کے تحت 68-1967ء تک ایک کروڑ چودہ لاکھ اٹھانوے ہزار ایکڑ رقبہ کا اشتمال کیا گیا۔ پہلے یہ رقبہ چونتیس لاکھ پچاس ہزار پانچ صد چون یونٹوں پر مشتمل تھا۔ اب اشتمال اراضی کے بعد اسے چودہ لاکھ انتیس ہزار چھ صد بارہ یونٹوں میں اکٹھا کیا گیا ہے۔

ایوب خان کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات بھی جاگیرداری نظام کے پیداواری رشتوں کو ختم نہ کر سکیں۔ البتہ دو لاکھ کے قریب کاشت کاروں کو گذارہ یونٹ کے مطابق قسطوں پر

زمینیں دے دی گئیں۔ یہ کاشت کار مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے اس لئے زمین کی اس تقسیم نے کوئی بھرپور اور ہمہ گیر اثر نہ چھوڑا۔

البتہ ان زرعی اصلاحات نے منفی طریقے سے زراعت میں سرمایہ دارانہ طریق کاشت کو پھیلانے میں مدد دی۔ اور مزارعین کی وسیع پیمانے پر بے دخلیوں کے لئے دروازے کھول دیئے۔

لیکن پاکستان میں پہلی بار جاگیرداروں سے زمین حاصل کر کے مزارعین میں تقسیم کرنے کے اصول نے جاگیرداری نظام کا تقدس توڑ دیا۔ اور جاگیرداری کے خاتمے کے لئے میدان ہموار کرنے میں مدد دی۔ چنانچہ 1970ء کے انتخابات سے پہلے ان جماعتوں کو بھی اپنے منشور میں زمین کی حد ملکیت مقرر کرنی پڑی جو ساری عمر یہ وعظ کرتی رہی تھیں کہ اسلام زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگاتا۔ چنانچہ ایوب خاں کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات کے چند سال بعد مغربی پاکستان کے شہروں اور دیہات میں بین الاقوامی اور ملکی حالات نے بیداری کی نئی لہر دوڑا دی۔ بیداری کی ان لہروں پر پیپلز پارٹی نے جنم لیا۔ پیپلز پارٹی کے رہنما ذوالفقار علی بھٹو جنہیں عوام کے جذبات کی عکاسی کا ملکہ حاصل ہے بگولے کی طرح مغربی پاکستان خصوصاً پنجاب اور سندھ پر چھا گئے اور دیہات کے لاکھوں محنت کش کسی تنظیم کے وجود کے بغیر پیپلز پارٹی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

ان حالات میں پیپلز پارٹی نے جو منشور عوام کے سامنے پیش کیا اس میں کہا۔ "مغربی پاکستان میں بڑی بڑی زمینوں کے مالک جاگیردار ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں یہ نہ صرف اپنی دولت کے بل بوتے پر بلکہ مزارعین پر حاکمانہ دبدبے اور اردگرد کے کسانوں پر اپنی برتری کی وجہ سے اب بھی زبردست طاقت کے مالک ہیں اور ملک میں ایک اہم سیاسی قوت ہیں۔ جاگیردار طبقے کی طاقت کو توڑنے کے لئے بڑی بڑی جاگیروں کو چھوٹے قطعات زمین میں تقسیم کرنا ایک قومی ضرورت ہے جسے عملی اقدامات کے ذریعے انجام دینا ہو گا۔ زمین کی حد ملکیت مقرر کرنا ان میں سے صرف ایک قدم ہے نہری زمین کی زیادہ سے زیادہ حد ملکیت 50 اور 50 ایکڑ کے درمیان مقرر کی جائے گی۔ آخری حد کا انحصار زمین کی حالت' پیداواری صلاحیت اور آب پاشی کی دستیاب سہولتوں پر ہو گا۔

بہت سے کسان گذارہ یونٹ سے بھی کم زمین کے مالک ہیں۔ لہٰذا ان کا شمار ان لوگوں میں ہونا چاہئے۔ جن سے مالیہ وصول کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں سے

مالیہ وصول کرنے کے لئے بہت زیادہ اخراجات بھی ہوں گے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا نصب العین جاگیرداری نظام کا مکمل خاتمہ ہے اور پارٹی سوشلزم کے مسلمہ اصولوں کے مطابق کسانوں کے مفادات کی حفاظت اور فروغ کے لئے ٹھوس عملی اقدامات کرے گی۔ ایوب خاں کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات کے متعلق کہا گیا کہ "ان کی وجہ سے بڑی بڑی جاگیریں محدود کر دی گئیں۔ لیکن اصلاحات کی زد میں آنے والی زمینوں میں سے بھی زیادہ تر اسی جاگیردار طبقے کے قبضے میں ہیں۔ کیونکہ قانونی طور پر زمینداروں کو یہ زمین اپنے افراد خاندان میں تقسیم کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ بہتر حالات میں ان خاندانوں کے مفاد کو مزید دو پشتوں تک نقصان پہنچنے کا کوئی خدشہ نہیں ہے..... جاگیرداری سماج میں ذات برادریاں اور مشترکہ خاندان کی زندہ روایات ابھی تک قائم ہیں اسی طرح اگر جاگیر مٹ بھی جائے تو بھی جاگیرداری کا پلہ بھاری رہتا ہے۔"

پیپلز پارٹی کے خیال کے مطابق اپنی مدد آپ کرنے والے گروپوں اور مشترکہ کھیتوں کا فروغ ہی کاشت کاروں کی حالت بہتر بنانے میں مدد کا بہترین طریقہ ہے۔

زرعی معیشت کی سطح کو بلند کرنے کے لئے دو بڑی سمتوں سے حملہ کرنا ضروری ہے۔

الف۔ بے زمین کسانوں اور گذارہ کی سطح سے کم زمین کے مالکوں کو زمین دینا۔

ب۔ وہ تمام سرکاری زمین جس میں آب پاشی ہو رہی ہے یا جسے کاشت کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ بے زمین کسانوں اور گذارے کی سطح سے کم مالک کسانوں میں تقسیم کے لئے ہو گی انفرادی ملکیت کے قطعات زمین کو رضاکارانہ طور پر یکجا کر کے سماجی مشترکہ کھیتوں کا قیام عمل میں آئے گا۔

(دہقان 10- جنوری 1972ء)

پچھلے چوبیس سال میں سرمایہ داری نظام نے آہستہ آہستہ ملک کے پس ماندہ ترین علاقوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے دیہات کو سرمایہ دارانہ منڈی کا حصہ بنا دیا ہے۔ دیہات میں خود کفیل نظام کے پرانے باقیات چکنا چور ہو چکے ہیں اور سرمایہ دارانہ ترقی کے عمل نے دیہات میں نئے طبقات کو جنم دیا ہے۔ ایک طرف دیہات کی لوٹ بڑھتی چلی گئی ہے تو دوسری طرف ریڈیو' ٹرانسسٹر' سڑکوں اور تعلیم یافتہ دیہاتی بے روزگاروں اور دیہات کے رہنے والوں شہر کے کارخانوں میں ملازمین نے مغربی پاکستان کے سوئے ہوئے دیہات کو بیدار کر دیا ہے۔ ویٹ نام میں امریکی سامراج کی

پے در پے شکستوں اور 1965ء کی پاک بھارت جنگ' ایوب حکومت کی دس سالہ آمریت کے سیاہ دور کے خلاف عظیم عوامی جدوجہد نے دیہات میں بیداری کی لہر دوڑا دی ہے اور دیہات کے غریب محنت کشوں کو نیا شعور دیا ہے۔ کراچی اور لاہور دوسرے مزدور مراکز میں مزدوروں کی مسلسل جدوجہد اور 23- مارچ 1970ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں عظیم الشان کسان کانفرنس نے پاکستانی محنت کشوں اور دیہاتی عوام کو نئے نعرے دیئے ہیں ان میں نئے عزم اور نئے ولولے کروٹیں لینے لگے ہیں۔ ایک آزاد اور خوشحال پاکستان کا دھندلا سا نقشہ دیہاتی عوام کے ذہین میں ابھرنے لگا ہے۔

طبقاتی جدوجہد نئی شکلیں اختیار کرنے لگی ہے۔

صنعتی مزدور کارخانوں پر قبضہ کر کے نظم و نسق خود سنبھال کر جدوجہد کے نئے باب لکھ رہے ہیں۔ صوبہ سرحد میں کسانوں نے جدوجہد کے نئے طریقے اپنانے شروع کر دیئے ہیں۔ پنجاب میں بھی کئی جگہوں پر زمینداروں اور مزارعین میں مسلح تصادم ہوئے ہیں۔ کاشت کاروں میں زمین کی بھوک برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

ان حالات میں پیپلز پارٹی کے قائد نے جو خود ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جو اسلامی سوشلزم (یعنی عالمی سطح پر فنا کی جانب جانے والے سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم کی کامیابی کے دور میں ایک پس ماندہ مسلمان ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی نشوونما کے جھنڈے تلے 1970ء کے انتخابات کے میدان میں اترے اور دیہی معیشت میں تبدیلی کرنے کا مندرجہ بالا منشور پیش کیا۔

بھٹو صاحب 1969ء میں ہی روندے کچلے' بے بس اور مقہور عوام کے خیالات اور امیدوں کا محور بن چکے تھے عوام انہیں اپنا نجات دہندہ تصور کرنے لگے۔ اور خاص طور پر پنجاب میں انہیں روائتی ہیرو کا درجہ حاصل ہو گیا وہ ہر دکھ اور تکلیف اور مصیبت کا تریاق بن کر لٹے پٹے عوام کے خون کو گرمانے لگے۔ تلوار کا نشان تھامے پیپلز پارٹی کے امیدواران اسمبلی نے دیہات میں شعلے برسانے والی تقریروں سے غریب اور مفلس عوام کو گرمایا۔ پرانے نظام کے جور و ستم' اور پولیس کے ناجائز تشدد اور ظلم اور افسر شاہی کے حاکمانہ اور حقارت آمیز رویے اور رشوت خوری کے خلاف گاؤں گاؤں میں نعروں کے طوفان اٹھائے۔

پارٹی کی نچلی صفوں کے کارکنوں نے غیر شعوری طور پر دیہاتی محنت کشوں کی امنگوں اور

امیدوں کو "جیہڑا واہوے اوہو ای کھاوے" کے گھمبیر نعرے میں سمو دیا۔ اور اسمبلی کے امیدواروں نے قرآن ہاتھ میں اٹھا کر بے زمین کسانوں کو ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی دینے کا وعدہ کیا۔ بلکہ بعض علاقوں میں ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی کے لئے پرچیاں تقسیم کر دی گئیں۔ جنہیں دیہاتی عوام نے اپنی عزیز ترین متاع سمجھ کر اپنے پلے باندھ لیا۔

جماعت اسلامی' جمعیت العلمائے پاکستان اور اہل حدیث رہنماؤں نے ان نعروں کو شکست دینے کے لئے فتوؤں کا مینہ برسایا۔

لیکن 7- دسمبر 1970ء کی شام کو جب ریڈیو پر انتخابات کے نتائج کا اعلان ہونا شروع ہوا تو تمام فتوے خاک میں پڑے تڑپتے نظر آئے۔ جاگیردارانہ نظام کے علمبرداروں اور پرانے رجعت پسندوں کے جادو ٹونے ٹوٹ گئے اور نئی سرمایہ داری کے نمائندے اسلامی سوشلزم اور مساوات محمدی کے جھنڈے اٹھائے مغربی پاکستان میں دو بڑے صوبوں پر چھا گئے۔

یحییٰ خان نے مزید ایک سال کے لئے مارشل لاء کی سیاہ رات پاکستان پر مسلط کر دی اور آخر پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور مغربی پاکستان میں اقتدار صدر بھٹو کو منتقل کر دیا گیا۔ صدر بھٹو نے بنیادی اصلاحات کے نام پر مارشل لاء کی زندگی 20- اپریل 1972ء تک بڑھا دی۔ اور آخر صدر بھٹو نے پہلی مارچ 1972ء کو زرعی اصلاحات کا اعلان ان الفاظ میں کیا۔

ہموطنو' مزارعو۔ ہاریو!

آج کی رات تمہاری رات ہے۔ میں تم سے زرعی اصلاحات کے بارے میں گفتگو کرنے والا ہوں۔ میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نے وہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ زرعی نظام بدل دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کو تم صدیوں سے خاموشی کے ساتھ برداشت کر رہے تھے اور زرعی اصلاحات کا اعلان ختم کرتے ہوئے انہوں نے کہا "آج کا دن عہد آفرین ہے۔ کیوں کہ ہم نے ایک ہی ضرب سے وہ روگ جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے جس نے اس ارض حسین کا چہرہ صدیوں سے مسخ کر رکھا ہے۔ ہم نے اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے لئے ایک جرات آزما نئی دنیا کا دروازہ کھول دیا ہے۔ ہم نے اپنی نسلوں کا مستقبل محفوظ کر دیا ہے۔ میں خدا اور اس کے بندوں کے سامنے سرخرو ہو رہا ہوں۔ آج کے دن پاکستان کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ تاریخ میں کوئی شعبدہ بازی نہیں ہے۔ اسی سے کتاب آزادی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ زنجیریں کٹ رہی ہیں آؤ ہم سب مل کر جشن منائیں۔

اور لاہور کے باسیوں نے جشن منایا۔ اور نعرہ لگایا "جیہڑا واہوے اوہو ای کھاوے" اور

اسی طرح بھٹو صاحب کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات کو غیر شعوری طور پر رد کر دیا۔

پچھلے تین چار سال کی عوامی جدوجہد اور پچھلے چوبیس برس میں اسلام کے نام پر قائم کردہ ظالمانہ اور استحصالی نظام کے جور و ستم نے عوام کو نیا شعور بخشا ہے۔ زمین کی ملکیت کے بارے میں یہ نعرہ اسی شعور کا نچوڑ ہے۔ آیئے اس نعرے کی روشنی میں دیکھیں کہ پیپلز پارٹی کی نافذ کردہ اصلاحات کا کیا مطلب ہے اور ان سے پاکستان کی اقتصادیات میں کس قسم کی تبدیلیاں آئیں گی اور ان کا قومی زندگی اور دیہاتی عوام پر کیا اثر مرتب ہو گا۔

زرعی اصلاحات کا ریگولیشن

1- زرعی اصلاحات کے ریگولیشن کی دفعہ 8 کے مطابق کوئی شخص ڈیڑھ سو ایکڑ نہری یا چاہی یا 300' ایکڑ بارانی زمین یا 15 ہزار یونٹوں سے زائد زمین ایک وقت میں اپنے پاس نہ رکھ سکے گا۔

2- 20- دسمبر 1971ء سے پہلے جس کسی نے 10 ہارس پاور کا ٹیوب ویل لگا رکھا ہے یا ٹریکٹر خرید رکھا ہے اسے اٹھارہ ہزار یونٹ کی زمین رکھنے کی اجازت ہو گی۔

3- ریگولیشن کی دفعہ 13 اور 18 کے مطابق کوئی شخص جو اس رقبہ سے زائد ملکیت رکھتا ہو۔ 20- دسمبر 1971ء کے بعد اسے کسی کو منتقل نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی اراضی منتقل کی ہو تو وہ کالعدم تصور ہو گی۔ اس سے وافر اراضی بلا معاوضہ حاصل کر لی جائے گی۔ اور اسے بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

4- ریگولیشن کی دفعہ 18-13/10 کے مطابق جس کسی افسر نے پہلی جنوری 1959ء کے بعد چار مربع سے زیادہ زمین حاصل کی ہو گی وہ خواہ کسی کو منتقل ہی کیوں نہ کر دی ہو بلا معاوضہ ضبط کر لی جائے گی اور بے زمین کاشت کاروں میں بلا معاوضہ تقسیم کر دی جائے گی۔ البتہ اگر وراثتاً" کسی افسر کو کوئی زمین ملی ہے تو اس پر اس دفعہ کا اطلاق نہ ہو گا۔ اور نہ فوج کے ملازمین پر اس دفعہ کا اطلاق ہو گا۔

5- یہ ریگولیشن کی دفعہ 15 کے تحت گھوڑے پال اور گائے پال مربعہ جات بلا معاوضہ حکومت کی ملکیت بن جائیں گے۔ لیکن جہاں ایوبی مارشل لاء کے تحت معاوضہ تشخیص کیا جا چکا ہے۔ انہیں معاوضہ دیا جائے گا۔

6- ریگولیشن کی دفعہ 16 کے تحت تمام شکار گاہیں حکومت کی ملکیت میں لے لی جائیں

گی۔ ریگولیشن کی دفعہ 17 کے تحت مختلف اوقات کی زمین پر بھی دفعہ 8 لاگو ہو گی۔

باغات اور گھوڑی پال اور گائے پال مربع حکومت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے گی۔ اور اگر ٹھیکہ پر دے تو سابق مالک کا ٹھیکہ پر حق فائق ہو گا۔

شکار گاہوں کے متعلق بھی حکومت نے اپنی مرضی سے استعمال کا حق محفوظ رکھا ہے۔

7- یونٹوں کا پیمانہ وہی ہو گا جو 1930ء کے بندوبست میں تصور کیا گیا ہے اور جس کی معیاد چالیس سال تھی۔ اور اسی پیمانے کے حساب سے 1969ء میں زمین کی قسم کے مطابق یونٹ لگائے جائیں گے۔

8- ریگولیشن کی دفعہ 25 کے تحت آبیانہ اور دوسرے تمام ٹیکس اراضی کے مالک کو ادا کرنے ہوں گے۔ نیز بیج کے اخراجات بھی مالک کے ذمہ ہوں گے۔ کھاد اور کیڑے مار ادویات وغیرہ کا خرچ مالک اور مزارع کے ذمہ نصف نصف ہو گا۔ مزارعین سے بیگار نہیں لی جا سکے گی۔ اور مزارع کا حق شفع فائق ہو گا۔

اس کے علاوہ صدر نے پیٹ فیڈر (بلوچستان) علاقہ کی چھ لاکھ ایکڑ اراضی بلا معاوضہ حاصل کر کے بے زمین کاشت کاروں یا کم زمین کے مالکان میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا تھا۔

صدر نے یہ بھی اعلان کیا کہ حکومت کی ملکیتی زمین کا بیشتر حصہ پاکستانی افواج کے لئے ریزرو کر دیا جائے گا۔

پیٹ فیڈر کا علاقہ بلوچستان کے اضلاع سبی اور کچھی میں واقعہ ہے اور تقریباً چھ لاکھ ایکڑ ہموار زمین پر مشتمل ہے۔ پہلے یہ علاقہ ریاست قلات کا حصہ تھا اور خان آف قلات کے فرمان کے ذریعے اس علاقہ کی اراضیات انعامات کے طور پر تقسیم کی جاتی تھیں لیکن چونکہ وسائل آبپاشی مفقود تھے اسی لئے زمین کی طرف توجہ کم ہی دی جاتی تھی پاکستان کے قیام کے بعد گدو بیراج کی جو سکیم بنائی گئی۔ اس میں اس علاقہ کو سیراب کرنے کے لئے بھی ایک نہر شامل تھی۔ یہ نہر 1960ء کے قریب تعمیر ہوئی۔ جونہی یہ نہر تعمیر ہونی شروع ہوئی قبائل کے بڑے بڑے خانوں اور مغربی پاکستان کے چند بڑے افسروں نے ان زمینوں پر یلغار کر دی اور کئی ایک نے تو حقوق ملکیت حاصل کرنے کے لئے کرنافلی کاغذ پر پرانی تاریخوں میں فرمان بھی تیار کر لئے۔

صدر بھٹو نے ان زمینوں کو بلا معاوضہ حاصل کر کے بے زمین کاشت کاروں میں بلا قیمت تقسیم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

صدر بھٹو کا دوسرا اعلان حکومت کی ملکیتی زمینوں کے متعلق ہے۔ جس میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ سرکاری زمین بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کی جائیں گی۔ اور آسان قسطوں میں ان کی قیمت وصول کی جائے گی۔ اسی اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرکاری زمینوں کا ایک بڑا حصہ پاکستانی افواج کے لئے ریزرو رکھا جائے گا۔ گویا کہ سرکاری زمین کی تقسیم کا اعلان بھی مخدوش ہے سرکاری زمین کی تقسیم کے متعلق زرعی اصلاحات کے ریگولیشن میں کچھ نہیں کہا گیا اور یوں یہ اعلان بھی ادھورا ہے جس پر عمل کرنے کی کوئی گارنٹی نہ ہے فوج کے لئے زمین ریزرو کرنے کا عزم بڑے بڑے فوجی افسروں کو نوازنے کے سوا کچھ نہیں۔ نچلے درجہ کے فوجی پاکستانی عوام کے بیٹے ہیں۔ وہ زیادہ تر دیہاتی کاشتکاروں اور چھوٹے مالکوں کے فرزند ہیں۔ اگر ان کے کاشت کار خاندان کو زمین دے دی جائے تو ان کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس طرح زمین کے انعامات کا اعلان فوج کے "بھاڑے کے ٹٹو" والا کردار قائم رکھے گا۔ اور حب الوطنی کے جذبات کی بجائے زمین کا لالچ غالب آ جائے گا۔ اور فوجی ٹریننگ اور مہارت کی بجائے افسران زمینوں پر زیادہ توجہ دیں گے۔ جیسا کہ پچھلے بارہ سال میں ہوتا آیا تھا۔

اراضی کی حد ملکیت

زرعی اصلاحات کا بنیادی اعلان زیادہ سے زیادہ فی کس اراضی رکھنے کا اعلان ہے اصلی ریگولیشن کے مطابق کوئی شخص چھ مربع نہری یا چاہی یا 12 مربع بارانی اراضی یا 15 ہزار یونٹوں کی اراضی سے زیادہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ جن زمینداروں کے پاس ٹریکٹر ہوں یا انہوں نے دس ہارس پاور کے ٹیوب ویل لگا رکھے ہوں وہ مزید تین ہزار یونٹوں کی زمین رکھ سکتے ہیں۔ اس اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وافر اراضی بلا معاوضہ حاصل کی جائے گی۔ اور بلا قیمت بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم کی جائے گی۔

اس اعلان کے مطابق جب زمینداروں نے گوشوارے داخل کئے تو پتہ چلا کہ اس اعلان کے تحت حکومت کو مزارعین میں تقسیم کرنے کے لئے کوئی اراضی دستیاب نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ اس ریگولیشن میں صدر بھٹو نے خاص حکم کے ذریعے ترمیم کر دی۔ اس نئے حکم کے مطابق کوئی شخص 12 ہزار یونٹوں سے زائد اراضی نہیں رکھ سکتا اور ٹیوب ویل اور ٹریکٹر رکھنے والے کو مزید دو ہزار یونٹ کی اراضی رکھنے کی اجازت دی گئی۔ یعنی ایک شخص

14 ہزار یونٹ کی اراضی رکھ سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بلا معاوضہ زمینداروں سے اراضی حاصل کرنے کے اصول کو تسلیم کر لینا ایک بہت بڑا مثبت اقدام ہے اور اس اصول کو تسلیم کرنے سے دیہاتی محنت کشوں کی تحریک کو بہت مدد ملے گی۔ لیکن حد ملکیت کا تعین کرنے کے لئے خاندان کی بجائے "فی کس" کو بنیاد بنانے کے اصول نے زرعی اصلاحات کے دائرے کو بہت محدود کر دیا ہے۔ اور موجودہ حالات میں جاگیرداری پیداواری رشتے یعنی بٹائی سسٹم اور اس کے تمام لوازمات اور قباحتوں کو مزید زندہ رہنے کی مہلت مہیا کر دی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ 1959ء کے بعد زمینداروں اور جاگیرداروں نے اپنی اراضیات اپنے ورثا اور اپنے عزیز و اقارب میں تقسیم کر دی ہوئی ہیں اور وہ موجودہ اصلاحات کی زد سے تقریباً محفوظ ہیں۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ ایک زمیندار گھرانہ پندرہ ہزار یونٹوں کے عوض کس قدر اراضی رکھ سکتا ہے۔ اگر ایک بڑا زمیندار گھرانہ اوسطاً" 5 افراد پر مشتمل ہو تو وہ پندرہ ہزار یونٹوں کے حساب سے لائلپور میں ایک ہزار ایکڑ' ملتان میں 1240 ایکڑ ساہیوال میں 1088 ایکڑ' لاہور میں 738 ایکڑ' مظفر گڑھ میں دو ہزار ایکڑ' ڈیرہ غازی خان میں' 1550 ایکڑ' بہاولپور میں 1240 ایکڑ' پشاور میں 765 ایکڑ مردان میں 850 ایکڑ لاڑکانہ میں 1937ء ایکڑ نواب شاہ میں 2480 ایکڑ۔ سکھر میں 2660 ایکڑ ٹھٹھہ میں 2818 ایکڑ نہری' یا نہری چاہی یعنی بہترین اراضی رکھ سکتا ہے۔

ان اضلاع میں بارانی اور غیر آب پاش رقبہ اس رقبے سے ڈیڑھ گنا اور دو گنا رکھا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زرعی اصلاحات کے نفاذ کے بعد پنجاب سے صرف دو لاکھ چالیس ہزار ایکڑ اراضی مزارعین میں تقسیم کے لئے دستیاب ہوئی ہے جس میں سے کافی رقبہ ناقص' بے کار اور ناقابل کاشت قسم کا ہو گا اور لازماً" بکھرا ہوا ہو گا۔ یہ رقبہ زیادہ سے زیادہ بارہ چودہ ہزار مزارعین خاندانوں میں تقسیم ہو سکے گا۔ جو گاؤں گاؤں میں بکھرے ہوئے ہوں گے۔ سندھ میں دو لاکھ اکیاون ہزار ایکڑ اور صوبہ سرحد میں اٹھارہ ہزار سات سو پچاس ایکڑ اراضی مزارعین میں تقسیم کے لئے دستیاب ہو گی۔

ظاہر ہے کہ یہ زرعی اصلاحات جاگیرداری نظام کی گھناؤنی اور رجعت پسند بنیادوں کو ختم کرنے میں ناکام رہیں گی۔

اس ناکامی کے اثرات خصوصاً پیپلز پارٹی کے ان اعلانوں کے پیش نظر اور بھی گہرے اور وسیع نظر آئیں گے۔ جو پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں نے انتخابات کے دوران ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی فی خاندان میں تقسیم کرنے کے متعلق کر رکھے ہیں۔

آبیانہ اور بیج

مالیہ اور دیگر ٹیکس تو پہلے ہی مالک اراضی ادا کرتا ہے۔ آبیانہ اور بیج کا خرچہ مالکان کے ذمہ ڈال کر مزارعین کی امداد کی کوشش کی گئی ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ اسی رعایت سے مزارع کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

نہری علاقوں میں جو مزارع گذارہ یونٹ کے حساب سے یعنی ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی کاشت کرتا ہے وہ سال میں کم از کم ایک ایکڑ نیشکر' دو ایکڑ کپاس' چار ایکڑ گندم۔ تین ایکڑ چارہ کاشت کرتا ہے اور باقی اڑھائی ایکڑ اراضی فصلوں کے ہیر پھیر کے لئے استعمال کرتا ہے۔ یا چھوٹی موٹی فصلیں کاشت کرتا ہے۔

ایک ایکڑ نیشکر کا آبیانہ 32 روپے 16 پیسے' دو ایکڑ کپاس کا آبیانہ 31 روپے اٹھائیس پیسے' چار ایکڑ گندم کا آبیانہ 36 روپے اٹھارہ پیسے' 3 ایکڑ چارے کا آبیانہ تقریباً 30 روپے بنتا ہے۔ باقی اڑھائی ایکڑ رقبہ کی کاشت کا بھی تقریباً بیس روپے آبیانہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مزارع کو پہلے ایک صد انچاسی روپے اٹھاسی پیسے سالانہ آبیانہ کے ادا کرنے پڑتے تھے۔ وہ فصل خریف 1972ء سے ادا نہیں کرنے پڑیں گے۔

نیشکر اور آلو کا بیج مالک اور مزارع پہلے نصف نصف ادا کرتے تھے۔ باقی تمام فصلوں کے بیج مزارعہ اپنی گرہ سے ادا کرتا ہے یا زمیندار سے قرض لے کر۔ بیج ڈالتا تھا۔ گنے کی فصل کے ایک ایکڑ کے لئے بیج ادا نہ کر کے مزارعہ کو کم از کم عام حالات میں 50 روپے کی بچت ہوتی ہے۔ کپاس کے دو ایکڑ بیج کے دو روپے' گندم کے چار ایکڑ بیج کے 80 روپے چارہ کے تین ایکڑ بیج کے تیس روپے اور باقی اڑھائی ایکڑ اراضی کے بیج کے بیس روپے لگائے جائیں تو ایک سال کے بیج کی کل بچت مزارع کو تقریباً 182 روپے بنتی ہے۔ آبیانہ اور بیج کے خرچ کی کل سالانہ بچت 321 روپے 81 پیسے ہو گی۔ مزارعین کے لئے یہ سالانہ بچت کاغذی طور پر نہایت ہی خوشنما ہے لیکن یہ اقدام جو بظاہر مزارعین کی آمدنی بڑھانے اور انہیں کچھ رعائتیں دینے کے لئے کیا گیا ہے۔ اس میں مزارعین کی بہتری کے ساتھ ساتھ

خطرناک قباحتیں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ اول تو چھوٹے چھوٹے غیر حاضر مالک اس نئے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اور انہوں نے اپنی آمدنیوں کو بڑھانے کے لئے جو چھوٹے موٹے دوسرے کاروبار شروع کر رکھے ہیں کی بچت آبیانے اور بیج وغیرہ پر خرچ کرنی پڑے گی۔ اس طرح غریب دیہاتی آبادی کے ایک حصہ کو فائدہ پہنچے گا۔ اور دوسرے کو نقصان اور قومی سطح پر کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس کے علاوہ مربع دو مربعے اراضی کے مالکان اور مزارعین میں زبردست کش مکش شروع ہو جائے گی۔ اور جو مالکان اراضی کچھ اراضی خود کاشت کرتے ہیں اور کچھ مزارعین سے کاشت کرواتے ہیں وہ کسی صورت میں بھی نہری پانی مزارعین کو نہیں دیں گے جس پر جھگڑے بڑھیں گے۔ اور خواہ مخواہ کی مقدمہ بازی چلے گی۔ اور دیہات کے غریب محنت کش کی کمائی پٹواری' پولیس اور مقدمہ بازی کی نذر ہو جائے گی۔ اور مالکان اراضی مزارعین کو قانونی اور غیر قانونی طور پر بے دخل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ بے دخلی کی یہ مہم ابھی سے شروع ہو چکی ہے اور بے کس اور غیر منظم مزارعین لاکھوں کی تعداد میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

دیہاتی عوام کے نچلے طبقوں میں یہ خلفشار مزارعین اور چھوٹے مالکوں کے اتحاد کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بنے گا۔ اور درمیانے کسان غیر جانبدار ہونے کی بجائے مزارعین کے مخالف اور بڑے جاگیرداروں اور وڈیروں اور بڑے سرمایہ داروں کی محفوظ طاقت بن جائیں گے۔

زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت بے دخلی کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی البتہ اس قانون کو سارے پاکستان میں لاگو کر دیا گیا ہے جس سے بلوچستان' سندھ اور سرحد کے مزارعین اپنی تنظیمی حالت کے پیش نظر فائدہ اٹھا سکیں گے۔"

جاگیرداروں سے بلا معاوضہ اراضی حاصل کرنے کے اصول کے پیش نظر بڑے زمیندار بھی مزارعین کو بے دخل کرنے اور مشینی کاشت کی طرف رجوع کریں گے۔

اسی طرح دیہات کے لاکھوں افراد بے روزگاری کا شکار ہو جائیں گے۔ اور بیروزگاروں کی صفوں میں مزید اضافہ کریں گے۔ اگر اس زمانے میں عظیم منصوبہ بندی کے تحت وسیع پیمانے پر صنعتیں نہ لگائی گئیں اور بیروزگاروں کو روزگار مہیا نہ کیا گیا تو پاکستانی معاشرہ سخت بحران میں پھنس جائے گا۔

زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت مزارعین کو حق شفع دے دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی

مالک اراضی اپنی زمین بیچے گا تو اسے خریدنے کا سب سے پہلے حق کاشت کرنے والے مزارع کو ہو گا۔ لیکن بدقسمتی سے اس حق سے فائدہ اٹھانے کے لئے مزارعین قیمت ادا نہ کر سکیں گے اور صرف نہری علاقوں کے خوشحال مزارعین ہی اس حق سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

1970ء کے عام انتخابات سے پہلے نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان کسان کمیٹی نے حد ملکیت 100 ایکڑ نہری زمین مقرر کر رکھی تھی۔ دوسری تمام جماعتوں نے پیپلز پارٹی کی مقرر کردہ سطح سے زائد حد ملکیت رکھی ہوئی تھی۔ پیپلز پارٹی نے حد ملکیت 50 ایکڑ سے 150 ایکڑ نہری زمین رکھی ہے۔ تمام پارٹیوں نے یہ حد ملکیت خاندان کے حساب سے نہیں بلکہ فی کس کے حساب سے مقرر کر رکھی تھی۔ اور کسی پارٹی نے بھی زمینداروں کی اراضیات بلا معاوضہ حاصل کرنے کا پروگرام پیش نہ کیا تھا۔

پیپلز پارٹی نے جاگیرداروں سے بلا معاوضہ اراضی حاصل کر کے بلا قیمت مزارعین میں تقسیم کرنے کا اصول تسلیم کر کے جاگیرداروں کے رجعت پسند دانشوروں کے اعتراضات کی دیواروں کو ڈھا دیا ہے اور کسان تحریک کے آگے بڑھنے کے لئے ایک نیا در وا کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کو بلا معاوضہ حاصل ہونے والی اراضیات کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور دیہات میں پیداواری تعلقات میں کوئی اہم تبدیلی برپا نہ ہو سکے گی۔ لیکن زمینداروں سے بلا معاوضہ اراضیات حاصل کر کے بلا قیمت مزارعین میں تقسیم کرنے کا اصول بڑی سیاسی اہمیت کا حامل ہے۔ اور دیہات کے غریب محنت کشوں کی فتح ہے۔

مجموعی طور پر پیپلز پارٹی کی زرعی اصلاحات اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ پاکستانی حیثیت سے پوری طرح زمینداری نظام کے شکنجے نہیں ٹوٹیں گے۔ اور زمینداری نظام پیداواری رشتے پرانی شکل میں قائم رہیں گے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان اصلاحات سے پیدا شدہ منفی ردعمل کی وجہ سے سرمایہ دارانہ طریق کاشت کو فروغ ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی دیہات میں بے روزگاری بڑھے گی اور صنعتوں کے لئے سستے مزدور مہیا ہوں گے۔ اور سرمایہ داری نظام کو مجموعی طور پر فائدہ ہو گا۔

پچھلے تین چار سال میں دیہاتی محنت کشوں اور کسانوں کا شعور بہت بڑھا ہے اور بیداری کی لہر برابر بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی ہے۔ موجودہ زرعی اصلاحات دیہاتی عوام کے اس شعور اور حالات کے تقاضوں سے قطعاً" مطابقت نہیں کرتیں۔ اور نہ ہی دیہاتی عوام کے مسائل حل کر سکیں گے۔ بلکہ عوام کے کچھ حصوں میں ان مسائل کو مزید الجھائیں گے۔

پیپلز پارٹی کی زرعی اصلاحات نے دیہاتی عوام کے بہت سے مسائل کو چھوا ہی نہیں پاکستان کی تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں اس بات پر متفق تھیں کہ گذارہ یونٹ یعنی ساڑھے بارہ ایکڑ نہری زمین کی حد تک کے مالکان اراضی کا مالیہ معاف کر دیا جائے۔ زرعی اصلاحات اس اہم مسئلہ کے متعلق خاموش ہیں۔

تمام سیاسی پارٹیاں اس بات پر متفق تھیں کہ بڑے بڑے سول اور فوجی افسروں کو انعامات میں دی گئی اراضیات کو حاصل کر کے بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا جائے لیکن اس سلسلہ میں بھی نہایت ہی ادھورا اقدام کیا گیا ہے۔

سیاسی پارٹیاں اس بات پر بھی متفق تھیں کہ دیہاتی دستکاروں اور چھوٹے چھوٹے کاروباری لوگوں اور محنت کشوں کے سر سے پیشہ وارانہ ٹیکس کا بوجھ ختم کر دیا جائے۔ موجودہ حالات میں بدلی ہوئی معیشت کا بھی تقاضا یہی تھا۔ لیکن یہ اقدام بھی زرعی اصلاحات کے اعلان میں جگہ نہیں پا سکا۔ اس کے علاوہ دیہات کی غریب ترین آبادی دیہاتی کھیت مزدوروں کی ہے' ان میں بہت بڑی اکثریت غریب عیسائی اور نو مسلموں کی ہے۔ ان کی زندگی ہر قسم کی مجبوریوں کا مجموعہ ہے اور وہ دیہاتی سماج کے باقی سب طبقوں کی نفرت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ زرعی اصلاحات اس مظلوم ترین دیہاتی مخلوق کے متعلق بھی خاموش ہیں۔ دراصل موجودہ نظام کے اندر اس مفلس و مقہور آبادی کے لئے کسی قسم کی اصلاحات کی گنجائش ہی نہ تھی۔

زمینداری نظام کا خاتمہ کیوں ضروری ہے!

ہم نے پیپلز پارٹی کی نافذ کردہ زرعی اصلاحات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ زرعی اصلاحات پاکستان کی معیشت پر کیا اثرات مرتب کریں گی؟ کیا یہ زرعی اصلاحات پاکستان کے زرعی مسائل حل کر سکیں گی۔ یا نہیں؟ ان سوالات کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ آخر زرعی اصلاحات کی ضرورت کیوں ہے؟

جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس وقت پاکستان کی معیشت میں جاگیرداری نظام کو مکمل فوقیت حاصل تھی۔ اور پاکستان کی قومی آمدنی میں سے 90 فیصدی کے قریب آمدنی زراعت سے حاصل ہوتی تھی۔ پرانا جاگیرداری نظام بٹائی سسٹم پر مبنی تھا۔ اس نظام میں پیداواری اوزار' لکڑی کی ہل' رہٹ' اور لوہے کی ٹنڈیں تھیں۔ لیکن پچھلے پچیس سالوں میں لکڑی کے ہل کی جگہ ٹریکٹر اور رہٹ کی جگہ ٹیوب ویل اور دوسری مشینری لے رہی ہے۔ پرانے جاگیرداری نظام کی کوکھ کے اندر نئے پیداواری اوزاروں کے استعمال کا پھیلاؤ بڑھتا اور پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ان کی ترقی کے راستے میں پرانے جاگیرداری پیداواری تعلقات بری طرح حائل ہیں اور سخت رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ نئی پیداواری قوتوں کی ترقی اور کامیابی کے لئے پرانے پیداواری تعلقات یعنی بٹائی سسٹم اور اس کے باقی لوازمات کا خاتمہ کر دیا جائے۔

دوسرے ملکی صنعتی ترقی کی اولین ضرورت ملک کی اندرونی منڈی کو وسیع کرنا ہے تاکہ اندرون ملک صنعتی مال کی کھپت بڑھ سکے۔ اور چونکہ پاکستان کی آبادی کا 85 فی صدی حصہ آج بھی دیہات میں بسا ہوا ہے اور اس میں سے تقریباً 80 فی صدی زراعت کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں وابستہ ہے اور پرانے دقیانوسی اور پس ماندہ نظام معیشت سے وابستگی کی وجہ سے اس کی قوت خرید نہایت ہی کم ہے اس لئے ضروری ہے کہ ایسے اقدامات کئے جائیں جس سے دیہاتی آبادی کی قوت خرید بڑھ سکے۔ اس لئے بھی پرانے پیداواری تعلقات کو توڑنا ضروری ہے۔

تیسرے دیہات کی آبادی پرانے جاگیرداری نظام پیداوار کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے بے روزگاری اور نیم بے روزگاری کی حالت میں رہتی ہے اور اس کی بیکراں پیداواری صلاحیتیں اور قوت خوابیدہ ہے جسے جگانے اور بروئے کار لانے کا اہم مسئلہ درپیش ہے اس مسئلہ کے حل کے بھی اس نظام کو توڑنا ضروری ہے۔

چوتھے اس پرانے جاگیرداری نظام کی وجہ سے دیہاتی آبادی کی عظیم اکثریت' نوکر شاہی اور پولیس' جاگیرداروں اور ان کے گماشتوں' مقامی ظالموں اور غنڈوں اور بدمعاشوں کے طرح طرح کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنی ہوئی ہے اسے ظلم و تشدد سے بچانے کے لئے بھی ضروری ہے کہ پرانا زرعی نظام ختم کر دیا جائے۔

پانچویں' پاکستان باوجود ایک زرعی ملک ہونے کے ابھی تک اناج اور دوسری زرعی اجناس کی پیداوار میں خود کفیل نہیں ہو سکا۔ اور تقریباً 15 لاکھ ٹن غلہ ہر سال درآمد کرتا ہے۔ جس پر کروڑوں روپیہ زر مبادلہ کی شکل میں خرچ کرنا پڑتا ہے۔ زرعی اجناس کی پیداوار میں پاکستان کو خود کفیل بنانا بھی زرعی اصلاحات کا ایک اہم مقصد ہے۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ پیپلز پارٹی کی زرعی اصلاحات نے ان مسائل کو کہاں تک حل کیا ہے۔ قومی اسمبلی میں' سیاسی امور کے وزیر غلام مصطفیٰ جتوئی کے ایک بیان کے مطابق زرعی اصلاحات کے تحت 11 لاکھ' باسٹھ ہزار' سنتالیس ایکڑ اراضی زمینداروں سے بلا معاوضہ حاصل کی گئی ہے۔ اس میں سے 5 لاکھ سات ہزار چھ سو پینسٹھ ایکڑ اراضی پنجاب سندھ اور صوبہ سرحد سے اور باقی بلوچستان سے ہوئی ہے۔ چونکہ بلوچستان سے حاصل شدہ اراضی پیٹ فیڈر کے علاقہ سے تعلق رکھتی ہے جہاں ابھی تک اراضی کی ملکیت کے متعلق جھگڑے چل رہے تھے۔ اور کاغذات مال میں بھی اس کی پیمائش پوری طرح نہیں ہوئی تھی اس لئے پنجاب سندھ اور صوبہ سرحد سے ہی حاصل شدہ اراضی کے متعلق جائزہ لینا مناسب ہو گا۔

اگر یہ حاصل شدہ اراضی تمام کی تمام نہری یا چاہی قسم کی ہو (جو بالکل ہی غیر اغلب ہے) جو ساڑھے بارہ ایکڑ فی کنبہ کے حساب سے چار ہزار چھ سو تیرہ مزارعین کنبوں میں تقسیم ہو سکے گی۔ جبکہ مزارعین کی تعداد 20 لاکھ' 27 ہزار' نو سو نوے ہے اور ان کے علاوہ آٹھ لاکھ چونتیس ہزار دو سو ستاون کنبے ایسے ہیں جن کے پاس گذارہ یونٹ سے کم اراضی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیس لاکھ' 23 ہزار' تین سو ستتر مزارعین کنبے مزارعین ہی رہیں گے۔ اور وہ پرانے بٹائی کے نظام سے وابستہ رہیں گے۔

صدر بھٹو کے اعلان کے مطابق ان کے بچوں کے لئے جرات آزما نئی دنیا کا دروازہ نہیں کھل سکے گا۔ اور ان کی نئی نسلوں کا مستقبل محفوظ نہیں ہو سکے گا۔ اور ان کی زنجیریں نہیں کٹ سکیں گی اور دیہات کی بے کراں آبادی پرانے جاگیرداری نظام کے پیداواری رشتوں میں جکڑی رہے گی۔ اور وہ پرانا روگ جس نے' صدر بھٹو کے الفاظ میں' ارض حسین کا چہرہ صدیوں سے مسخ کر رکھا ہے' جوں کا توں قائم رہے گا۔

ظاہر ہے کہ پیپلز پارٹی کی یہ زرعی اصلاحات پرانے جاگیرداری پیداواری رشتوں کو توڑنے میں ناکام رہی ہے۔ اور نئی پیداواری قوتوں کے پھلنے پھولنے کے لئے حالات مہیا نہیں کر سکیں گی۔

زرعی اصلاحات کا دوسرا مقصد ملک کی اندرونی منڈی کو وسیع کرنا تھا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے 11 لاکھ باسٹھ ہزار اراضی کو گذارہ یونٹ کے مطابق مزارعین کو مہیا کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ اور فصل خریف 1972ء سے آبیانہ اور بیج اور نصف کھاد کا خرچہ مالکان اراضی کے ذمہ ڈال کر مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 24- اگست 1972ء کے ایک اعلان کے مطابق اس قانون کے مطابق مزارعین کو تقریباً 52 کروڑ روپیہ سالانہ کی بچت ہو گی۔ کاغذی طور پر یہ اعلان یقیناً امید افزا ہے لیکن اس اعلان میں بھی بے شمار قباحتیں چھپی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ یہ اقدام بھی اپنی افادیت کھو بیٹھے گا۔ دیہات کے اندر ان گنت چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی نے اپنی زمین مزارعین کو دے رکھی ہے اور وہ خود گذر اوقات کے لئے دوسرے کام کرنے پر مجبور ہیں۔ ایسے مالکان کے لئے آبیانہ اور بیج اور کھاد کا بوجھ ناقابل برداشت ہو گا۔ اس کا مطلب دیہات کی غریب آبادی کے ایک حصہ کی جیب سے روپیہ نکال کر دوسرے حصہ کی جیب میں روپیہ ڈالنے کی شکل میں ظاہر ہو گا۔ اور اس طرح ملکی منڈی میں وسعت پیدا نہ ہو سکے گی۔ نیز اس اقدام کی وجہ سے وسیع پیمانے پر بے دخلیاں شروع ہو جائیں گی۔ مزارعین کو ٹیوب ویلوں اور نہر کا پانی اور بیج اور کھاد مہیا نہیں کی جائے گی۔ اور دیہات کی غریب آبادی میں سخت کش مکش شروع ہو جائے گی۔ جس کا نتیجہ بڑے زمینداروں کے حق میں نکلے گا۔ لیکن اس کے باوجود یہ اقدام مزارعین کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی طرف ایک قدم ہے بشرطیکہ وہ اپنی تنظیم کے ذریعے زمینداروں سے اس قانون پر عمل کروا سکیں۔ خصوصاً نہری علاقوں میں مزارعین اس سے استفادہ حاصل کر سکیں گے۔ افادیت کے اس پہلو کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کرنا

چاہئے۔

زرعی اصلاحات کا تیسرا مقصد یعنی دیہات میں بے روزگاری کا خاتمہ اور دیہاتی آبادی کی خوابیدہ پیداواری صلاحیتوں کو بیدار کرنا بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ اول تو بڑے زمینداروں سے حاصل شدہ اراضی ہی بہت قلیل ہے اور چند ہزار مزارعین خاندانوں کو ہی اس سے فائدہ پہنچ سکے گا۔ دوسرے حکومت نے اپنی ملکیتی اراضی کو فوجی افسروں کے لئے ریزرو کر لیا ہے۔ اور مزارعین کو سرکاری زمینوں پر ملکیتی حقوق دینے اور بے آباد زمینوں کو مزارعین میں تقسیم کرنے کا کوئی جامع منصوبہ تاحال تیار نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے دیہاتی عوام میں بیداری اور زندگی کی وہ لہر جو 71-1968ء میں پیدا ہوئی تھی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔

چونکہ ان ادھوری زرعی اصلاحات کا عمل میں بھی نوکر شاہی کے طور طریقوں سے کیا جا رہا ہے۔ اس لئے بھی دیہاتی عوام پست ہمتی کا شکار ہو رہے ہیں اور سیاسی بیداری اور جدوجہد کے دوران جو اعتماد انہیں حاصل ہوا تھا وہ تحلیل ہو رہا ہے۔

زرعی اصلاحات اپنے چوتھے مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہو سکیں۔ دیہاتی آبادی پر نوکر شاہی، پولیس، زمینداروں، غنڈوں، رسہ گیروں اور بدمعاشوں کا ظلم و تشدد ختم نہیں ہو سکا۔ بلکہ ان کے سر پر پرانے جاگیرداروں، رسہ گیروں کے علاوہ نئے رشوت خور اور ظالم سوار ہو گئے ہیں۔ اور مختلف ہتھکنڈوں سے نہ صرف دیہاتی عوام پر ظلم و تشدد ڈھا رہے ہیں۔ بلکہ وسیع پیمانہ پر رشوت کے ذریعے کسانوں اور مزارعین اور کھیت مزدوروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ 71-1968ء کے دوران ٹھاٹھیں مارتی ہوئی عام بیداری کی لہروں نے جہاں لاکھوں دیانتدار اور محب وطن عوام کو پیپلز پارٹی کی صفوں میں لا کھڑا کیا۔ وہاں ہزاروں ادنیٰ درجہ کے لٹیروں، ٹاؤٹوں، موقعہ پرستوں، چمچوں اور گھٹیا قسم کے سیاسی پیدا گیروں کو بھی پیپلز پارٹی میں شمولیت کا موقعہ مل گیا۔ جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ دیہاتی عوام کے سینوں پر سوار ہوتے جا رہے ہیں۔

یہ زرعی اصلاحات اناج کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کرنے میں بھی ناکام رہیں گی۔ اناج کی زیادہ پیداوار کے لئے جدید آلات کشاورزی (ٹریکٹر۔ ٹیوب ویل، ہارویسٹر) اور مصنوعی کھاد کا زیادہ سے زیادہ استعمال ضروری ہے۔ موجودہ حالات میں سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کو ترقی دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حالانکہ سرمایہ دارانہ معیشت ہی ترقی کے راستے مسدود

کئے ہوئے ہے۔ ایک طرف تو حکومت کی خواہش ہے کہ زراعت میں زیادہ سے زیادہ مشینری اور مصنوعی کھاد استعمال کی جائے اور دوسری طرف روپے کی قیمت میں کمی کی وجہ سے میسی فرگوسن ٹریکٹر کی قیمت 24 ہزار سے بڑھ کر 48 ہزار اور انٹرنیشنل اور فورڈ ٹریکٹر کی قیمت 60 ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے۔ (اب کنٹرول قیمت 40 ہزار کے قریب کی گئی ہے) پاکستان اپنی زرعی ضروریات کے لئے نصف کے قریب مصنوعی کھاد بیرونی ممالک سے درآمد کرتا ہے۔ روپے کی قیمت میں کمی کی وجہ سے کھاد کی بوری کی قیمت 27 روپے فی بوری سے بڑھ کر دوگنی ہو جائے گی۔ فصل خریف 1972ء میں ہی کھاد کی بلیک شروع ہو گئی ہے اور پاکستانی کھاد کی قیمت 37 روپے فی بوری تک پہنچ گئی ہے۔ ڈیزل تیل کی قیمت بھی برابر بڑھتی جا رہی ہے ان حقائق کے پیش نظر ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں امیر کسان اور چھوٹے زمیندار بھی مشینری کا استعمال نہیں کر سکتے۔

یہ زرعی اصلاحات اگر 51-1950ء میں نافذ ہوتیں تو ملکی معیشت کو تقویت بخشتیں۔ لیکن انہیں 1972ء میں نافذ کیا جا رہا ہے۔ جبکہ نئی پیداواری قوتیں ترقی یافتہ ہو چکی ہیں۔ اور مزارعین' ہاریوں اور کسانوں کا شعور بھی بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے زرعی مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں؟

پاکستان کے زرعی مسائل کے حل کے لئے ضروری ہے کہ جاگیرداری نظام کے پیداواری رشتوں کو ختم کر دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں بٹائی سسٹم کا قلع قمع کر دیا جائے اور جاگیرداروں کی تمام اراضی "جیہڑا واہوے اوہو ای کھاوے" کے نعرہ کے مطابق مزارعین اور ہاریوں میں تقسیم کر دی جائے۔

یہ اقدام دیہاتی محنت کشوں کی بے پناہ خوابیدہ صلاحیتوں کو جگا دے گا اور وہ پیداواری میدان میں معجزے برپا کر دیں گے۔

لیکن یہ اقدام بھی ایک عبوری اقدام کے طور پر استعمال ہو سکے گا۔ کیونکہ زمین کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنے سے جہاں لاکھوں مزارعین اور ہاریوں میں نئی قوت پیدا ہو گی وہاں نئے پیداواری آلات استعمال نہیں ہو سکیں گے۔ جدید مشینری کے استعمال کے لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے وسیع کھیت ہوں۔ جدید مشینری کو استعمال کرنے کے لئے انفرادی قوت ناکافی ہے اور انفرادی طور پر کسان اسی پوزیشن میں نہیں ہو سکتے کہ وہ قیمتی مشینری خرید کر استعمال کر سکیں۔ یہ نئے پیداواری آلات سرمایہ داری طریق کاشت میں

استعمال ہو سکتے ہیں۔ جس میں بڑے بڑے فارم سرمایہ دارانہ بنیادوں پر قائم کئے جائیں۔ اور ان میں صنعت کی طرح اجرتی مزدوروں کی قوت کو استعمال کیا جائے لیکن موجودہ حالات میں پاکستان میں سرمایہ دارانہ طریق کاشت کی نشوونما نقصان دہ ہو گی۔ اس سے وسیع پیمانے پر بے دخلی ہو گی۔ اور بے روزگاری بڑھے گی۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے سرمایہ دار جاگیردار موجودہ حالات میں سرمایہ دارانہ فارموں میں اپنا سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس لئے پاکستان میں زرعی ترقی کے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ راستہ ہے اجتماعی کھیتی باڑی کا اس راستے کو اپنانے کے لئے ضروری ہے کہ زمین پہلے ہاریوں اور مزارعین میں تقسیم کی جائے اور پھر پراپیگنڈہ' سیاسی تعلیم اور تجرباتی مثالوں کے ذریعے اجتماعی کھیتی باڑی کے لئے راغب کیا جائے۔ اور مشترکہ کھیتی باڑی کی داغ بیل ڈالی جائے۔

مشترکہ کھیتی باڑی بھی موجودہ نظام میں عمل میں نہیں آ سکتی۔ موجودہ نظام میں ہمیشہ یہ کوشش کی جاتی رہی ہے اور کی جاتی رہے گی کہ ایسی تمام سکیموں کو نوکر شاہی کے ذریعے عمل میں لایا جائے۔ نوکر شاہی کی رہنمائی میں مشترکہ کھیتی باڑی کے تجربات پاکستان میں پہلے بھی کئے جا چکے ہیں جو بری طرح ناکام ہو چکے ہیں بلکہ ملک و قوم کے لئے نئے مسائل کھڑے کرنے کا موجب بنے ہیں نوکر شاہی کی رہنمائی میں مشترکہ کھیتی باڑی کو رواج دینے سے دیہاتی محنت کشوں کی موجودہ نظام کو بدلنے کے لئے عظیم تحریک کی ضرورت ہے۔

زرعی مسائل کے حل کے لئے دوسرا بڑا اقدام جو موجودہ نظام کے اندر اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ حکومت کی ملکیتی زمینوں کو مزارعین اور ہاریوں میں تقسیم کر کے انہیں ملکیتی حقوق دیتے ہیں۔ اس اقدام سے ایک طرف تو نیم بے کار ہاری اور مزارعین کام پر لگ سکیں گے۔ اور دوسری طرف وہ زمینوں پر جانفشانی سے محنت کر کے بے آباد زمینوں کو زیر کاشت لائیں گے۔ اور آباد زمین پر پیداوار بڑھائیں گے۔

لیکن زرعی اصلاحات کے ریگولیشن 115 میں کہا گیا ہے کہ سرکاری زمینوں کا ایک بڑا حصہ فوج کے لئے ریزرو کر دیا گیا ہے۔ سرکاری زمینیں پہلے بھی بڑے سول اور فوجی افسروں میں تقسیم کی گئی ہیں۔ اور اس طرح موجودہ دور میں جبکہ جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کی ضرورت تھی۔ غیر حاضر صاحب بہادر نوکر شاہی اور جاگیرداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ ریگولیشن 115 کے مطابق ایسے طبقے میں اضافہ کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے اس لئے حکومت کی یہ پالیسی زرعی مسائل کے حل کے راستے میں بری طرح حائل ہے۔

دیہاتی عوام میں قوت خرید پیدا کرنے اور ملکی منڈی کو وسیع کرنے کے لئے موجودہ نظام میں ایک اور بھی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ انگریزی سرکار نے پس ماندہ معیشت میں حکومتی نظام کو چلانے کے لئے مالیہ کا نظام وضع کیا تھا۔ اور مالیہ کی وصولی کے لئے نہایت جابرانہ قانون بنائے تھے۔ مالیہ کا یہ نظام آج تک قائم ہے۔ حالانکہ پاکستانی معیشت میں بہت تبدیلی آ چکی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے مالک کو بھی مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس شہروں میں چھ ہزار سالانہ تک آمدنی والے اشخاص کو ٹیکس سے مبرا قرار دیا گیا ہے۔ اس بات پر تقریباً تمام پارٹیاں متفق ہیں کہ ساڑھے بارہ ایکڑ تک کے مالکان اراضی کا مالیہ معاف کر دیا جائے۔ بلوچستان کی حکومت نے پہلے ہی مالیہ معاف کر دیا ہے۔ لیکن بلوچستان میں اس اقدام سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ مالیہ کی وصولی سے پہلے بھی کوئی خاص روپیہ نہ آتا تھا۔ بہرحال پنجاب' سندھ اور سرحد کے صوبوں میں یہ اقدام ضروری بھی ہے۔ اور اہم بھی۔

اس کے علاوہ پنجاب کی غریب دیہی آبادی پر پیشہ وارانہ ٹیکس لگا ہوا ہے۔ جو دیہی کاریگروں اور محنت کشوں پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے اسی ٹیکس کی وصولی کے طریق کار نے اس بوجھ میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے اور ٹیکس انسپکٹر اپنی من مانی کارروائی کرتے رہتے ہیں اور دیہات کے محنت کشوں اور چھوٹے چھوٹے دکانداروں کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے پنجاب میں پیشہ وارانہ ٹیکس بھی فوری طور پر ختم ہونا چاہئے۔

دیہاتی عوام کا ایک اور مسئلہ بھی بہت تکلیف دہ صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ اور وہ مسئلہ دیہات کے محنت کشوں کی رہائش کا مسئلہ ہے۔ سکیم نمبر 7 کے ذریعے غیر مسلم کے متروکہ دیہات میں تو یہ مسئلہ کچھ حد تک حل ہو گیا ہے لیکن مسلم ملکیت کے دیہات میں یہ مسئلہ جوں کا توں موجود ہے۔ اور دیہاتی محنت کش مالکان اراضی کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جھگی اور کوٹھے سے بے دخلی کی تلوار ہر لحظہ ان کے سر پر لٹکتی ہے۔ جہاں مزارع یا ہاری زمین سے بے دخل ہوا وہیں سر چھپانے کی جگہ بھی اس سے چھن جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دیہات کی محنت کش آبادی کو رہائش کے لئے مکانات مہیا کئے جائیں۔ تاکہ وہ اپنی جھگی یا کوٹھے کے چھن جانے کے خوف سے نجات حاصل کر سکیں۔

زمینداری نظام کا خاتمہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ہم نے پاکستان کے زرعی مسائل کو حل کرنے کے لئے مختلف حکومتوں کے ان

اقدامات کا جائزہ لیا ہے جو انہوں نے زرعی معاشی زندگی میں تبدیلیوں کے لئے کئے ہیں۔ اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ اقدامات ادھورے ہیں اور وہ پرانے زمینداری زرعی نظام کے پیداواری رشتوں کو بدلنے میں ناکام رہے ہیں۔ پرانے پیداواری رشتوں کو بدلنے کے لئے ہم نے تجاویز پیش کی ہیں۔ لیکن یہ تجاویز پیپلز پارٹی کی حکومت یا حزب اختلاف کی دائیں بازو کی پارٹیاں یا نیشنل عوامی پارٹی عمل میں نہیں لا سکتی۔

پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کی حکومتیں اپنا تمام تر زور اس بات پر صرف کر رہی ہیں کہ موجودہ نظام کے اندر زرعی پیداوار کو کس طرح بڑھایا جا سکتا ہے۔ اور پاکستان کو کس طرح خود کفیل بنایا جا سکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے زیادہ زور اچھے بیج، کھاد اور مشینری کے استعمال پر دیا ہوا ہے۔ لیکن چونکہ زرعی معیشت ملک کی دوسری معیشت کا ایک حصہ ہے اس لئے یہ ملک کی مجموعی معیشت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پچھلے سال حکومت نے اندرون ملک سے 8 لاکھ ٹن گندم خریدی تھی۔ لیکن اس کے باوجود پی ایل 480 کے تحت 15 لاکھ ٹن کے قریب اناج درآمد کرنا پڑا۔ کچھ ماہرین اقتصادیات کے مطابق روپے کی قیمت میں کمی کے بعد درآمدی گندم کی قیمت 32 روپے فی من کے حساب سے ہو گی۔ حکومت کا کہنا ہے کہ اس کی قیمت 28 روپے من ہو گی۔ اگر حکومت کی بات درست ہو تب بھی حکومت کو موجودہ قیمتوں پر آٹا مہیا کرنے کے لئے تقریباً 8 روپے فی من اپنے پلے سے ادا کرنا ہو گا۔ اس طرح پندرہ لاکھ ٹن اناج کی امدادی رقم 31 کروڑ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ حکومت اپنی سیاسی مجبوریوں اور شہریوں محنت کشوں اور دوسرے عوام کے مظاہروں سے خوفزدہ ہو کر اناج کی قیمتوں کا یہ مصنوعی نظام قائم کئے ہوئے ہیں۔ ڈپوؤں پر ساڑھے اٹھارہ روپے من کے حساب سے آٹا مہیا کیا جاتا ہے لیکن بازار میں تیس چوبیس روپے فی من کے حساب سے گندم فروخت ہو رہی ہے۔ چونکہ غلہ اور دوسری اجناس کی تجارت نجی ہاتھوں میں ہے اس لئے فصل کے موقعہ پر بیوپاری زرعی اجناس سستے داموں خرید کر ذخیرہ کر لیتے ہیں اور بعد میں من مانی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ موجودہ نظام میں کوئی بھی اقدام ان حالات کو نہیں بدل سکتا۔

باوجود ان تمام کوششوں کے ملک کی زرعی پیداواری میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو رہا اور اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کاشتکار اناج کی پیداوار میں کمی کر دیں گے کیونکہ پیداواری خرچ بہت بڑھ گیا ہے لیکن کاشت کاروں کو ان کی اجناس کی قیمت کم ملتی ہے 72-1971ء

میں پاکستان کی کل پیداوار میں 1.7 فی صدی اضافہ ہوا جبکہ آبادی 2.7 فی صدی کے حساب سے بڑھی۔ اس کے علاوہ 1971ء میں پنجاب کی حکومت نے 8 لاکھ ٹن گندم خرید کی تھی لیکن اس سال حکومت صرف پونے دو لاکھ ٹن گندم حاصل کر سکی ہے۔

ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ موجودہ نظام کے اندر نہ تو زرعی پیداوار اس قدر بڑھائی جا سکتی ہے کہ ملک اناج کی پیداوار میں خود کفیل ہو جائے اور نہ ہی صنعتی ترقی کے لئے میدان ہموار کیا جا سکتا ہے۔

پرانے زرعی نظام کے اندر لاکھوں کروڑوں دیہاتی عوام کی بے کراں صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لایا جا سکتا اور نہ ہی اس نظام میں جمہوری اداروں کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ زرعی نظام میں بنیادی تبدیلی لانے کے سب سے اہم مقاصد کروڑہا دیہاتی عوام کی توانائی اور طاقت کو ملکی تعمیر کے لئے استعمال کرنا' صنعتی مال کے لئے منڈی کو وسیع کرنا' اور پس ماندگی اور توہم پرستی میں صدیوں کے جکڑے ہوئے عوام کو آزاد کرانا اور جدید زندگی کی نعمتوں اور آسائشوں سے انہیں بہرہ ور کرنا ہے۔

لیکن سب سوالوں سے اہم سوال یہ ہے کہ ہمہ گیر تبدیلی کیسے لائی جائے؟ کون سی وہ طاقت ہے جو یہ تبدیلی لا سکتی ہے؟ اسے کیسے منظم کیا جائے؟ اس کی رہنمائی کیونکر کی جائے؟ یہ تبدیلی برپا کرنے کے لئے کون سے طریقے کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟

موجودہ پاکستان میں دیہات کی وہ آبادی جو نیم نوآبادیاتی' جاگیرداری اور سرمایہ داری' نظام کے ظلم و تشدد اور لوٹ مار کے تہرے پاٹوں میں پس رہی ہے حسب ذیل طبقات پر مشتمل ہے۔

1- ایک اندازہ کے مطابق 25 ایکڑ سے بڑے فارموں پر کام کرنے والے کھیت مزدوروں کی تعداد تقریباً 12 لاکھ ہے۔ اس کے علاوہ لاکھوں کھیت مزدور چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی کے ساتھ بھی بطور سیری یا معین کے کام کرتے ہیں۔ دیہات کی یہ آبادی بنیادی انقلابی طاقت ہے۔

2- ان کے علاوہ بیس لاکھ 27 ہزار نو سو نوے کے قریب بے زمین مزارعین ہیں۔ یہ کھیت مزدوروں کے مکمل اور مضبوط ساتھی ہیں۔

3- 5 ایکڑ سے کم مالکان کی تعداد تقریباً 24 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ بھی انقلابی دیہاتی آبادی کے ساتھ ساتھ مالیہ معاف کرانے اور گذارہ یونٹ کی زمین حاصل کرنے اور نوکر

شاہی پولیس اور بدمعاشوں کے ظلم و تشدد کے خلاف لڑنے کے لئے دوسری غریب آبادی کے ساتھی ہیں۔

4- 5 ایکڑ سے ساڑھے سات ایکڑ تک کے مالکان کی تعداد تقریباً 5 لاکھ اسی ہزار نو صد باون کے قریب ہے۔

5- اور ساڑھے سات ایکڑ سے ساڑھے بارہ ایکڑ تک کے مالکان کی تعداد تقریباً 7 لاکھ اٹھاون ہزار سات سو تین کے قریب ہے۔

دیہات کے یہ تمام افراد جن کی تعداد مجموعی طور پر 60 لاکھ سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اگر اوسطاً" ان کا خاندان چار افراد پر مشتمل ہو تو ان کی تعداد اڑھائی کروڑ کے لگ بھگ ہو جاتی ہے دیہات کی یہ تمام آبادی صدیوں کی روندی کچلی آبادی ہے اور ایک زبردست انقلابی طاقت ہے صرف یہی ایک طاقت ہے جو صنعتی مزدور طبقے اور دوسرے محنت کشوں اور انقلابی دانشوروں کے ساتھ مل کر موجودہ نظام کو ختم کرے گی۔

یہ آبادی پاکستان کے وسیع دیہاتی علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے اور مختلف علاقوں میں گونا گوں مسائل سے دوچار ہے اس کا شعور اور جدوجہد کی قوت بھی مختلف علاقوں میں مختلف ہے جب تک اس آبادی کو منظم طریقے سے جدوجہد کے راستے پر نہیں ڈالا جاتا۔ پاکستانی عوام کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی پس ماندگی' پاکستان کی معاشی اور سیاسی زندگی پر سامراجی گرفت فرسودہ جاگیرداری نظام کے پیداواری رشتوں کا ہی نتیجہ ہے۔ اور ان پیداواری رشتوں کو بدلے بغیر پاکستانی عوام کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ یہ رشتے نئی پیداواری قوتوں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ دیہاتی عوام میں ان پیداواری رشتوں کو توڑنے کے لئے بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اور دیہات میں "جیہڑا واہوے اوہو کھاوے" یعنی زمین اس کی جو ہل چلائے کا نعرہ مقبول ہو رہا ہے۔ اور لاکھوں کنبوں کے دل کی آواز بن کر آہستہ آہستہ ایک مادی قوت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

پاکستان ورکرز پارٹی نے دیہاتی محنت کشوں کے اس نعرہ کو اپنا لیا ہے اور اپنے پروگرام کا حصہ بنا لیا ہے۔

اس نعرے کے خلاف سرمایہ دارانہ نظام کے حامی دانشور یہ پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ اس طرح زمین چھوٹے چھوٹے قطعات میں بٹ جائے گی۔ اور زراعت میں جدید مشینوں

ٹریکٹر- ہارویسٹر وغیرہ کا استعمال نہیں ہو سکے گا- اور اس طرح زرعی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گے- اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ دارانہ بڑے فارموں کے لئے ضروری ہے کہ بڑے بڑے قطعات اراضی پر مشینوں سے کاشت کی جائے اور ان فارموں پر کھیت مزدور نہایت ہی کم اجرتوں پر کام کریں- لیکن پاکستان میں موجودہ حالات اس قسم کی کھیتی باڑی کے لئے موزوں نہ ہیں- سرمایہ دارانہ بڑے فارموں کے وجود میں آ جانے سے دیہات میں بے روزگاری مزید بڑھ جائے گی- اور چونکہ بھاری اور بنیادی صنعتیں مفقود ہیں اس لئے دیہات کے وافر محنت کشوں کی کھپت نہ ہو سکے گی- اور اس طرح پاکستان کے معاشی مسائل میں مزید الجھنیں پیدا ہو جائیں گی-

اس کے علاوہ پاکستان کے دیہات کے لاکھوں محنت کش کنبوں کی خوابیدہ پیداواری صلاحیتوں اور پہل قدمی کی نشوونما نہ ہو سکے گی اور پاکستان جیسے پس ماندہ اور غریب ملک میں جہاں موجودہ حالات میں بیرونی قرضوں کے بغیر بنیادی اور بھاری صنعتیں لگانی ناممکن ہیں پاکستان کا بال بال سامراجی قرضوں میں پھنستا چلا جائے گا- اس لئے ضروری ہے کہ ہم بیرونی مشروط امداد کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ پاکستانی عوام کی پیداواری صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے اور پاکستان کی تعمیر اور ترقی کے لئے ابتدائی طور پر پاکستانی عوام کی جسمانی محنت جس سے پاکستان مالا مال ہے کو صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے-

پاکستان کے دیہات میں بسی ہوئی صدیوں سے روندی' کچلی مخلوق زمین کے ایک ایک انچ کے لئے ترس رہی ہے- ہر بے زمین کاشتکار کے دل میں زمین کی ملکیت حاصل کرنے کی ننھی سے خواہش صدیوں سے پرورش پا رہی ہے- لیکن اسی خواہش کی تکمیل کے لئے آج سے پہلے کبھی اس قدر حالات سازگار نہیں تھے اور نہ ہی تاریخی اعتبار سے اسی خواہش کو پورا کرنا ممکن تھا- اس لئے دیہاتی عوام کی اسی خوابیدہ طاقت کو آزاد کرانا اور اسے ملکی اور ملی تعمیر کے لئے استعمال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بے زمین کاشت کاروں کو زمین مہیا کی جائے-

زمین کی تقسیم کے بعد ہی سیاسی پراپیگنڈہ اور بھاری مشینری کے استعمال کے عملی مظاہروں سے ہی دیہاتی عوام کو مشترکہ کھیتی باڑی کی طرف راغب کیا جا سکتا-

تاکہ کاشت کاری میں جدید مشینری سے استفادہ حاصل کیا جا سکے- مشترکہ کھیتی باڑی

کسی صورت میں بھی نوکر شاہی کے ذریعے اوپر سے نہیں ٹھونسی جا سکتی۔ اور اگر ایسا کیا گیا تو اس کے نتائج ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ بے زمین کاشت کاروں میں زمین کی تقسیم کے سلسلہ میں ایک اور خدشہ کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اس نعرہ سے ان چھوٹے مالکان اراضی کو نقصان پہنچے گا۔ جو زمین کی کمی کی وجہ سے دوسرے پیشے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس خدشہ میں یقیناً بڑا وزن ہے۔ چھوٹے مالکان اراضی جو خود کاشت نہیں کرتے انہیں بھی زمین سے ویسا ہی لگاؤ ہے جیسا بے مالک کاشتکاروں کو جو زمین پر قابض ہیں چھوٹے غیر حاضر مالک اراضی کی زمین پر قبضہ کرنا اور بٹائی ادا کرنے سے انکار کرنا قدرے آسان ہے اور انہیں اپنے مفادات حاصل کرنے کے لئے کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس رجحان کا لازمی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چھوٹے مالکان اراضی جنہیں بے زمین کاشتکاروں اور کھیت مزدوروں کے ساتھ اتحاد کرنا چاہئے۔ ان کی مخالف صفوں میں جا کھڑے ہوتے ہیں اور اس طرح محنت کش عوام کے وسیع متحدہ محاذ کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور عوام کی صفوں میں انتشار پھیلتا ہے۔ سیاسی کارکنوں کو یہ مسئلہ عملی جدوجہد کے دوران حل کرنا ہو گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس پالیسی کا اعلان کیا جا سکتا ہے کہ چھوٹے مالکان اراضی جو خود کاشت نہیں کرتے اگر چاہیں تو خود کاشت کر سکتے ہیں۔ اور مزارعین کو حکومت کی ملکیتی اراضی متبادل کاشت کے لئے دی جائے گی۔ یہ عملی جدوجہد کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور اسے حل کرنا ضروری ہے۔

دیہاتی محنت کشوں اور کسانوں کی تحریک کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ جدوجہد کے کون سے طریقے اختیار کئے جائیں۔ پرامن یا غیر پرامن۔ حکمران طبقے ہمیشہ محنت کشوں کے خلاف یہ الزام لگاتے رہے ہیں کہ محنت کش عوام گھیراؤ' جلاؤ اور تشدد کے طریقے استعمال کرتے ہیں اس لئے قابل گردن زنی ہیں۔ سرحد میں نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کی حکومت کسان تحریک پر یہی الزام دھر رہی ہے اور اس الزام کی پاداش میں کئی کسان کارکنوں کو جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ کراچی میں بھی مزدوروں کی عظیم ہڑتال کے دوران تشدد کے ایسے الزامات لگا کر لاتعداد مزدور کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ حکومت اور دائیں بازو کی رجعت پسند حکومت کی مخالف جماعتیں بھی متواتر محنت کشوں کے خلاف یہی پراپیگنڈہ کئے جا رہی ہیں۔ اور اس طرح دیہاتی اور شہری محنت کشوں کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے فضا تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

حقیقت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دیہات کے محنت کش طبقے صدیوں سے ایک دقیانوسی اور پس ماندہ اور بے نور زندگی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور پہاڑ جیسے غموں کو سینوں میں چھپائے حکمران طبقوں کی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تشدد چپ چاپ سہتے چلے آ رہے ہیں۔ کون سا ظلم ہے جو ان پر روا نہیں رکھا گیا؟ کون سا تشدد ہے جو ان پر نہیں کیا گیا؟ جب بھی کبھی انہوں نے اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کی۔ ریاست کے غیر مسلح اور مسلح شعبے ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کی برحق آواز کو بند کر دیا گیا اور انہیں کچل کے رکھ دیا گیا ہے۔ دیہاتی محنت کشوں کے خلاف حکمران طبقوں کا تشدد صدیوں سے جاری ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شدت بڑھتی جا رہی ہے لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات میں دیہات کے محنت کشوں نے اس ہمہ گیر تشدد کی مزاحمت شروع کر دی ہے اور بعض اوقات وہ تشدد کا جواب تشدد سے دینے لگے ہیں۔ اپنی مدافعت میں جب کسانوں کے ہاتھ اٹھنے لگے ہیں تو حکمران اور لوٹ مار کرنے والے طبقے چیخ اٹھے ہیں کہ کسان تشدد پر اتر آئے ہیں۔ اور وہ تشدد کا پرچار کرتے ہیں۔ دراصل تشدد کا پرچار استحصال کرنے والے بڑے بڑے زمیندار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ عملی طور پر تشدد کر رہے ہیں۔ سرحد کے کسانوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ زمیندار، اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعے متواتر پراپیگنڈہ کئے جا رہے ہیں کہ سرحد میں مزارعین تشدد کر رہے ہیں لیکن عجب بات ہے کہ پچھلے ایک سال میں تقریباً ایک صد سے زائد مزارعین گولی کا نشانہ بن چکے ہیں۔ اور بڑا زمیندار کوئی بھی تشدد کا نشانہ نہیں بنا۔ پنجاب میں بھی متعدد زمینداروں کے مزارعین کے خلاف تشدد کے واقعات ہو چکے ہیں۔ جن کے ذریعے بے شمار مزارعین کو گولیوں کی بوچھاڑ کر کے بے دخل کیا گیا ہے۔ اور ان کی زمینوں جھگیوں اور گھروں پر قبضہ کر لیا گیا ہے۔ لیکن کسی حکومت کی طرف سے غریب محنت کشوں کے خلاف اس تشدد کی نہ تو مذمت کی جاتی ہے اور نہ ہی روک تھام کی جاتی ہے اور نہ ہی دیہاتی محنت کشوں کے مسائل حل کئے جاتے ہیں۔ ان حالات میں اگر دیہاتی محنت کش طبقے اپنی مدافعت میں تشدد کا جواب تشدد سے دیتے ہیں تو انہیں کیوں کر مطعون کیا جا سکتا ہے۔ حکمران طبقوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اگر وہ دیہات میں پرانے پیداواری تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے تشدد جاری رکھیں گے تو آہستہ آہستہ دیہات کے محنت کش تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق تشدد کا جواب تشدد سے دینے پر مجبور ہو جائیں گے اور ایسے حالات پیدا کرنے کی ذمہ داری خود حکمران طبقوں پر ہو گی۔

پاکستان کے مختلف علاقے ترقی کے مختلف مدارج سے گذر رہے ہیں اور معاشی ترقی کی اس ناہمواری اور کئی تاریخی اور علاقائی مخصوص حالات کی وجہ سے مختلف علاقوں میں عوام کا شعور بھی مختلف ہے اور ان کی جدوجہد کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ جن علاقوں میں دیہاتی عوام کا شعور ابھی ابتدائی مرحلے پر ہے وہاں دیہاتی عوام کے چھوٹے چھوٹے مطالبات کے لئے جدوجہد کے ابتدائی طریقے استعمال کرنے چاہئیں۔ دیہاتی عوام پر پولیس اور نوکر شاہی کے ظلم و تشدد اور غنڈوں اور بدمعاشوں اور رسہ گیروں کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے اور دیہاتی محنت کشوں کے جس قدر حصے بھی ان مطالبات پر اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ انہیں اکٹھا کرنا چاہئے۔ دیہات میں پیشہ وارانہ ٹیکس اور ساڑھے بارہ ایکڑ تک کے مالکان اراضی پر مالیہ کا بوجھ ختم کرنے اور نہری پانی' سستی کھاد اور دیہات میں غریبوں کو مکانات کی ملکیت دلوانے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔

ابتدائی طور پر یہ جدوجہد اشتہارات' جلسوں' جلوسوں کے ذریعے شروع کرنی چاہئے۔ اور اس جدوجہد کے دوران مستقل مزاج اور انقلابی علم سے لیس سیاسی کارکن پیدا کرنے چاہئیں۔ ایسے منجھے ہوئے ڈسپلن کے پابند' اور ارفع نصب العین کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہ کرنے والے سیاسی کارکن ہی عظیم انقلاب، کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ ملک کے اندر خواہ کتنے ہی انقلابی حالات کیوں نہ پیدا ہو جائیں ایسے انقلابی کارکنوں اور مقامی رہنماؤں کے بغیر انقلاب ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

جن علاقوں میں کسانوں کی تحریک آگے بڑھ چکی ہے اور اس نے اپنے تجربات سے جدوجہد کے دوسرے طریقے اختیار کر لئے ہیں اور حکمران طبقوں کے تشدد کا نشانہ بن رہی ہے اس کی بھرپور حمایت کرنی چاہئے۔ اور اس کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی آڑ لے کر اس میں کیڑے نکالنے کی بجائے ان کمزوریوں کی نشان دہی کر کے درست کرنے میں مدد دینی چاہئے۔ کوئی عوامی تحریک بھی جچے تلے اصولوں اور ایک پہلے سے گھڑے ہوئے اصولوں کے سانچے کے مطابق رخ اختیار نہیں کرتی۔ عوامی تحریکیں اپنے مخصوص حالات کے مطابق اپنے طریقے اور رخ خود متعین کرتی ہیں۔ سیاسی کارکنوں کا کام یہ ہے کہ وہ ان تجربات کو اکٹھا کر کے تحریک کے عام اصولوں اور طریقوں کو وضع کریں۔ جو طریقے اور اصول درست ہوں اور تحریک کو آگے لے جانے والے ہوں انہیں آگے بڑھائیں اور جو اصول اور طریقے نقصان دہ ثابت ہوں انہیں ترک کر دیں۔

بائیں بازو کے ایک سیاسی گروہ نے یہ سیاسی لائن اختیار کر رکھی ہے کہ چونکہ پاکستان ابھی قومی جمہوری انقلاب کے دور میں ہے اس لئے پاکستانی عوام کی رہنمائی کا بیڑا بورژوا اور روشن خیالی زمیندار ہی اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسی دھن میں نیشنل عوامی پارٹی (ولی خاں گروپ) کے اندر ان بورژوا رہنماؤں کی قیادت میں موجودہ بدلے ہوئے حالات میں بھی بزعم خود "انقلاب" کے پرچم اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ اور کسانوں پر بھی انہیں رہنماؤں کا اثر و رسوخ قائم کرنے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ اور محنت کشوں کی متبادل قیادت کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ ان بورژوا اور فیوڈل رہنماؤں نے ان ترقی پسند کارکنوں کو قومیتوں اور جمہوریت کے مسائل میں الجھا کر رکھ دیا ہے اور وہ پیداواری تعلقات میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے کام کو نہ صرف ثانوی حیثیت دے رہے ہیں بلکہ بھول ہی گئے ہیں اور اس طرح محنت کش طبقوں کی صفوں میں سرمایہ دار جاگیردار طبقوں کے خیالات اور رہنمائی کو مضبوط کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہ ہے کہ قومیتوں اور جمہوریت کے مسائل غیر اہم ہیں۔ یقیناً یہ مسائل بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن اس تمام اہمیت کے باوجود وہ پیداواری قوتوں اور تعلقات میں بنیادی تبدیلیاں لانے کے مسائل کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ان مسائل پر محنت کش طبقوں اور سرمایہ دار جاگیردار طبقوں کے نظریات بھی مختلف ہیں۔

بائیں بازو کے کچھ دوسرے گروہ پیپلز پارٹی اور ذوالفقار علی بھٹو کی رہنمائی میں زرعی انقلاب برپا کرنے کے لئے کوشاں ہیں اس میں کوئی شک نہیں 71-1968ء کے درمیان پیپلز پارٹی نے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں دیہات کے محنت کشوں، مزارعین اور چھوٹے مالکان اراضی کو خواب گراں سے جگایا ہے اور انہیں ایک فعال قوت بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں اس قیادت کے متعلق عوام میں خوش فہمیاں پیدا کرنا موقعہ پرستی اور رجعت پسندی کو تقویت دینے کے مترادف ہے۔

موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ بائیں بازو کے گروہ اپنی خود مختارانہ اور آزاد قیادت میں دیہات کے محنت کشوں اور کسانوں کی رہنمائی کریں۔ اور کسانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے وسیع تر متحدہ محاذ بنانے کے لئے جدوجہد کریں۔

سابقہ زرعی اصلاحات کی باقیات اور ادھورے عملدرآمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ

عرصہ سے میاں نواز شریف بے زمین کسانوں میں زمین تقسیم کرنے کا بہت چرچا کرتے رہے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں سندھ' بلوچستان وغیرہ کا دورہ کر چکے ہیں۔ 20- اگست 1998ء کے روزنامہ دن کے مطابق پنجاب میں ایک لاکھ سرکاری اراضی پر وڈیرے اور قبضہ گروپ قابض ہیں۔ اس میں سے مظفر گڑھ میں 36527' راجن پور میں 29247' اٹک میں 1837' خوشاب میں 1821' جہلم میں 96' چکوال میں 67' میانوالی میں 365' لاہور میں 2605' فیصل آباد میں 7705' وہاڑی میں 1583' ساہیوال میں 1692' خانیوال میں 819' پاک پتن میں 107' بہاول پور میں 3111 اور چولستان میں 6803 ایکڑ سرکاری اراضی پر مختلف لوگ قابض ہیں۔ مختلف حکومتوں نے یہ قیمتی اراضی واپس حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اور اب میاں نواز شریف اس اراضی کو حاصل کرنے کے عزم کا اظہار کر رہے ہیں۔ پنجاب میں حکومتی ملکیت کی اس اراضی کی صحت درست نہیں ہے۔ کیونکہ پنجاب میں پٹواری بے شمار اراضی حکومت کو رپورٹ کرتے وقت ظاہر ہی نہیں کرتے اور حکومتی اراضی کو زمینداروں کی ملی بھگت سے اپنے استعمال میں لاتے رہتے ہیں۔ جب تک اراضی کے اس نظام کو کمپیوٹرائزڈ نہیں کیا جاتا۔ صحیح اعداد و شمار ملنے مشکل ہیں۔

2- اکتوبر 1998ء کے ڈان کے مطابق صوبہ سرحد کے تین اضلاع میں تین لاکھ اسی ہزار چار صد ایکڑ اراضی' جو 1959ء' 1972ء' اور 1977ء کی زرعی اصلاحات میں حاصل کی گئی تھی لیکن آج تک بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم نہیں کی گئی۔ اس اراضی میں تین لاکھ ایکڑ اراضی ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں' اسی ہزار ایکڑ مانسہرہ ضلع ہزارہ میں' اور چار صد ایکڑ اراضی مردان ضلع میں ہے۔ تیس ہزار ایکڑ اراضی وادی کاغان میں ہے۔ اس اراضی میں سے ایک لاکھ ایکڑ اراضی بے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ ریونیو بورڈ کے خیال میں چالیس ہزار ایکڑ مزید اراضی دستیاب ہو گی جس کے متعلق اس وقت ہائی کورٹ میں مقدمات چل رہے ہیں۔

5- اکتوبر 1998ء کے ڈان کے مطابق بلوچستان میں دس لاکھ پچپن ہزار ایکڑ سرکاری اراضی پر زمینداروں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ تین فروری 1998ء کے ڈان کے مطابق بلوچستان میں بے زمین کسانوں میں 60526 ایکڑ زمین تقسیم کی ہے۔ جبکہ مزید 247614 ایکڑ زمین تقسیم کی جائے گی۔ اس کے علاوہ ستر ہزار ایکڑ اراضی کا ابھی بندوبست مکمل نہیں ہوا۔ جو جلد ہونے کا امکان ہے۔ نواب آف قلات نے کہا ہے کہ زمیندار زمین نہیں چھوڑیں گے

بلکہ اس کے لئے لڑائی ہو گی۔

اس کے علاوہ سندھ کے اندر کافی اراضی جو زرعی اصلاحات میں حکومت نے حاصل کی تھی آج تک تقسیم نہیں ہوئی۔ نواز شریف نے کچھ علاقوں میں ایسی اراضی پر بے زمین کسانوں کو حقوق دیئے ہیں۔ لیکن ابھی تک بہت سی اراضی چھپی ہوئی موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں ابھی تک زرعی زمینوں کے متعلق کوئی خاص منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ لاکھوں ایکڑ اراضی جو زیر کاشت لائی جا سکتی ہے اسے ہموار کرنے یا سیم و تھور ختم کرنے کے متعلق کوئی مربوط پالیسی نہیں بنائی جاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے ہماری زرعی ترقی آگے نہیں بڑھ رہی۔ 20- دسمبر تا 26- دسمبر کے جنگ میگزین میں سابق صوبائی وزیر زراعت اور ممتاز کاشتکار خدا بخش بچہ نے پنجاب میں زراعت کی زبوں حالی اور حکومت کی عدم توجہی کے متعلق عوام کو یہ توجہ دلائی ہے کہ ہمارے ملک میں گندم کی فی ہیکٹر اوسط پیداوار دنیا کی اوسط پیدوار سے کم ہے۔ 96_1995ء کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی اوسطاً" فی ہیکٹر گندم کی پیداوار 2536 کلو گرام ہے۔ چین میں گندم کی فی ہیکٹر اوسطاً" پیداوار 3690 کلو گرام' امریکہ کی فی ہیکٹر پیداوار 2441 کلو گرام' بھارت کی فی ہیکٹر گندم کے پیداوار 2570 کلو گرام جبکہ 96-1995ء کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی فی ہیکٹر پیداوار اوسطاً" 2018 کلو گرام ہے۔

پاکستان کو گذشتہ سال تقریباً 45 لاکھ ٹن گندم در آمد کرنی پڑی اور اسی سال بھی 22 لاکھ ٹن گندم در آمد کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ دراصل گندم کی پیداوار بڑھانے کے لئے کوئی مثبت اقدام نہیں کئے جاتے۔ حکومت نے باہر سے 340 روپے فی چالیس کلو گرام گندم در آمد کی ہے لیکن پاکستان کے کاشتکاروں کو صرف 240 روپے فی چالیس کلو گرام قیمت ادا کی جاتی ہے۔ پاکستان میں زراعت کے شعبہ میں سب سڈی یعنی امداد کی پالیسی کو بتدریج ختم کر دیا ہے۔ حالانکہ بھارت میں ہر سال تقریباً 10 ہزار کروڑ روپیہ کی سب سڈی آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی مخالفت کے باوجود کاشتکاروں کو دی جاتی ہے---- بھارتی پنجاب میں ٹیوب ویلوں کی تعداد 9 لاکھ ہے جبکہ ہمارے پنجاب میں ٹیوب ویلوں کی کل تعداد 4 لاکھ چودہ ہزار ایک سو اٹھاسی ہے۔ حالانکہ ہمارے پنجاب میں بھارتی پنجاب کے زیر کاشت رقبہ سے بہت زیادہ ہے۔ بھارتی پنجاب میں زیر کاشت رقبہ تقریباً چالیس لاکھ ہیکٹر ہے جبکہ پاکستان میں پنجاب کا زیر کاشت رقبہ ایک کروڑ 20 لاکھ ہیکٹر ہے لیکن پیداوار میں کمی رہتی ہے۔

حکومت نے زرعی شعبہ کے لئے صرف 40 بلین روپے کی رقم مختص کی ہے۔ جبکہ صنعتی اور تجارتی شعبوں کے لئے تقریباً 192 بلین روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ حالانکہ زرعی شعبہ قومی آمدنی میں 25 فیصد کے قریب حصہ مہیا کرتا ہے۔ اور صنعتی شعبہ تقریباً 20 فیصد۔ یا اس سے کچھ زائد۔ زرعی شعبہ برآمدی تجارت میں تقریباً 70 سے 75 فیصد حصہ مہیا کرتا ہے۔ جو کہ ان کی اجناس سے حاصل شدہ رقم پر مشتمل ہے۔

مراعات دینے کی بجائے ان پر پہلی مرتبہ ٹیکس لگایا گیا ہے۔ اور وہ ناقابل برداشت ہے۔ کیونکہ صوبہ سرحد میں بیاسی ایکڑ پر سو روپے سالانہ ٹیکس لگا ہے مگر پنجاب میں 85 ایکڑ کے مالکان پر تو سو روپیہ فی ایکڑ ٹیکس اور 25 سے 50 ایکڑ کے مالکان پر 300 روپیہ فی ایکڑ ٹیکس لگایا گیا ہے۔ اس سے زائد زمین والوں کو 250 روپے فی ایکڑ ٹیکس دینا پڑتا ہے۔

بے زمین کسانوں میں زمینیں تقسیم کرنے کے متعلق نواز شریف کے مسلسل بیانات آ رہے ہیں اور ایسا تاثر دیا جا رہا ہے جیسے نواز شریف نے کوئی نئی زرعی اصلاحات نافذ کر دی ہیں۔ حقیقت یہ نہیں ہے۔ دراصل یہ وہ زمینیں ہیں' جو 1959ء' 1972ء اور 1977ء کی زرعی اصلاحات سے حاصل کی گئی تھیں۔ لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم نہ کی جا سکیں۔

تنظیم اسلامی کے سربراہ مولانا اسرار احمد نے اپنے ایک بیان میں (جنگ 6 ستمبر 1998ء) میں کہا ہے "لہٰذا یہاں کسی سماجی انصاف کا کوئی تصور تک نہیں کیا جا سکتا جب تک جاگیرداری اور زمینداری کے موجودہ نظام کو ختم کر کے ایک بالکل نئے اور منصفانہ بندوبست اراضی کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ جب تک یہ نظام موجود ہے اور ستر پچھتر فی صدی انسان جاگیرداروں' وڈیروں' بڑے زمینداروں اور قبائلی سرداروں کے زیر نگین ہیں دستور مملکت میں درج حقوق شہریت بالکل بے معنی ہیں۔ ایک عظیم ادیب اور کالم نگار احمد ندیم قاسمی صاحب نے 18 اکتوبر 1998ء کے جنگ میں اپنے کالم میں تحریر کیا ہے "کیا ہی اچھا ہوتا اگر میاں نواز شریف پارلیمنٹ میں شریعت بل پیش کرنے سے پہلے ایک ایسا مسودہ قانون ایوان میں پیش کرتے جس کے تحت پاکستان کی سیاسیات' اقتصادیات اور زراعت پر سے فیوڈلزم کا منحوس سایہ ہمیشہ کے لئے ہٹ جاتا اور یہ مملکت اس صاف ستھری اور ہر قسم کے جبر سے آزاد جمہوریت کی طرف پہلا قدم اٹھاتی جو اسلامی احکامات کا اثبات ہے۔ اور جس کے دم سے شریعت کا نفاذ نہ دشوار رہتا ہے اور نہ مخالفتوں کی زد میں آتا ہے۔"

"آخر وزیراعظم صاحب اس ایوان سے شریعت بل منظور کرانے پر کیوں مصر ہیں، جس کے بیشتر ارکان کی اندھا دھند ملکیتیں شریعت کی روح کے ہی منافی ہیں۔ شریعت کا نفاذ ان افراد اور ان اداروں سے ہونا چاہئے جو اسلامی مساوات کو محض کھوکھلے نعرے کے طور پر استعمال کرتے ہوں۔ بلکہ اسے عملاً نافذ کرنا چاہتے ہوں۔ مگر ان افراد اور اداروں کی تعداد' پارلیمنٹ' سینٹ میں دردناک حد تک مختصر ہے۔ سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو طریق انتخاب رائج ہے اس کے تحت کوئی بھی ایسا شخص انتخاب لڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا جو ان چند لاکھوں روپے کا بندوبست ہی نہیں کر سکتا جس کے بغیر الیکشن میں کھڑے ہونا ایک مزاحیہ فعل قرار پاتا ہے۔

"پاکستان کے آئین میں وہ تمام تحفظات پہلے سے موجود ہیں جو پاکستان میں رائج قوانین کو شریعت کے مطابق ڈھالنے اور نئے قوانین کو شرعی جواز کے ساتھ پیش کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج بھی پاکستان کے اندر کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکتا جو شریعت سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔"

"انہیں پہلا اقدام یہ کرنا چاہئے کہ بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیرداریاں اور سرداریوں کو یک قلم ختم کر دیا جائے۔ تاکہ ہمارے ملک کی 75 / 80 فیصدی آبادی آزادی کا سانس لے سکے۔ اور وڈیروں' سرداروں' پیروں' خانوں' ملکوں' چودھریوں وغیرہ کی گرفت سے نکل سکے۔"

"شریعت بل سے پہلے اگر یہ بڑی بڑی زرعی ملکیتیں ختم کر دی جائیں تو بیشتر علمائے دین بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ اقدام بھی شریعت کے عین مطابق ہو گا۔ اور اس صورت سے شریعت کا نفاذ قطعی ناگزیر ہو جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ ارباب حکومت میری ان معروضات پر کریمانہ انداز میں فوری طور پر غور فرمائیں گے۔"

ان دو صاحب علم اور نیک نیت حضرات کے مطابق زرعی اصلاحات کا نفاذ شریعت بل پاس کروانے سے پہلے ضروری ہے کیونکہ "زرعی اصلاحات کے نفاذ سے ہی جاگیرداروں' وڈیروں اور خانوں کی بے پناہ طاقت توڑی جا سکتی ہے۔ اگر زرعی اصلاحات کا نفاذ نہ کیا جائے اور وزیراعظم کی صوابدید کے مطابق شریعت بل پاس کروا دیا جائے تو یہ لوگ اپنی طاقت اور اختیارات سے شریعت کے نفاذ کو ناممکن بنا دیں گے اور ایسا معاشرہ جو صاف ستھرا ہو' انصاف و مساوات کا علمبردار ہو بلکہ جس میں انصاف اور مساوات زندگی کے ہر شعبے میں نظر آئے

قائم ہو سکتا ہے۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ جس طرح قرون وسطیٰ کے زر خرید عالمان دین' ظل الٰہی یعنی وقت کے بادشاہ کے مفادات کے عین مطابق فتوے دے کر انہیں خوش کرتے تھے اور خود موجیں اڑاتے تھے۔ آج کے حالات میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ اور کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوئی کہ پاکستان پر کیا غضب ڈھایا گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر اسرار احمد جیسے عالم فاضل اور باخبر حضرات کو بھی اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ زمانہ کیا چال چل گیا ہے اور 1989ء میں قزلباش وقف کیس میں پاکستان کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ شریعت اپیلٹ بنچ نے ایک نہایت ہی طویل بحث مباحثہ کے بعد فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ فروری 1990ء سے زرعی اصلاحات کے 1972ء اور 1977ء کے قوانین کالعدم ہوں گے۔ اور ان کی دفعات 3 سے 17 تک' جن کے تحت بڑے زمینداروں سے زمین لی گئی تھی قانون کی کتاب سے خارج سمجھے جائیں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ وڈیروں' بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں سے بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کرنے کے لئے زمین حاصل نہیں کی جا سکے گی۔ اور ہر شخص جس قدر چاہے زرعی اراضی رکھ سکتا ہے۔ 1959ء' 1972ء' 1977ء کی زرعی اصلاحات کے بعد تو بڑے زمینداروں نے اپنی ملکیتیں بچانے کے لئے وفادار کاشتکاروں یا اپنے خاندان کے ورثاء کے نام زمین منتقل کر کے محفوظ کر لی تھی۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی اور شریعت محمدی کے مطابق وہ جس قدر اور جتنی چاہیں زمین رکھ سکتے ہیں۔ اور شریعت ان کا تحفظ کرے گی۔

اس سے پہلے ایسی ہی ایک عدالت نے مزارعین کے حق شفع کو بھی شریعت کے خلاف قرار دے دیا اور اس طرح مزارعین کا وہ حق بھی چھین لیا جس کے ذریعے وہ قیمت ادا کر کے زمین کے مالک بن سکتے تھے۔ یہ دونوں قوانین اسلامی فتوؤں کی مانند ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ دس بارہ سال گذرنے کے بعد بھی آج تک کسی عالم دین یا مدبر نے ان کے خلاف آواز نہ اٹھائی۔

شریعت کے نام پر جب تک یہ قوانین موجود ہیں۔ زرعی اصلاحات نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی بڑے زمینداروں کی طاقت توڑی جا سکتی ہے۔ بلکہ ان کی طاقت تو مزید بڑھتی چلی جا رہی ہے اور اب تو نواز شریف اور دوسرے سرمایہ داروں (جنہوں نے تمام روپیہ سرکاری بنکوں سے قرض لے کر صنعتیں قائم کی ہیں اور قرض ادا نہیں کرتے) نے بھی سینکڑوں

ایکڑوں پر مشتمل زرعی فارم بنا لئے ہیں۔ وڈیرہ شاہی کے ظالمانہ نظام میں تو آج بھی سندھ میں غریب ترین طبقے سے تعلق رکھنے والے مردوں' عورتوں اور بچوں کو زنجیروں میں جکڑ کر غلاموں کی طرح بڑی بڑی حویلیوں میں بند رکھا جاتا ہے اور کھیتوں میں کام کروانے کے لئے بھی غلاموں کی طرح محافظ انہیں کھیتوں میں کام کرنے کے لئے لے جاتے ہیں۔

جب تک اوپر بیان کئے گئے سپریم کورٹ اپیلٹ بنچ کے یہ فیصلے قائم ہیں ملک میں بے زمین کاشتکاروں کے حق میں زمین کی ملکیت کے لئے کوئی اقدامات نہیں کئے جا سکتے۔ وہ عالمان دین جو اس بات کا پرچار کر رہے ہیں کہ مزید زرعی اصلاحات پاکستان میں تمام بیماریوں' بدعتوں' بے راہرویوں' ظلموں اور ناانصافیوں کے خاتمے کے لئے ضروری ہیں انہیں سپریم کورٹ کے اپیلٹ بنچ کے اس فیصلہ کے خلاف لوگوں کو مشورہ دینا چاہئے۔ زر خرید اور موجودہ استحصالی نظام کے علمبردار گمراہ عالم زرعی اصلاحات کو اسلامی احکامات کے خلاف قرار دے کر دراصل اس معاشرہ کو بدعتوں اور ناانصافیوں سے پاک کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس ظالم نظام کو دوام بخش رہے ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر موجودہ نظام کو جوں کا توں رکھنا چاہتے ہیں۔

اسی لئے ضروری ہے کہ ان محب وطن اور روشن خیال عالمان دین کی ایک کانفرنس کا اہتمام کیا جائے جو شریعت اپیلٹ بنچ قزلباش وقف بنام چیف لینڈ کمشنر کے فیصلہ (پی ایل ڈی 1990ء سپریم کورٹ صفحہ 99) کی اسلامی احکامات کی روشنی میں تردید کریں اور اسی پہاڑ جیسے بند کو جو پاکستان کی ترقی کی راہ میں باندھ دیا گیا ہے' توڑ دیں۔ آج کے حالات میں جبکہ پاکستانی سماج کی زندگی کے ہر شعبہ میں انتہائی شرمناک گراوٹ چھا چکی ہے' بہتری کی امید رکھنا عبث ہے۔ اس سے کوئی مثبت تبدیلی نہیں آئے گی اور مزید گراوٹ گہری اور اذیت ناک ہوتی جائے گی۔ اور اسلام کے نام پر ان غیر شرعی اور غیر اسلامی فتووں کے پردے میں بدترین استحصالی نظام کو دوام بخشا جائے گا اور غریب کسانوں' مزارعین اور کاشتکاروں کے زندہ رہنے کے حقوق کی خاطر جدوجہد کرنے والوں کے خلاف شرعی قوانین اور اسلام کی مخالفت کے فتوے صادر کئے جائیں گے جیسا کہ پچھلے 52 سالوں میں ہوتا آیا ہے اور ان رجعت پسند خیالات کو عوام کے ذہنوں میں اسی طرح سمو دیا جائے گا کہ وہ ان نظریات کو رضائے الٰہی سمجھ کر اپنی قسمت پر قانع ہو جائیں گے اور اس امید پر جئیں گے کہ قیامت کے بعد انہیں جنت کی مبارکیں ملیں گی اور ان ظالموں کو دوزخ میں پھینکا جائے گا۔

اضافی نوٹ

یہ مضمون ابتدائی طور پر بھٹو کی زرعی اصلاحات کے نفاذ کے متعلق لکھا گیا۔ زمین کی ملکیت اور اس سے متعلقہ دوسرے اعدادوشمار جو اس وقت میسر تھے وہ دے دیئے گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد زرعی معیشت میں اور زمین کی ملکیت میں کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ جن کے اعدادوشمار جس حد تک میسر تھے وہ مضمون کے آخری حصہ میں دیئے گئے ہیں۔ لیکن بہت سی دوسری تبدیلیاں جو رونما ہوئی ہیں وہ جگہ نہیں پا سکی۔ مثال کے طور پر۔

1999-2000ء میں گندم کی پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور اس سال گندم کی پیداوار ایک کروڑ ٹن سے تجاوز کر گئی ہے حتیٰ کہ حکومت اس پیداوار کو سنبھال نہیں سکی۔ کیونکہ اسے سٹور کرنے کے لئے گودام ہی نہیں تھے۔ محکمہ فوڈ کے افسران نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر آڑھتیوں کی ملی بھگت سے کروڑوں روپے کی گندم خورد برد کر لی ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سے محکمہ فوڈ کے افسران گرفتار ہو چکے ہیں' لیکن یہ پیداوار حکومت کی کوششوں سے نہیں بڑھی۔ بلکہ 1998ء میں مارشل لاء حکومت نے عین اس وقت اقتدار سنبھالا جب گندم کی کاشت ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس نئی حکومت سے ڈر کر زہریلی کیڑے مار ادویات اور کھاد میں ملاٹ نہیں کر سکے اور وہ صحیح مقدار میں بغیر آمیزش کے کاشتکاروں کو میسر آ گئیں اور پیداوار بڑھ گئی۔ اور فی ایکڑ پیداوار 50-40 من فی ایکڑ کے لگ بھگ ہو گئی۔

ان چند سالوں میں ایک اور تبدیلی جو رونما ہوئی ہے وہ بارشوں کی بے حد کمی اور زیر زمین پانی کی سطح متواتر نیچے جانے کی ہے۔ جس کے نتیجے میں سیم بعض علاقوں میں بالکل ختم ہو گئی ہے اور وہی زمینیں جو کاشت نہیں ہو سکتی تھیں زیر کاشت آ گئی ہیں۔ لیکن یہ تبدیلی اپنے دامن میں بہت خطرات لئے ہوئے ہے۔ اگر پانی کی صورت حال یہی رہی تو قحط کا خطرہ بڑھ جائے گا۔ بلکہ پہلے ہی بہت سے علاقے اس کی زد میں آ گئے ہیں۔ اس خطرہ سے نپٹنے کے لئے حکومت کو بہت بڑے اقدامات کرنے پڑیں گے۔ نئے ڈیم بنانے پڑیں گے اور نہروں اور کھالوں کو پکا کرنا ہوگا۔

اس کے علاوہ اس عرصہ میں روپے کی قیمت میں متواتر کمی ہوتی رہی ہے اور آج ایک ڈالر کی قیمت 65 روپے تک پہنچ گئی ہے جو ہماری معیشت کے لئے زہر قاتل سے کم نہیں۔ اس کے نتیجے میں گندم کی قیمت 300 روپے فی من مقرر کی گئی ہے۔ لیکن آڑھتی 270 روپے من خرید رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی بیرونی گندم سے کم ہے۔ اس سال گندم برآمد کی جا

رہی ہے۔

چینی میں کمی واقع ہونے سے گنے کی قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اور بڑے زمیندار اور امیر کسان زیادہ سے زیادہ گنا بو کر بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ گنے کی کاشت بڑھنے سے گندم کی کاشت کم ہونی قدرتی ہے۔

جب سے شریعت بنچ نے زرعی اصلاحات کو اسلام اور شریعت کے خلاف قرار دیا ہے۔ نئے امیر، سمگلر، بدمعاش، چورباز بے تحاشہ زمینیں خرید رہے ہیں اور زمین کی ملکیت کے اعداد و شمار بالکل بدل گئے ہیں۔

دریاؤں میں پانی کی متواتر کمی سے سندھ اور جنوبی پنجاب میں بے شمار علاقے ریگستان میں تبدیل ہو رہے ہیں اور سندھ میں پنجاب کے خلاف بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ اس مسئلہ کو سیاسی سطح پر حل نہیں کیا جا رہا۔

کسانوں کے حقوق کے لئے پنجاب میں کسان بورڈ اور شاہ محمود قریشی آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ لیکن تاحال وہ کوئی تحریک نہیں بنا سکے۔

قوموں کے حق خود ارادیت کا مسئلہ

سائنٹیفک نظریہ کا اولین مطالبہ یہ ہے کہ ہر سماجی سوال کا مطالعہ معین تاریخی حدود کے اندر کیا جائے۔ اور اگر اس سوال کا تعلق کسی خاص ملک کا ہو تو اس ملک کی تمام خصوصیات کی طرف پورا پورا دھیان دیا جائے۔

اس سے پہلے کہ ہم قوموں کے حق خود ارادیت کے مسئلہ کا جائزہ لیں ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ قوم کیا ہے؟ اور قوم کب اور کیسے وجود میں آتی ہے اور اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟

تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ عہد غلامی یا اس سے پہلے جدید قومیں ظہور میں نہ آئی تھیں اور لوگ مختلف قبائل میں منقسم تھے اور ایک قبیلہ ہی ان کی قوم تھا۔ پاکستان میں آج تک خصوصاً بلوچستان اور صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں لوگ ابھی تک قبائلی زندگی میں بندھے ہوئے ہیں گو یہ قبائلی زندگی بھی جدید زمانے میں نئی قبائلی زندگی بن چکی ہے اور اس پر سے قبائلی چھاپ بڑی تیزی سے مٹتی جا رہی ہے۔ جاگیرداری دور میں جدید قوموں کے خدوخال ابھرنے شروع ہو گئے تھے اور وہ فیوڈل قوموں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔

جدید سائنٹیفک نظریات کے مطابق ایک قوم کی بنیادی خصوصیات ایک علاقہ' ایک زبان' ایک اقتصادی نظام اور ایک ثقافت اور مشترکہ روایات ہوتی ہیں۔ ان خصوصیات کی نشوونما مادی حالات سے ہوتی ہے۔ پیداواری قوتیں اور پیداواری رشتے خاص طور پر قوموں کی نشوونما میں ایک اہم اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ جدید قوموں کو وجود میں لانے اور ان کی نشوونما میں سرمایہ دارانہ نظام نے خاص طور پر اہم رول ادا کیا ہے۔ قوموں کی تشکیل میں علاقائی تقسیم بھی خاص اہمیت رکھتی ہے قبائلی زندگی کے خود کفیل نظام حیات کی شکست و ریخت کے بعد جاگیرداری عہد میں تجارتی ضروریات' علاقائی تقسیم اور زبانوں کی ترقی نے مخصوص علاقوں میں نئی قوموں کے خدوخال کو ابھارا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی آمد کے بعد نئی پیداواری قوتوں اور نئے پیداواری رشتوں نے جاگیرداری عہد میں نشوونما پانے والی فیوڈل

قوموں کو جن پر ابھی تک قبائلی زمانے کی زبردست چھاپ تھی۔ جدید قوموں میں تبدیل کر دیا۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام نے دور دراز علاقوں کو سرمایہ دارانہ منڈی کا ایک حصہ بنا دیا ہے اور دیہات کی خود کفیل زندگی کی دیواروں کو توڑ پھوڑ کر مختلف قبائل کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ نئی تجارتی اور صنعتی ضروریات' ذرائع نقل و حمل میں بے پناہ آسانیاں زبانوں کی ترقی کا باعث بنتی ہیں اسی طرح جدید قومیں ظہور میں آئی ہیں۔

سرمایہ داری نظام کی آمد سے پہلے جاگیرداری نظام کے اندر گو مختلف قبائل کو بزور شمشیر ایک مرکز کے تحت جمع کرنے کی بار بار کوششیں کی گئیں اور مختلف علاقوں میں ایک بادشاہ کا علم بلند کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ مرکز کبھی زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکا اور قبائل ہر دفعہ موقعہ ملتے ہی اپنی آزادی کا اعلان کر دیتے۔ پھر جنگ و جدال ہوتے۔ پھر ایک مرکز میں جمع کیا جاتا اور پھر یہ اتحاد ٹوٹ جاتا۔ برصغیر ہند و پاکستان میں جاگیرداری عہد کی تاریخ ایسی ہی داستانوں اور واقعات سے بھری پڑی ہے۔

جو اتحاد اور مرکز بزور شمشیر قائم کیا جاتا تھا وہ اتحاد اور مرکز بھی اس قدر مضبوط نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس عہد میں ذرائع آمدورفت مفقود تھے۔ پیداواری قوتیں ترقی یافتہ نہ تھیں۔ اور لوگوں کی اقتصادی زندگی چھوٹے چھوٹے خود کفیل دیہات سے عبارت تھی۔ ان حالات کی وجہ سے زبانوں کی شکل بھی نہایت غیر ترقی یافتہ تھی۔

انگریز کی آمد سے پہلے برصغیر ہند و پاکستان میں جاگیرداری نظام اپنے زوال کے دور میں داخل ہو چکا تھا اور اس نظام کی کھوکھ کے اندر نئے سرمایہ داری نظام کے لوازمات آہستہ آہستہ پیدا ہو رہے تھے۔ اس وقت گو جدید قومیں ابھی پوری طرح ظہور میں نہ آئی تھیں لیکن پاکستان کی پانچ بڑی قومیں جاگیرداری عہد میں نشوونما پا رہی تھیں۔ گو ان کی ہیت ڈھیلی ڈھالی تھی اور وہ پوری طرح مربوط نہ تھیں لیکن وہ پنجابی' سندھی' پختون' بلوچی اور بنگالی کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔ اور جغرافیائی لحاظ سے بھی ان کی حدود کم و بیش متعین ہو رہی تھی۔ انگریز کی آمد کے موقعہ پر اس برصغیر میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا دراصل یہ طوائف الملوکی برصغیر میں نئی قوموں کی اٹھان اور نشوونما کی ترقی کا سگنل تھا۔ اس زمانہ سے پہلے بھی یہ برصغیر کبھی ایک مرکز کے تحت متحد نہیں رہا۔ ہندوستان کو ایک مرکز کے تحت متحد کرنے کے لئے انگریز کو ایک سو سال سے بھی زائد عرصہ لگا۔ انگریز نے پہلے بنگال

میں قدم جمائے 1757ء میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریز بنگال کا حکمران بن گیا۔ اور اس کے سیاسی اور اقتصادی اقدامات نے سرمایہ داری نظام کے جنم لینے کے اس عمل کو وقتی طور پر روک دیا جو جاگیرداری نظام کی کھوکھ میں پرورش پا رہا تھا۔ برطانیہ کی صنعتی ترقی کے لئے بنگالی عوام کی بے پناہ کھلی لوٹ کی گئی اور پھر اس لوٹ کو جاری رکھنے اور قانونی شکل دینے کے لئے بندوبست دوامی کا نفاذ کر دیا گیا۔ بنگالی منڈی کا براہ راست برطانیہ کے ترقی یافتہ سرمایہ داری نظام کے ساتھ محکومی کا تعلق قائم کر دیا گیا۔ اس محکومی کی حالت میں سرمایہ داری نظام کی نشوونما کے عمل نے جدید بنگالی قوم کو جنم دیا۔

بنگال پر قبضہ کرنے کے تقریباً 90 سال بعد 45-1843ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر 1849ء میں پنجاب کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ان فتوحات کے بعد پنجاب اور سندھ کو بھی عالمی سرمایہ داری نظام کا حصہ بنا دیا گیا اور انیسویں صدی کے آخر میں ان علاقوں میں وہ زرعی اجناس کاشت کی جانے لگیں جن کی برطانوی کارخانوں کو ضرورت تھی۔ ریلوں اور نہروں کے جال بچھائے گئے تاکہ کپاس وغیرہ کی پیداوار بڑھائی جا سکے اور کراچی کی بندرگاہ کے ذریعے برطانوی صنعتوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے برآمد کی جا سکے۔ چنانچہ پرانا پیداواری نظام ختم ہونے لگا اور سرمایہ داری نظام نے آہستہ آہستہ ان علاقوں کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا اور اس عمل کے ساتھ ہی جدید سندھی اور پنجابی قومیں جن کے خدوخال جاگیرداری عہد کے اندر ہی بن چکے تھے نشوونما پانے لگیں۔

پختون اور بلوچی قوموں کی نشوونما اور ترقی کو نہایت ہی پیچیدہ حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اول تو 1893ء میں ڈیورینڈ لائن نے بہت سے قبائل کو افغانستان اور برطانوی ہندوستان میں تقسیم کر دیا اور دوسرے جب 1901ء میں شمال مغربی سرحدی صوبہ وجود میں آیا تو بہت سے پختونوں کو انتظامی امور کے لئے بلوچستان کے صوبہ کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اور پہاڑی علاقوں کے پختونوں کو میدانی علاقوں کے پختونوں سے علیحدہ کر دیا گیا ان انتظامیہ اقدامات اور پہاڑی علاقوں میں ذرائع رسل و رسائل نہ ہونے کی وجہ سے پختون قوم کی نشوونما کو مشکل بنا دیا۔ لیکن جیسے جیسے سرمایہ داری نظام نے ان علاقوں میں سرایت کرنا شروع کیا پختون قوم کی نشوونما تیز ہوتی چلی گئی۔ اور اب آہستہ آہستہ مختلف قبائلی ایک قوم کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔

بلوچ علاقوں پر انگریز نے 1879ء تک قبضہ کر قلات' خاران' میکران اور لاسِ بیلا کی بلوچی ریاستوں کو متحد کر کے خان آف قلات کے تحت کر دیا۔ گو ابھی تک بلوچستان میں مختلف قبائل ایک دوسرے میں پوری طرح مدغم نہیں ہوئے لیکن سرمایہ داری نظام کی یلغار پرانی دیواروں کو توڑ رہی ہے اور بلوچی قوم کی نشوونما تیزی سے پختگی کی طرف بڑھ رہی ہے۔

پاکستان میں قوموں کی نشوونما کے راستے میں ریاستی نظام بھی بری طرح حائل رہا ہے بہاول پور' خیرپور' امب' دھیر' سوات' چترال وغیرہ کی ریاستی حدود نے ان علاقوں کے لوگوں کو اپنی اپنی قوموں میں جذب اور مدغم ہونے کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں جو اب دور کی جا چکی ہیں۔

برصغیر ہند و پاکستان میں بے شمار قومیں بسی ہوئی ہیں۔ اگر انگریز جو ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ نظام کی جلو میں اس برصغیر میں آیا بزور شمشیر سارے ہندوستان پر قابض نہ ہو جاتا اور اس قبضہ کے بعد تقریباً سو دو سو سال تک اپنے استحصالی مفادات کے لئے قابض نہ رہتا اور ایک مرکز سے سرمایہ داری نظام کی نشوونما نہ کرتا تو آج اس برصغیر میں بھی یورپ کی طرح بے شمار چھوٹی چھوٹی آزاد سرمایہ دارانہ قومی ریاستیں وجود میں آ چکی ہوتیں۔ افریقہ میں جہاں مختلف سامراجی طاقتیں مختلف علاقوں میں قابض اور حکمران ہوئیں آج درجنوں قومی ریاستیں بن چکی ہیں۔ ان ریاستوں میں آپس میں متحد ہونے کے بھی قومی رجحانات موجود ہیں اور انہوں نے ایسی تنظیمیں بھی بنا رکھی ہیں جو اتحاد کو فروغ دینے کے لئے کام کر رہی ہیں لیکن یہ اتحاد ابھی کہیں نظر نہیں آتا اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کے قائم ہونے کے کوئی آثار نظر آتے ہیں۔

برصغیر ہند و پاکستان میں قوموں کے حق خود ارادیت کے مسئلہ کو دو تاریخی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور 1857ء سے شروع ہو کر 1947ء میں ختم ہوا اور دوسرا دور 1947ء سے شروع ہوا ہے اور ابھی تک جاری ہے۔

یوں تو 1857ء سے پہلے بھی انگریز کی بالادستی اور جارحیت کے خلاف برصغیر کے مختلف حصوں میں مسلح جدوجہد کی گئی تھی لیکن 1857ء میں پہلی بار برطانوی تسلط کے خلاف برصغیر کی مختلف قوموں نے متحد ہو کر برطانوی سامراج کے جوئے کو اتار پھینکنے کی کوشش کی تھی۔

گو اس کی رہنمائی جاگیردار طبقہ کے ہاتھ میں تھی اور عوام نے شہنشاہ بہادر شاہ کے جھنڈے تلے برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کی اس کے باوجود حق خود ارادیت اور آزادی کے لئے یہ پہلی قومی تحریک تھی۔ کیونکہ اس کی باگ ڈور جاگیردار طبقہ کے ہاتھوں میں تھی اس لئے یہ تحریک کمزور اور نحیف تھی۔ اس کے رہنماؤں کی نگاہیں مستقبل کی بجائے ماضی پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ ماضی جو کبھی واپس نہ آ سکتا تھا کیونکہ اس کے لئے پرانے مادی حالات نہ رہے تھے اور نئے ابھرتے ہوئے مادی حالات کو برطانوی سامراج کے ظلم و تشدد نے مسخ کر دیا تھا اور مقامی سرمایہ دارانہ نظام کی نشوونما کے تمام راستے وقتی طور پر مسدود کر دیئے تھے۔ دوسرے اس تحریک کا عوام پر گہرا اعتماد نہ تھا اور صرف فوجی دستوں پر ہی اعتماد کیا گیا تھا۔

اس کے بعد حق خود ارادیت کی یہ جدوجہد انڈین نیشنل کانگرس اور دوسری جماعتوں کی رہنمائی میں چلتی رہی لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اکتوبر 1917ء کے روسی انقلاب تک یہ تحریک سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب کا ایک حصہ تھی۔

لیکن اکتوبر انقلاب کے بعد خود ارادیت کی قومی تحریک سوشلسٹ انقلاب کا حصہ بن گئی۔ لیکن اس تحریک کی رہنمائی بورژوا اور نیم بورژوا تحریکیں کر رہی تھیں۔ اس لئے سوشلسٹ انقلاب کے اس دور میں یہ جماعتیں بورژوا جمہوری انقلاب کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکیں اور آخر برطانوی سامراج کے ساتھ 1947ء میں سمجھوتہ ہو گیا۔ اور اس سمجھوتہ کی بنیاد پر مختلف قوموں پر مشتمل دو ریاستیں۔ بھارت اور پاکستان۔ وجود میں آ گئیں۔

پاکستانی ریاست کی حسب ذیل خصوصیات تھیں۔

1- پاکستان میں جاگیردارنہ، نیم نوآبادیاتی نظام رائج تھا۔ جاگیردار طبقہ غالب تھا اور تجارتی سرمایہ دار طبقہ ابھی بہت کمزور تھا۔ اور صنعتی طبقہ ابھی جنم لے رہا تھا۔

2- پاکستان میں پانچ قومیں خاص جغرافیائی حدود میں آباد تھیں۔

پنجابی۔ سندھی۔ پختون۔ بلوچ اور بنگالی۔

ان کے علاوہ کئی چھوٹے گروہ اور بھی تھے جن میں ہندوستانی میواتی اور بہاری مہاجرین کی اکثریت تھی لیکن موخرالذکر گروہ کسی خاص خطہ میں آباد نہ تھے۔ مشرقی پاکستان میں چند قبائل ایسے بھی تھے جو بنگالی قوم کا ابھی تک حصہ نہ بن سکے تھے۔ مثلاً چکما قبیلہ۔ ان کے علاوہ وہ ہندوستانی جن کی مادری زبان اردو تھی اور وہ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کراچی،

حیدر آباد' لاہور میں آباد ہوئے تھے۔

3- پانچوں قومیں اپنی اپنی زبان رکھتی تھیں لیکن ان میں سے کوئی زبان بھی تمام پاکستان میں سمجھی اور بولی نہ جاتی تھی۔

اردو زبان جو دراصل ہندوستان کی ایک زبان تھی وہ ہندوستانی مہاجروں کے علاوہ بہاری مہاجرین اور پنجاب اور کراچی' پشاور اور دوسرے بڑے بڑے تجارتی مراکز میں تجارتی زبان کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور خصوصاً پنجاب کے شہری درمیانہ طبقہ اور حکمران طبقہ نے اس کو اپنایا ہوا تھا اور پنجاب اور کراچی میں اس کی اشاعت اور ترقی کے لئے حکومت کی سرپرستی اسے حاصل تھی۔

4- پاکستانی ریاست دو حصوں میں تقسیم تھی جن کے درمیان نہ صرف 1200 میل کا فاصلہ تھا بلکہ درمیان میں بھارت کا علاقہ تھا جس کے ساتھ تقسیم ہند کے وقت سے قتل و غارت کشمیر اور کئی دوسرے مسائل کی وجہ سے سخت مخالفت تھی۔

5- پاکستان کی دو بڑی ریاستیں۔ پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اور ڈیڑھ کروڑ کے قریب پنجابی اور تین چار کروڑ کے قریب بنگالی بھارتی ریاست میں چلے گئے تھے۔

6- پاکستان کی ریاست میں چونکہ ابھی تک جاگیردار اور نیم نوآبادیاتی سماج تھا اس لئے اس کی ثقافت پر جاگیردارانہ' نیم نوآبادیاتی اور کمزور تجارتی سرمایہ داری کی چھاپ تھی۔

7- بنگال اور صوبہ سرحد میں قومی آزادی کی تحریک میں برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کی روایات دوسرے صوبوں کی نسبت زیادہ مضبوط اور گہری تھیں۔

پاکستان ان علاقوں پر مشتمل تھا جن میں بسنے والی قوموں کی بہت بڑی اکثریت اسلام سے تعلق رکھتی تھی۔ ان علاقوں کی ان قوموں نے ایک طرف تو برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا اور دوسری طرف غیر مسلم سرمایہ داروں کی لوٹ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ کیا۔

ان قوموں کی علیحدہ ریاست قائم کرنے کے محرکات اقتصادی سیاسی اور سماجی تھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تاریخی وجوہات کی بنا پر مسلمان ہندوؤں سے زیادہ پس ماندہ تھے اور ان کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتے تھے۔ "1946-47ء میں بنگال میں باوجود آبادی کے لحاظ سے اکثریت رکھنے کے بنگالی حکومت کی انتظامیہ ملازمتوں میں مسلمان صرف 30 فیصد تھے۔ اور بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں میڈیکل' تجارتی' زراعتی اور انجینئرنگ کالجوں میں

مسلمان طباء کی تعداد کل طلباء کا 17ء9 فیصدی تھی۔"

"بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں ہی مشرقی بنگال جہاں کہ مسلمانوں کی بہت زیادہ اکثریت تھی شہری اور زرعی جائداد کے 80 فیصدی حصہ پر ہندو قابض تھے۔" (پاکستان کی اقوام صفحہ 173 یو۔ وی گانگو۔ سکی)

اسی طرح "پنجاب میں سودی روپیہ دینے والے مہاجن زیادہ تر ہندوؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ پنجاب کی اندرونی تجارت پر قابض تھے اور افغانستان وغیرہ کے ساتھ تجارت بھی انہیں کے قبضہ میں تھی اور اکثر سرکاری ملازم بھی انہیں میں سے بھرتی ہوئے تھے۔" (پاکستان کی اقوام صفحہ 184۔ یو۔ وی گانگو۔ سکی)

پنجاب کی زیادہ تر زمینیں بھی سکھوں کے پاس تھیں جو انگریز کی آمد سے پہلے اس صوبہ کے حکمران تھے۔ ان مادی حالات نے مسلمانوں کے تمام طبقوں میں ہندوؤں کے خلاف جذبات کو جنم دیا اور ملازمتوں' تجارت اور دوسری اقتصادی سرگرمیوں میں مقابلہ نے ان جذبات کی نشوونما کی۔

یہ تحریک پہلے ملازمتوں کے تحفظ' علیحدہ نیابت رائے کے مطالبات تک محدود رہی لیکن جوں جوں "پاکستان میں بسنے والی قوموں میں تجارتی سرمایہ داری نشوونما پاتی گئی اور برصغیر ہند و پاکستان کی آزادی کی منزل قریب آتی چلی گئی۔ اس نے علیحدہ ریاست کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔ 1940ء میں لاہور میں جو قرارداد پاس کی گئی اور جو قرارداد لاہور کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں خود مختار اور آزاد ریاستوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے تحریک بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ مختلف قوموں کے مسلمان عوام اس قدر اکٹھے ہو گئے کہ وہ ایک ریاست بنانے پر نہ صرف متحد ہو گئے بلکہ تل گئے تھے۔ حتیٰ کہ جب سرحد میں رائے شماری ہوئی تو بہت بڑی اکثریت نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے۔ حالانکہ وہاں خدائی خدمتگار تحریک (جو کانگرس سے منسلک تھی) کا بہت زور تھا۔ حصول پاکستان کی یہ تحریک اس قدر ہمہ گیر اور عوامی تھی کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے مسلمان اکثریت کی قوموں کے علیحدہ ریاست بنانے کے حق کو تسلیم کر لیا اور کیونکہ یہ تحریک بھی برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد سے ہی کامیاب ہو سکتی تھی اس لئے اس تحریک کو مضبوط اور منظم کرنے اور اس کے مادی محرکات کو اقتصادی مطالبات کی شکل میں عوام میں ہردلعزیز بنانے کے لئے کمیونسٹ پارٹی نے اپنے مسلمان ممبروں کو مسلم لیگ میں شامل کر دیا۔

اس حقیقت کو دہرانا بھی شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ آزاد مسلمان ریاستوں کے قیام کے مطالبہ کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ نے برطانوی حکومت کی اس سکیم کو مان لیا تھا جس کے تحت تجویز کیا گیا تھا کہ ہندوستانی ریاست کا ایک مرکز ہو گا اور اس کے تحت تین خود مختار علاقوں پر مشتمل علاقائی حکومتیں ہوں گی جو اپنے اندرونی معاملات میں بالکل آزاد ہوں گی۔ لیکن اس تجویز کو کانگرس کے مرد آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ٹھکرا دیا۔

اس طرح پاکستانی ریاست ان قوموں کے عوام کی بہت بڑی اکثریت کی متفقہ رائے سے وجود میں آئی جن کی اکثریت مذہب اسلام سے تعلق رکھتی تھی۔ 1947ء میں بھارت اور پاکستان کی دو ریاستوں کے وجود میں آنے سے قومی حق خود ارادیت اور علیحدگی یا آزادی کی جدوجہد کا ایک دور ختم ہو گیا۔ اور برطانیہ کی براہ راست غلامی کے جوئے کو اتار کر پھینک دیا گیا۔ لیکن جاگیرداری اور نیم نو آبادیاتی نظام جوں کا توں قائم رہا سرمایہ داری کی ترقی کے لئے ضروری تھا کہ اس فرسودہ نظام کو ختم کر دیا جائے لیکن ابھرتا ہوا تجارتی سرمایہ دار طبقہ اپنی کمزوری کی وجہ سے ایسا نہ کر پایا اور اس نے اپنی ترقی اور اس نظام کی حفاظت کے لئے سامراجی طاقتوں، خصوصاً امریکی سامراج کی ہر قسم کی امداد حاصل کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ اس راستے نے پاکستان کی اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی زندگی پر امریکی سامراج کی گرفت کو مضبوط کر دیا۔ اور آخر ایوب خان کے مارشل لاء تک پہنچا دیا۔

اس زمانے میں جو سرمایہ دارانہ ترقی ہوئی اس نے پاکستان کی مختلف قوموں کے اندر شعور اور قومی تحریکوں کو جنم دیا۔ سب سے پہلے مشرقی بنگال میں قومی زبان کے نام پر تحریک چلی اور اپنے مطالبہ کے حصول میں کامیاب ہوئی 56-1955ء میں مغربی پاکستان میں ایک یونٹ کے قیام کے خلاف سرحد، سندھ اور بلوچستان میں تحریک نے جنم لیا جو بالآخر 1970ء میں کچھ حد تک کامیاب ہو گئی۔

مشرقی بنگال کی علاقائی خود مختاری کی تحریک آزاد بنگلہ دیش کی شکل میں کامیاب ہو چکی ہے اور اب پاکستان کے باقی صوبوں۔ سرحد، بلوچستان اور سندھ میں قومی تحریکیں کروٹ لے رہی ہیں۔ اور ان تحریکوں کے زیادہ سرگرم اور جوشیلے کارکن بھی مکمل علیحدگی کے نعرے اپنا رہے ہیں۔

مارکسی نظریات کی روشنی میں حق خود ارادیت

ان حالات میں "قوموں کے حق خود ارادیت اور علیحدگی کے حق" کے متعلق بائیں بازو

کے کارکنوں میں زبردست بحث چل رہی ہے۔ کیونکہ انہیں صوبائی اور علاقائی خود مختاری کے نام پر نشوونما پانے والی تحریکوں کے عملی مسائل درپیش ہیں اور وہ قدرتی طور پر ان مسائل کو مارکسزم لینن ازم کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں اور انقلابی نظریات کے مطابق حل کرنا چاہتے ہیں۔

"حق خود ارادیت اور علیحدگی کے حق" کا مسئلہ سب سے پہلے انیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں آئر لینڈ کی آزادی کے سلسلہ میں یورپی انقلابیوں کے زیر بحث رہا۔ کیونکہ آئر لینڈ کے کچھ علاقے پر برطانیہ نے زبردستی قبضہ کر رکھا تھا۔ کارل مارکس پہلے یہ سمجھتا تھا کہ برطانیہ میں سوشلسٹ انقلاب ہی اس مسئلہ کا واحد ہے لیکن 1869ء میں کارل مارکس نے آئر لینڈ کی آزادی کی تحریک کی حمایت کی اور یہ لکھا کہ آئر لینڈ کو برطانوی محکومیت سے آزاد ہونا چاہئے۔ آزادی کے بعد اگر آئر لینڈ چاہے تو برطانیہ کے ساتھ فیڈریشن بنا سکتا ہے لیکن ایک بار آئر لینڈ کو مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے۔" آئرلینڈ کا محکوم حصہ آج تک اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

انیسویں صدی کے آخری عشرے اور بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں قوموں کے حق خود ارادیت اور علیحدگی کے حق اور آزادی کے متعلق بائیں بازو کی یورپی پارٹیوں میں زبردست بحث چلتی رہی۔

اس وقت حق خود ارادیت اور علیحدگی کے حق کا مسئلہ دو صورتوں میں زیر بحث تھا اور چونکہ یہ سوال مغربی یورپ میں قومی ریاستوں کے وجود میں آ جانے کی وجہ سے بہت پہلے حل ہو چکا تھا اور وہاں سوائے آئرلینڈ کے اور کوئی مسئلہ نہ تھا اس لئے یہ بحث زیادہ تر ان مسائل پر مرکوز رہی جو اس وقت درپیش تھے۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ ان محکوم ملکوں کا مسئلہ تھا جنہیں برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، پرتگال اور روس وغیرہ نے توپ و تفنگ اور شمشیر کی نوک پر غلام بنا رکھا تھا۔ ایسے ممالک ایشیا اور افریقہ کے پس ماندہ براعظموں میں پھیلے ہوئے تھے اور سامراجی ملکوں کی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ بائیں بازو کے یورپی رہنما اور پارٹیاں اس مسئلہ کے متعلق دو مختلف نظریات رکھتے تھے۔ ایک طرف وہ رہنما اور پارٹیاں تھیں جو ترقی پسندی اور سوشلزم کا دم تو بھرتی تھیں لیکن وہ محکوم ملکوں کی سامراج سے مکمل آزادی کی حمایت نہ کرتی تھیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ مغربی یورپ کے سامراجی ممالک صنعتی میدان میں بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب ہیں

اس لئے غیر ترقی یافتہ، پس ماندہ اور غریب محکوم ملکوں کے عوام کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں حاکم ملکوں کے ساتھ وابستہ رہیں۔ اور ان کی وابستگی کو قائم رکھنے کے لئے وہ ثقافتی خود مختاری اور حاکم ریاست کے اندر "قومی خود مختاری" کی اصطلاحوں کو پیش کر رہے تھے۔ فرانس اور برطانیہ نے بعد میں اپنے مقبوضات کو اس قسم کی محدود خود مختاری دے کر، جو دراصل نئے حالات میں غلامی اور استحصال کی نئی شکل تھی۔ ان نظریات کو انقلابی تحریک پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔ الجزائر کو فرانس نے اپنا ایک صوبہ بنا لیا اور الجزائر کے منتخب نمائندے فرانس کی پارلیمنٹ کے ممبر بننے لگے۔ برطانیہ نے ہندوستان میں لوکل سیلف گورنمنٹ قائم کی اور محدود رائے دہندگی کے ذریعے مرکزی اور صوبائی اسمبلیاں قائم کیں۔ حاکم ملکوں نے نئے حالات میں یہ طریقے نوآبادیات کو مہذب بنانے کے نام پر مزید مدت کے لئے انہیں غلام رکھنے کے لئے رائج کئے اور اصلاح پسند بائیں بازو کی پارٹیوں اور رہنماؤں نے اس پالیسی کو ثقافتی اور "قومی خود مختاری" کے نام سے نوازا۔

لیکن لینن اور اس کی پارٹی اور دوسرے انقلابی رہنما حاکم ریاست کے اندر اس "ثقافتی خود مختاری اور قومی خود مختاری" کے سراسر خلاف تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ جن ملکوں کو بزور شمشیر غلام بنایا گیا ہے انہیں علیحدگی کا حق اور مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے۔ مکمل آزادی کے بعد وہ جو چاہیں راستہ اختیار کریں۔ ان ملکوں کے لئے مکمل آزادی کے بغیر حق خود ارادیت بے معنی اور لغو ہے اور عوام اور مزدور طبقے کے ساتھ غداری ہے۔

زار روس کے ماتحت مسلمان اور دوسری محکوم قوموں کے لئے بھی حق خود ارادیت کی تعبیر انہوں نے یہی کی کہ انہیں مکمل آزادی اور علیحدگی کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ انہیں زبردستی، جنگ و جدل کے ذریعے محکوم بنایا گیا ہے۔

چنانچہ سوشلسٹ انقلابی تحریک نے حق خود ارادیت اور علیحدگی کے حق کے متعلق یہ اصول وضع کیا کہ "جن قوموں کو بزور شمشیر محکوم بنایا گیا ہے انہیں حق خود ارادیت کے ساتھ مکمل علیحدگی کا حق بھی حاصل ہے اور وہ مکمل طور پر آزاد ہو کر اپنی قومی ریاست کی تشکیل کر سکتی ہیں۔"

لیکن لینن کے قول کے مطابق مزدور طبقے کے لئے لازمی نہیں ہے کہ وہ ہر قومی تحریک کی ہر جگہ اور ہمیشہ حمایت کرے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی قومی تحریکوں کی مدد کی جائے جو سامراج کو کمزور کرتی ہیں اور اس کی شکست کا باعث بنتی ہیں اور ایسی تحریکوں کی مدد

نہ کی جائے جو اسے قائم رکھتی اور مضبوط کرتی ہیں۔ ایسی مثالیں موجود ہیں جبکہ خاص مظلوم قوموں کی قومی تحریکیں پرولتاری تحریک کے مفادات کے ساتھ ٹکراتی ہیں۔ ایسے حالات میں ایسی تحریکوں کی امداد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قوموں کے حق خود ارادیت کا سوال علیحدہ کر کے نہیں دیکھنا چاہئے۔ بلکہ پرولتاری انقلاب کے مسائل کا ایک حصہ ہے جو کل کے ماتحت ہے اور اسے کل کے نظریے سے ہی دیکھنا چاہئے۔ پچھلی صدی کے چوتھے عشرے میں کارل مارکس نے پولوں اور ہنگریوں کی قومی تحریکوں کی حمایت کی لیکن چیک اور جنوبی سلاؤ کی قومی تحریک کی مخالفت کی....." (لینن ازم کی اساس صفحہ 62)

لینن مزید لکھتا ہے کہ "جمہوریت کے مختلف مطالبات منجملہ حق خود ارادیت کے مطالبہ کے حتمی نہیں ہیں بلکہ عام جمہوری (اور اب عام سوشلسٹ) بین الاقوامی تحریک کا حصہ ہیں خاص حالات میں اگر جزو کل سے متصادم ہو تو اسے رد کر دینا چاہئے۔" (لینن ازم کی اساس صفحہ 62)

مارکسزم اور نیشنلزم کے باہمی تعلق کے متعلق لینن نے لکھا۔ "مارکسزم کا نیشنلزم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے خواہ وہ "خوبصورت ترین" اور "پاکیزہ ترین" اور بہت سلجھی ہوئی اور مہذب کیوں نہ ہو۔ ہر قسم کے نیشنلزم کے بجائے مارکسزم بین الاقوامیت کا نظریہ اور تمام قوموں کے ارفع اتحاد کا نظریہ پیش کرتی ہے جو ریل کے ہر میل' ہر بین الاقوامی ٹرسٹ اور مزدوروں کی ہر تنظیم جو اپنی اقتصادی سرگرمیوں اور اپنے نظریات اور کوششوں میں بین الاقوامی ہے' بڑھ رہا ہے۔"

سرمایہ دارانہ سماج میں قومیت کا اصول تاریخی اعتبار سے لازمی ہے اور اس سماج کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر مارکسٹ قومی تحریک کی تاریخی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس بات کو روکنے کے لئے کہ نیشنلزم کی حمایت کہیں ایک بہانہ نہ بن جائے۔ قومی تحریکوں کے صرف ترقی پسند پہلو کی ہی حمایت کی جا سکتی ہے تاکہ یہ حمایت پرولتاری شعور کو بورژوا نظریات سے کند نہ کر دے۔" (قوموں کا حق خود ارادیت صفحہ 26)

ایسی قومیں جنہیں بزور شمشیر ایک ریاست میں شامل نہ کیا گیا ہو بلکہ وہ اپنی آزادانہ مرضی سے ایک ریاست میں متحد ہو گئی ہوں کے متعلق کامریڈ لینن نے قوموں کے حق خود ارادیت کے متعلق ایک دوسرا مارکسی اصول وضع کیا۔

1913ء میں لینن نے ایسے ہی قومی مسائل کے متعلق لکھتے ہوئے کہا کہ "روس میں

یوکرینیوں کے متعلق مہا روسیوں کے رویے کی مثال لیجئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکسٹ کیا ہر جمہوریت پسند یوکیرنیوں کی بے کراں تذلیل کے خلاف زبردست جدوجہد کرے گا اور ان کے لئے مکمل مساوات کا مطالبہ کرے گا۔ لیکن یوکیرنیوں اور مہاروسیوں کے درمیان ایک ریاست کی حدود میں جو تعلقات اور اتحاد موجود ہے اسے کمزور کرنا' نہ صرف سوشلزم کے ساتھ غداری ہے بلکہ یوکیرنیوں کے بورژوا "قومی کاموں کے نقطہ نظر سے بھی غلط پالیسی ہے" (قوموں کا حق خود ارادیت صفحہ 26' لینن)

آگے چل کر لینن لکھتا ہے "تمام جاگیردارانہ ظلم" تمام قومی ظلم' تمام وہ مراعات جو ایک قوم یا ایک زبان کو حاصل ہوں کو ختم کرنا مزدور طبقے کا بطور جمہوری طاقت کے اولین فریضہ ہے اور یقیناً مزدور طبقے کی طبقاتی جدوجہد کے لئے فائدے مند ہے جسے قومی آویزیش دھندلا اور کمزور کرتی ہے۔ لیکن بورژوا نیشنلزم کی ان تاریخی جچی تلی حدود سے آگے رد کرنا مزدور طبقے سے غداری کے مترادف ہے اور سرمایہ دار طبقے کی حمایت ہے۔" (قوموں کا حق خود ارادیت صفحہ 35' لینن)

لینن نے ایسی ریاست جس میں مختلف قومیں آباد ہوں' کے ریاستی ڈھانچے' مرکز اور ذیلی یونٹوں یا صوبوں کے باہمی تعلقات اور اختیارات اور ایسے تعلقات اور اختیارات کیوں ہونے چاہیں کے متعلق نہایت وضاحت سے لکھا ہے کہ "مارکسٹ محض اس لئے فیڈریشن اور کمزور مرکزیت کے مخالف ہیں کہ سرمایہ داری کو اپنی نشوونما اور ترقی کے لئے بڑی اور مضبوط مرکزیت کی ریاستیں درکار ہیں۔ باقی تمام شرائط کے قطع نظر باشعور مزدور طبقہ ہمیشہ بڑی ریاست کی حمایت کرے گا۔ وہ ہمیشہ قرون وسطیٰ کی خواصیت (Pauticalaresim) کے خلاف جدوجہد کرے گا اور ہمیشہ بڑے بڑے علاقوں کے معاشی ادغام کو لبیک کہے گا جس میں مزدور طبقہ کی سرمایہ دار طبقہ کے خلاف جدوجہد وسیع پیمانے پر پنپ سکے۔

سرمایہ داری نظام میں پیداواری طاقتوں کی وسیع پیمانے پر تیز رفتار ترقی کے لئے سیاسی اعتبار سے متحد اور اکٹھے علاقوں کی ضرورت ہے۔ جو تمام پرانے اور قرون وسطیٰ اور ذات پات چھوٹی قوتوں' مذہبی اور دوسری رکاوٹوں کو توڑ سکے۔ سرمایہ دار طبقہ اور اس کا مد مقابل مزدور اس کام کے لئے متحد ہو سکتا ہے۔"

"..... لیکن جہاں مختلف قوموں پر مشتمل ایک ریاست ہو مارکسٹ کسی بھی صورت میں وفاقی اصول یا کمزور مرکزیت کے داعی نہیں ہوں گے۔ مضبوط مرکز کی بڑی ریاست قرون

وسطی کے انتشار سے مستقبل کے عالمی سوشلسٹ اتحاد کی طرف ایک بہت بڑا تاریخی اقدام ہے اور ایسی ریاست کے ذریعے کے بغیر (جس کا سرمایہ داری کے ساتھ گہرا تعلق ہے) سوشلزم کا کوئی اور راستہ نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ کہ جب ہم مضبوط مرکز کی حمایت کرتے ہیں اس سے ہماری مراد صرف جمہوری مرکزیت ہوتی ہے.....(قومی سوال پر تنقیدی جائزہ صفحہ 54 لینن)

فیڈریشن کے متعلق یہ اصول کوئی حتمی اور حرف آخر نہیں ہے۔ لیکن ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن میں ہم فیڈریشن کے اصول کے سخت مخالف ہوتے ہوئے اور مرکزی جمہوریت کے حمایتی ہوتے ہوئے بھی فیڈریشن کو قومی عدم مساوات پر مکمل جمہوری مرکزیت قائم کرنے کے لئے ترجیح دیں۔ اس نقطہ نظر سے کارل مارکس نے آئرلینڈ اور انگلینڈ کی فیڈریشن کو انگلینڈ کے آئرلینڈ پر زبردستی قبضہ سے ترجیح دی۔ (قوموں کا حق خود ارادیت 176 صفحہ لینن)

لینن نے قومی سوال پر بحث کرتے ہوئے روسالکسمبرگ کے حوالہ سے یہ لکھا " روسالکسمبرگ یہ جانتی ہے اور ایک مارکسٹ کے طور پر اسے ماننا چاہئے کہ سرمایہ دارانہ سماج کے تمام بڑے اور اہم اقتصادی اور سیاسی معاملات خود مختار علاقائی اسمبلیوں کی بجائے تمام ملک کی مرکزی پارلیمنٹ کے اختیار میں ہونے چاہیں۔ ان معاملات میں محصول کی پالیسی' تجارتی اور صنعتی قوانین' ذرائع نقل و حمل و ریل۔ ڈاک تار۔ ٹیلی فون وغیرہ) فوج ٹیکس کا نظام' دیوانی اور فوجداری قوانین' سکولوں کے مسائل کا عام اصول و مثال کے طور پر سکولوں کو مکمل طور پر سیکولر بنانے کے قوانین' عام تعلیم' سکولوں کی جمہوری انتظامیہ) مزدوروں کے تحفظ کے قوانین شہری آزادیاں (تنظیم کا حق وغیرہ) (قومی سوال پر تنقید صفحہ 55 لینن)

مضبوط مرکزیت کے لئے لینن نے ڈنڈے اور حاکمانہ طریقوں کے استعمال کی نفی کی اور مکمل طور پر جمہوری طریقے اپنانے کے لئے تلقین کی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر مختلف قوموں کے حقوق کے متعلق انہوں نے لکھا "لیکن جمہوری مرکزیت کے ساتھ ہی مختلف قومیتوں کو علاقائی خود مختاری دینا ضروری ہے تاکہ وہ مخصوص معاملات کو آزادانہ طریقہ سے طے کر سکیں۔ علاقائی خود مختاری' جمہوری مرکزیت کو کمزور نہیں بلکہ جمہوری مرکزیت کو جمہوری طریقوں سے عمل میں لاتی ہے۔"

"علاقائی خود مختاری کی عدم موجودگی سرمایہ داری کی وسیع پیمانے پر آزادانہ طریقے سے

سرعت کے ساتھ ترقی کو ناممکن نہیں تو کم از کم سست رفتاری کا موجب ضرور بن جاتی ہے علاقائی خود مختاری سرمائے کے ارتکاز' پیداواری قوتوں کی نشوونما' سرمایہ دار طبقے کے اتحاد اور ملکی سطح پر مزدور طبقے کے اتحاد کے لئے آسانیاں پیدا کر دیتی ہے۔ مقامی معاملات (علاقائی اور قومی وغیرہ) میں نوکر شاہی کی مداخلت' سیاسی اور اقتصادی ترقی کے راستے میں عام طور پر بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ اور مرکزیت کے لئے خاص طور پر اہم اور بڑے اور بنیادی مسائل ہیں رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ (قومی سوال کا تنقیدی جائزہ صفحہ 57 لینن)

"مزدوروں کے لئے اہم بات یہ ہے کہ وہ دونوں رجحانات کے اصولوں کو علیحدہ کر کے دیکھیں..... جہاں تک مظلوم قوم کا سرمایہ دار طبقہ ظالم قوم کے خلاف جدوجہد کرتا ہے ہم ہمیشہ سب سے بڑھ کر اس کے مددگار ہوتے ہیں کیونکہ ہم ظلم کے خلاف سب سے زیادہ لڑنے والے ہیں۔ لیکن جہاں تک مظلوم قوم کا سرمایہ دار طبقہ اپنی بورژوا نیشنلزم کا علمبردار ہوتا ہے ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں ہم ظالم کے تشدد اور مراعات کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں اور مطلوم قوم کی خاص مراعات کے لئے کوشش کو کسی صورت بھی نہیں بخشتے۔" (قوموں کا حق خود ارادیت صفحہ 93 لینن)

ایک ریاست میں مختلف بسنے والی قومیتوں کے حق خود ارادیت کے متعلق لینن کے ارشادات کا لب لباب یہ ہے کہ:

جمہوریت کی کوئی تحریک جو سامراج کی مضبوطی کا باعث ہو اور جو ایک ریاست میں بسنے والی مختلف قوموں کو جمہوری مرکزیت کے اصول سے دور لے جائے اور مختلف قوموں کے مزدوروں اور دوسرے محنت کشوں کے اتحاد کو کمزور کرے۔ رجعتی تحریک ہے اور مزدور طبقہ اور اس کی سیاسی پارٹی اس کی حمایت نہیں کر سکتی لیکن اس کے برعکس جو تحریک مضبوط مرکز کے نام پر ایک ریاست میں بسنے والی مختلف قوموں کو انہیں تمام علاقائی اور صوبائی مسائل کے سلسلہ میں خود مختاری اور جمہوریت دینے سے انکار کرتی ہے وہ دراصل اتحاد کے نام پر انتشار کی قوتوں کو ہوا دیتی ہے اور اقتصادی ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور سرمایہ دار طبقہ کے رجعتی عناصر کا آلہ کار بنتی ہے اور اس طرح سامراج کی حمایت کرتی ہے۔

مارکسی نظریات کی روشنی میں برصغیر ہند و پاکستان کے مخصوص قومی مسائل

قوموں کے حق خود ارادیت اور علیحدگی کے حق کے متعلق ان مارکسی نظریات کے مطابق جو اوپر طویل اقتباسات کی شکل میں دیئے گئے ہیں ان سوالوں کو جانچنا چاہئے جو پاکستان

کے اندر اس وقت حق خود ارادیت اور علیحدگی کے سلسلہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

بائیں بازو کے ایک مخصوص گروہ نے سقوط مشرقی پاکستان پر جشن منائے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ پاکستان کا وجود ہی غلط ہے اس لئے جس قدر جلد یہ ختم ہو جائے بہتر ہے۔ پاکستان کا ختم ہونا ہی پاکستانی عوام کے مسائل کا بہترین حل ہے۔ اور چونکہ پاکستان مذہب کے نام پر وجود میں آیا ہے اس لئے اس کا ختم ہونا ضروری بھی ہے اور تاریخی عمل کا لازمی نتیجہ بھی۔

اس استدلال سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ لوگ پاکستان کی تحریک کے مادی وجود کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اور رجعت پسند عناصر کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان صرف اور صرف مذہبی نظریات کی پیداوار ہے۔ اس طرح وہ تاریخی مادیت کو رد کرتے ہوئے۔ آئیڈلزم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی بنیادی مخصوص علاقوں میں ٹھوس مادی حقائق پر استوار ہوئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئی مادی بنیادوں پر ابھرتی ہوئی پاکستان کی تحریک کی آبیاری پرانے خیالات نے بھی کی لیکن یہ مذہبی نعرے ایک طرف تو پاکستان کی تحریک کو تقویت پہنچا رہے تھے اور دوسری طرف نئے استحصالی طبقوں کی لوٹ کھسوٹ کو قائم رکھنے اور انہیں پھیلانے اور بڑھانے میں مدد دے رہے تھے۔ اب بھی ان نعروں کو انہیں طبقوں کی لوٹ کھسوٹ کے لئے زور دار طریقے سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان کا مطالبہ اس صدی کے چوتھے عشرے میں ہی کیا گیا جبکہ تجارتی سرمایہ داری ان علاقوں کے مسلمانوں میں پرورش پانے لگی تھی اور بین الاقوامی انقلابی نظریے تمام دنیا میں آزادی کی بشارت دے رہے تھے۔ کیا اس سے پہلے پاکستان کے علاقوں میں مذہب نہیں تھا اور عوام مذہب سے بے بہرہ تھے۔ یقیناً حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس سے پہلے مذہبی خیالات اور نظریات کا عوام پر زیادہ اثر تھا اور ان کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ لیکن اس سے پہلے ان علاقوں کے مسلمانوں نے علیحدہ رائے دہندگی اور ملازمتوں کے تحفظ کے علاوہ کچھ نہ مانگا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کا مطالبہ اس وقت کیا گیا جب اس کے لئے مادی حالات تیار ہو چکے تھے اور انہی مادی حالات نے ہی اس مطالبہ کو اتنی جلدی کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔

پاکستان کی تحریک سے یہ بھی عیاں ہے کہ پاکستان میں شامل علاقے اور قومیں فتوحات اور جبر و تشدد کے ذریعے ایک ریاست میں شامل نہ ہوئے تھے۔ بلکہ عوام کی بہت بڑی

اکثریت کے متفقہ فیصلہ سے ایک ریاست میں متحد ہوئے۔ صوبہ سرحد میں اس مسئلہ پر باقاعدہ رائے شماری ہوئی اور عوام نے پاکستان میں شمولیت کے لئے رائے دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے اجارہ دار سرمایہ داروں' نوکر شاہی' اور فوجی آمریت نے پاکستانی عوام کے حقوق ضبط کئے اور پاکستان کی تمام قوموں کے جمہوری حقوق کو پامال کیا اور ان کی بے پناہ لوٹ کی اور ملک پر مسلسل فوجی آمریت قائم رکھی اور قوموں کے حق خود ارادیت کے مسئلہ کو جمہوری اصولوں کے مطابق حل کرنے کی بجائے ڈنڈے اور تشدد سے حل کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں بنگلہ دیش نے جنم دیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا موجودہ حالات میں برصغیر ہند و پاکستان میں بسنے والی مختلف قوموں کو آزاد قومی سرمایہ دارانہ ریاستیں بنانے کی تحریک' اور اس تحریک کو کامیاب کرنے کے لئے سرمایہ دار ملکوں کی بیرونی فوجی امداد ترقی پسند سیاست کی بنیاد ہے اور یہی راستہ سوشلزم کا راستہ ہے؟

ہمارے خیال میں یہ راستہ برصغیر کی دونوں ریاستوں کی مختلف قوموں کے محنت کش عوام اور مزدور طبقے میں منافرت اور انتشار پھیلانے کا راستہ ہے۔ اور بین الاقوامی امن کو خطرے میں ڈالنے کا راستہ ہے یہ راستہ سوشلزم کی تحریک کو کمزور کرتا ہے اور بورژوا قومی تحریک کو مضبوط کرتا ہے اور سامراج کی مداخلت کے لئے میدان ہموار کرتا ہے اور وسیع مواقع مہیا کرتا ہے۔ اس راستے پر چلنے سے دونوں ریاستوں میں بستی ہوئی مختلف قوموں کے محنت کش عوام اپنے اپنے سرمایہ دار طبقوں کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے دست و گریبان نظر آئیں گے۔ مزدور طبقے میں پھوٹ اور انتشار سرمایہ دار طبقے کی گرفت کو مضبوط کرے گا بنگلہ دیش میں جنگ ختم ہونے کے دو ماہ بعد بھی بہاری آبادی کے خلاف سخت نفرت اور غصہ کا اظہار بین الاقوامی سوشلسٹ نظریات کی ترویج کی بجائے بہیمانہ قسم کے گھٹے ہوئے نظریات پھیلانے کا موجب ہو گا بنگلہ دیش میں یہ جذبہ اس قدر رجعتی شکل اختیار کر گیا تھا کہ مزدور طبقے کے کئی غیر بنگالی انقلابی سیاسی کارکن اس کا شکار ہو گئے۔ اور یہ سب کچھ ایک قومی ریاست کی تشکیل کے لئے کیا گیا ہے جس میں بنگالی قوم کے نئے اور پرانے سرمایہ داروں کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور جو بھارت کے مارواڑی اور گجراتی مضبوط سرمایہ داروں کی دست نگر ہے اور سامراجی طاقتوں کے سہارے کے بغیر جس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ اب بنگلہ دیش کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن بہاریوں کو تلقین کر رہے ہیں کہ وہ بنگالی بن کر رہیں

اور یہ بھی تجویز کیا جا رہا ہے کہ انہیں مغربی پاکستان میں منتقل کر دیا جائے۔

کیا حق خود ارادیت اور علیحدگی کا یہ مطلب ہے کہ اقلیتی قوموں کے گروہوں کی تہذیب اور زبان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ ہرگز نہیں۔ حق خود اختیاری کے علمبردار جو دوسری قوموں کے اقلیتی گروہوں کو یہی حق دینے سے انکاری ہیں اور ان کی تہذیب اور زبان کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں دراصل بنگالی فرقہ پرستی کے علمبردار ہیں اور بنگالی سرمایہ داروں کے مفادات کی ترجمانی کرتے ہیں بنگالی محنت کشوں کی نہیں۔ حق خود اختیاری کا مطلب تو یہ ہے کہ ایسے اقلیتی قوموں کے گروہوں کی زبان اور تہذیب اور ان کے مخصوص مفادات کی خاص طور پر حفاظت کی جائے اور ان کی نشوونما کے لئے وہی مواقع مہیا کئے جائیں جو خود وہ اپنے لئے مانگتے رہے ہیں۔

اگر حق خود ارادیت اور علیحدگی کے حق کو اس نظریے سے دیکھا جائے جس سے بائیں بازو کا یہ گروہ دیکھتا ہے تو ہمیں ہندوستان میں پچیس تیس کے قریب اور پاکستان میں مزید چار آزاد اور خود مختار آپس میں متحارب ریاستیں نظر آئیں گی اور ان قوموں کے مختلف محنت کش بجائے ایک دوسرے میں مدغم ہونے کے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار نظر آئیں گے اور سرمایہ داری نظام کا وہ ترقی پسند پہلو جو بڑے بڑے کارخانوں میں مختلف قوموں کے محنت کشوں کو متحد کر دیتا ہے اور ان کی صفوں سے بعد اور تقسیم کے فاصلے مٹا کر مزدور طبقے کی عظیم برادری میں شامل کر دیتا ہے' کمزور پڑ جائے گا۔ اور ان کے انقلابی شعور کو دھندلا کر دے گا اور جیسے پختون' بلوچی' سندھی اور پنجابی طلبا کی انجمنیں جنم لے رہی ہیں اس طرح پختون' بلوچی' سندھی اور پنجابی مزدور یونینیں معرض وجود میں آ جائیں گی اور جیسے ایوب کے زمانہ میں کراچی میں ایک قوم کے مزدوروں کو قومیت کے نام پر دوسری قوم کے محنت کشوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ مختلف قوموں کے سرمایہ دار انہیں استعمال کریں گے۔

بائیں بازو کے اس گروہ کا کہنا ہے کہ چونکہ پاکستان میں جمہوریت نہیں ہے اس لئے پاکستان میں بسنے والی قوموں کو علیحدگی کا حق حاصل ہے اور اس علیحدگی کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ بلکہ ہندوستان میں مدغم ہو جانا چاہئے۔ سوشلسٹ نظریات تو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی مختلف ریاستیں مستقبل میں اکٹھی ہو جائیں گی بلکہ ریاست کا نظام ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن اس ارفع نصب العین کے حصول کے لئے بھی آج قوموں اور ریاستوں کی نشوونما ضروری ہے اور جب تک یہ نشوونما انتہا کو نہ پہنچے اور پیداواری قوتیں

اور بھی ترقی نہ کر جائیں اس وقت تک ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرمایہ داری نظام میں شخصی آمریت سے سرمایہ دارانہ جمہوریت بہرحال بہتر ہے اور پاکستانی عوام کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اس جمہوریت کے لئے جدوجہد کریں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم سب ہندوستان کی فوجوں کا انتظار کریں تاکہ وہ پاکستان میں جمہوریت قائم کر جائیں۔ کیا ہندوستانی ارفع جمہوریت کے علمبردار اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے صوبہ مغربی بنگال میں جہاں بنگالی قوم کا ایک حصہ آباد ہے' پچھلے کئی سال سے صدر راج کا نفاذ چلا آ رہا ہے۔ اور صدر راج کا یہ نفاذ ایک طرف تو مارواڑی اور گجراتی اجارہ دار سرمایہ داروں کے مفادات کی حفاظت کرتا ہے اور دوسری طرف سوشلزم کی طاقت کو کمزور کرتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سوشلزم کی علمبردار دو بڑی بنگالی پارٹیاں (کمیونسٹ پارٹی۔ مارکسٹ اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا) مل کر بھارت کے اندر آزاد بنگلہ دیش کی تحریک چلا سکتی ہیں اور ایک علیحدہ سوشلسٹ ریاست کے قیام کے لئے جدوجہد کر سکتی ہیں۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور مغربی بنگال میں جمہوریت کے بار بار ذبح ہونے کے باوجود انہوں نے آزاد بنگلہ دیش کی سوشلسٹ تحریک نہیں چلائی ان حالات کی موجودگی میں وہ کونسی وجوہات ہیں جن کی بنا پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (ترمیم پسند) نے پاکستان سے علیحدگی کی بنگلہ دیش کی تحریک کا جھنڈا اٹھایا ہوا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی یہ پالیسی بھارت کے اجارہ دار سرمایہ داروں کی تقویت کا باعث ثابت ہوئی ہے۔

بھارت کے جنوب میں تامل اور شمال مغرب میں پنجابی قوم کے قومی مطالبات پیش کئے جا رہے ہیں اور ان مطالبات کے لئے جدوجہد بھی کی جا رہی ہے۔ مشرقی پنجاب میں عین پاک بھارت جنگ کے موقعہ پر سینکڑوں سکھ اپنے پنجابی قومی مفادات کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے تھے۔ گاہے گاہے آزاد تامل ناڈو اور آزاد پنجاب ریاست کے نعرے بھی سنائی دیتے ہیں۔ حق خود ارادیت کے علمبردار آخر ان ریاستوں کی قوموں کی مکمل آزاد اور علیحدہ ریاستوں کے لئے کیوں آواز نہیں اٹھاتے اور ان کی قومی تحریکوں کا کیوں ساتھ نہیں دیتے۔

یہ قومیں تو خود بخود اپنی مرضی سے بھارتی ریاست میں شامل ہو گئی تھیں لیکن کشمیری قوم تو اپنی مرضی سے بھارتی ریاست میں شامل نہ ہوئی تھی۔ کشمیری قوم کا مقتدر قومی رہنما شیخ عبداللہ کشمیری قوم کے حق خود ارادیت کے لئے جدوجہد کرتا ہوا اپنے پرانے دوست

پنڈت نہرو سے امداد کا سوالی ہوا اسے جی کھول کر بھارتی امداد دی گئی۔ کشمیری قوم کے حق خود ارادیت کا سوال اقوام متحدہ میں پہنچا جہاں متفقہ فیصلہ ہوا کہ کشمیری قوم کو رائے شماری کے ذریعے یہ فیصلہ کرنے کا موقعہ دیا جائے گا کہ وہ جس ملک کے ساتھ چاہے شامل ہو جائے۔ بائیس برس تک اس حق خود ارادیت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے رائے شماری نہیں کرائی گئی۔ اور اقوام متحدہ کے مبصرین بائیس برس سے اس رائے شماری کے انتظار میں سرگرداں ہیں۔ رائے شماری کی بجائے بھارتی فوجوں نے کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چونکہ بھارت میں جمہوریت قائم ہے اس لئے کشمیری عوام کو بھارت میں ہی شامل رہنا چاہئے۔ بالکل بجا ہے۔ لیکن اگر بھارتی جمہوریت کشمیری عوام کے لئے کشش کا باعث ہے تو پھر تو بھارتی حکومت کو پاکستان میں فوجی مارشل لاء کے زمانے میں رائے شماری کروا ہی دینی چاہئے تھی تاکہ بین الاقوامی نکتہ چینی کا منہ بند کیا جا سکتا اور حق خود ارادیت کے ارفع اصول کی پاسداری بھی ہو جاتی لیکن رائے شماری کے برعکس پنڈت نہرو نے بھارت کی قومی اور سیاسی مجبوریوں کے پیش نظر اپنے عزیز دوست شیخ عبداللہ کو جس نے کشمیری ریاست کا عارضی الحاق بھارت سے کرنے میں مدد کی تھی متواتر دس سال تک جیل میں رکھا۔ مجیب الرحمٰن کی رہائی کے مقدس آدرش کی علمبردار اندرا گاندھی نے آج بھی کشمیری عوام کے رہنما کو ریاست بدر کر رکھا ہے اور اب تو بیگم شیخ عبداللہ کو بھی کشمیر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

ناگا لینڈ کبھی ہندوستان کا حصہ نہ تھا۔ بھارتی حکومت پچھلے پندرہ برس سے ناگا اور میزو عوام کی اپنی علیحدہ قومی ریاستیں بنانے کی جدوجہدو کو بزور شمشیر کچل رہی ہے۔ لندن کی غلامی کی دشمن انجمن کے ایک نمائندہ مسٹر پیٹرس منٹگمری کے لندن کے اخبار آبزرور میں ایک خط کے مطابق "پچھلے پندرہ برس میں ناگا لینڈ کے باشندوں کی آزادی کے جذبہ کو کچلنے کے لئے بھارت نے آبادی کا 1/5 حصہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ یا بھوک سے مار دیا ہے..... 1956ء سے لے کر بھارتی فوج نے تقریباً سات سو گرجے مسمار کر دیئے۔ دیہات اور فصلیں تباہ کر دی گئیں..... ان ناگاؤں کا بھارت کے ساتھ مذہبی' تہذیبی اور نسلی کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ان کے رہنماؤں نے 1929ء میں آزادی طلب کی تھی اور 1946ء میں انہوں نے برطانوی کیبنیٹ مشن کو یہ وارننگ دی تھی کہ بحث مباحثہ کے بغیر وہ کسی حکم کو نہیں مانیں گے۔ اور 1947ء میں مہاتما گاندھی نے انہیں یقین دلایا تھا کہ کوئی بھارتی حکومت

انہیں بھارت میں شامل ہونے کے لئے مجبور نہیں کرے گی۔ اس کے باوجود آج ناگا لینڈ کے ہر گاؤں میں بھارتی فوج تعینات کر دی گئی ہے (پاکستان ٹائمز 6- فروری 1972ء)

حق خود ارادیت اور علیحدگی کے حق کے ان علمبرداروں کی اس سلسلہ میں زبان کیوں گنگ ہے۔ محض اس لئے کہ ناگا آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹی قوم ہے۔ لیکن کیا چھوٹی قوموں پر حق خود ارادیت کا اصول لاگو نہیں ہوتا؟ حق خود ارادیت کا اصول تو وضع ہی چھوٹی قوموں کی نشوونما کے لئے کیا گیا تھا۔

بائیں بازو کا یہ گروہ پاکستان کی تحریک کے پیچھے مذہبی محرکات کو بنیاد قرار دے کر مادی حقائق پر پردہ پوشی کر کے وہی کام سر انجام دیتا ہے جس کے لئے پاکستان کے رجعت پسند پچھلے چوبیس برس سے کوشاں ہیں۔ مولانا مودودی نے پاکستان بننے سے پہلے تحریک پاکستان کی اس لئے مخالف کی تھی کہ یہ تحریک مسلمان اقوام کی نیشنلزم پر مبنی تھی۔ آج وہی مولانا مودودی کہہ رہے ہیں کہ پاکستان بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ اس خطہ زمین میں اسلام کے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کا تجربہ کیا جائے گا۔ اگر پاکستان کی اقوام کی تحریک پر مذہبی چھاپ بہت گہری ہے تو کیا ہندوستان کی قومی تحریک پر مذہب کی چھاپ مدھم ہے۔ ہندوستان میں آج بھی چھوت چات اور ذات پات کئی کروڑ انسانوں کا حق انسانیت کھوئے ہوئے ہے۔ اور آج بھی وید اور گیتا ہندوستانی راج نیتی پر گہرا اثر رکھتی ہے۔ لیکن اس سے یہ حقیقت مٹ نہیں جاتی کہ ہندوستان کی سیاسی تحریکیں بھارتی قوموں کے مادی حالات پر استوار ہوئی ہیں۔

حق خود ارادیت اور علیحدگی کے حق کی مثال دیتے ہوئے ساری دنیا کے سوشلسٹ سویٹ یونین کی ریاست کی مثال دیتے ہیں کیونکہ زار روس کی غلام قوموں کو سویٹ ریاست میں آئینی طور پر علیحدگی کا حق بھی دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سویٹ یونین کے آئین میں علیحدگی کا حق دے کر سوشلزم کے عظیم آدرش کی ترجمانی کی گئی ہے اور مختلف قوموں کے مساوات اور برابری کے نظریات کو تقویت دینے کے لئے آئینی تحفظ دیا گیا ہے لیکن سویٹ یونین کے موجودہ رہنما حق خود ارادیت اور علیحدگی کے اصول کی جو تاویل کر رہے ہیں اس کا سوشلزم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ سرتاپا قوم پرستی پر مبنی ہے۔ چیکو سلاو یکیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے چیکو سلاو یکیہ سویٹ ریاست کا حصہ نہ ہے بلکہ ایک آزاد ریاست ہے۔ اور وارسا پیکٹ کی ممبر ہے۔ 1968ء میں اس آزاد ریاست کی کمیونسٹ پارٹی نے وارسا پیکٹ سے تعلقات کو توڑنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اور ساری قوم

تقریباً اس بات پر متفق ہو گئی۔ روسی رہنماؤں نے اس مسئلے کا سیاسی حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ لیکن سیاسی حل چیک قوم کی قومی تحریک کو مضبوط کرتا چلا گیا۔ اور آخر وارسا پیکٹ کے ٹینکوں نے سیاسی حل کو بالائے طاق رکھ کر قومی علیحدگی کے اس جذبے کو کچل ڈالا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک رجعت پسند تحریک تھی۔ لیکن بیس سال بعد سوشلسٹ ریاست میں اس تحریک کا ابھرنا بذات خود ان پالیسیوں کی نفی کرتا ہے جو روسی رہنماؤں نے اختیار کر رکھی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ چیک قوم کی یہ تحریک سامراج کو تقویت دیتی تھی اور وہ ریاستیں جو کمیونزم کے راستے پر گامزن ہیں ان کے لئے نقصان دہ تھی اس لئے اس کا کچلنا ضروری تھا۔ لیکن وہ کون سی گارنٹی تھی جس کے پیش نظر شیخ مجیب الرحمٰن کی تحریک کے لئے ہتھیار مہیا کئے گئے۔ سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد کے خلاف تین بار ویٹو استعمال کیا گیا' اور اقوام متحدہ کی 105 قوموں کے ووٹ کی نفی کی گئی۔ واضح رہے کہ 105 قوموں کا ووٹ فوری جنگ بندی کے لئے تھا۔ امن کے لئے تھا' ایک ریاست کے دوسری ریاست کے خلاف جارحانہ حملے کے خلاف تھا۔ غرضیکہ اس پالیسی کے عین مطابق تھا جس کے لئے سویٹ کمیونسٹ پارٹی دوسری جنگ عظیم کے بعد سے لڑ رہی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے 6- جنوری 1972ء کو کلکتہ میں اندرا گاندھی کے پہلو میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا "کمیونزم بنگلہ دیش کے خلاف ہے۔ اس لئے بنگلہ دیش میں کمیونزم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔" کمیونزم کی مخالفت میں اس قسم کا اعلان ہٹلر نے کیا تھا۔ چیانگ کائی شک نے کیا تھا' امریکی سامراج نے کیا اور پھر سہارتو نے کیا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چیکو سلاو یکیہ میں سوشلزم کے روشنی کے مینار سویٹ یونین کی حفاظت کے لئے اس کی مغربی سرحدوں کے ساتھ ایک دوست حکومت کی ضرورت تھی اس لئے چیکو سلاو یکیہ میں وارسا پیکٹ کی فوجیں داخل کی گئیں۔ لیکن 1968ء میں جنگ کے کوئی حالات نہ تھے اور پھر ہائیڈروجن بم اور براعظمی مزائیلوں کے اس زمانے میں اس قسم کے خطرات کی کوئی وقعت نہیں جب کہ سویٹ یونین کے بحری بیڑے امریکی سامراج کے مقابلہ میں دنیا کے تمام سمندروں میں پھر رہے ہیں۔ اگر یہی دلیل تسلیم کر لی جائے تو کیا چین ایک سوشلسٹ ملک نہیں ہے۔ اس کی سرحدوں پر ایک ایسی ریاست کا قیام جو چین کے دشمن (جو پہلے ایک بار چین پر حملہ کر چکی ہے) پچپن کروڑ آبادی کے سرمایہ دار

ملک بھارت کا ساتھ دے کہاں تک سوشلزم کی تقویت کا باعث بنے گا۔ چین کی سوشلزم میں لاکھ کیڑے نکال لیجئے لیکن یہ کونسی سوشلسٹ پالیسی ہے جس کے تحت بھارت جیسے بڑے سرمایہ دار ملک کو 1962ء میں چین کے خلاف حملہ کرنے میں مدد کے لئے سویٹ یونین کی طرف سے امریکہ کی طرح بھاری ٹرانسپورٹ جہاز مہیا کئے گئے اور اب اس کی سرحدوں پر ایک ایسی نئی ریاست قائم کر دی گئی ہے جو چین کی سوشلسٹ حکومت کے خلاف ہے اور بھارتی سرمایہ دار حکومت کی نہ صرف دوست ہے بلکہ اس کی دست نگر ہے اور اس کے رحم و کرم پر رہے۔

قوموں کے حق خود ارادیت کا مسئلہ پس ماندہ ترقی پذیر ممالک تو کیا ابھی تک نہایت ہی ترقی یافتہ سرمایہ دار اور سوشلسٹ ممالک میں بھی حل طلب ہے۔ شمالی آئرلینڈ کے مسئلہ کو ہی لیجئے۔ آج ایک بار پھر آئرلینڈ کے باشندے اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں اور ان کی یہ جدوجہد پچھلے چار سو سال سے جاری ہے۔ برطانوی حکومت بجائے سیاسی حل ڈھونڈنے کے لئے اس کو بزور شمشیر حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے یوگو سلاو یکیہ کی ریاست میں کروشیا کے صوبہ کی کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کو اس لئے استعفیٰ دینا پڑا کہ کروشی آزادی کی قومی تحریک برابر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اور مارشل ٹیٹو کو آخر یہ دھمکی دینی پڑی کہ وہ فوج کو استعمال کریں گے۔ ابھی حال ہی میں سویٹ یونین کی ریاست میں چار یوکیرنیوں کو سوشلسٹ ریاست کے قیام کے 54 سال بعد نیشنلسٹ خیالات پھیلانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے عراق' ایران' سوڈان اور کئی دوسری ریاستوں میں بھی یہی مسائل درپیش ہیں۔

موجودہ دور میں سویٹ کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں عالمی سوشلسٹ تحریک کے ایک دھڑے نے قوموں کی آزادی اور سوشلسٹ تحریک کی نشوونما اور ترقی کے لئے چند اصول وضع کئے ہیں جن میں سے ایک اصول پرامن بقائے باہمی کا اصول ہے۔ سویٹ کمیونسٹ پارٹی اس اصول کی سب سے پہلی علمبردار ہے۔ کمیونسٹ اور مزدور پارٹیوں کی عالمی کانفرنس جو 1969ء میں ماسکو میں منعقد ہوئی اس میں ایک بار پھر یہ اعلان کیا گیا۔ امن کی حفاظت کی جدوجہد کا مختلف سماجی نظام رکھنے والی ریاستوں کے درمیان پرامن بقائے باہمی کے اصول کو سامراجیوں سے تسلیم کرانے کی جدوجہد کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ اس کا مطالبہ ہر چھوٹی بڑی ریاست کی حدود کے خلاف ورزی نہ کرنے کے اصول کا احترام کرنا' مکمل خود مختاری' برابری اور دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت' ہر قوم کے اپنے سماجی'

اقتصادی اور سیاسی نظام کے متعلق آزادانہ طور پر فیصلہ کرنے کے حق کو تسلیم کرنا' اور بین الاقوامی جھگڑوں کو سیاسی طور سے گفت و شنید کے ذریعے حل کرنا ہے۔ پرامن بقائے باہمی کی پالیسی ترقی پذیر ممالک کے اقتصادی اور سماجی مسائل کے مثبت حل میں مدد دیتی ہے۔"

پرامن بقائے باہمی کی پالیسی مظلوم قوموں کو اپنی آزادی کے حصول کی پرامن یا مسلح جدوجہد کی نفی نہیں کرتی اور نہ ہی اس پالیسی سے رجعت پسند حکومتوں کی امداد مقصود ہے۔ (کمیونسٹ اور مزدور پارٹیوں کی کانفرنس۔ ماسکو 1969ء۔ صفحہ 51)

"ہم کمیونسٹ' دنیا کے ہر حصے میں' مقامی جنگوں سے رجوع' سامراجیوں کے تمام جارحانہ اقدامات' اور ہر قسم کی سامراجی مداخلت کے خلاف متحدہ ایکشن کی اپیل کرتے ہیں (ایضاً صفحہ 57)

پرامن بقائے باہمی اور دوسری ریاستوں کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کے ان ارفع اصولوں کا بنگلہ دیش کے مسئلہ کے سلسلہ میں کس قدر احترام کیا گیا!

اندرا گاندھی نے 6- جنوری 1972ء کو کلکتہ میں مجیب الرحمٰن کے ساتھ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ بھارتی حکومت نے بھارتی عوام سے تین وعدے کئے تھے۔ تینوں وعدے پورے کر دیئے گئے ہیں۔ یہ وعدے کیا تھے؟ یہ وعدے مشرقی پاکستان کے مہاجرین کو واپس ان کے وطن میں بسانا۔ 2- شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کرانا۔ 3- اور بنگلہ دیش کو آزاد کرانے کے وعدے تھے۔

عالمی سوشلسٹ تحریک کے مندرجہ بالا اعلان کی روشنی میں بھارت کی سرمایہ دار حکومت کے بنگلہ دیش کو آزاد کرانے کا اعلان کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر دنیا ہی کے ہر حصے میں مقامی جنگوں کے ختم کرانے کے اعلان کے پیش نظر سلامتی کونسل میں جنگ بندی کے خلاف بار بار ویٹو کا استعمال کہاں تک سوشلسٹ پالیسی کی عکاسی کرتا ہے۔ کیا مقامی جنگیں کرانے کا کام اب امریکی سامراج کی جگہ عظیم سویٹ یونین نے سنبھال لیا ہے؟ کیا اپنی گماشتہ سرمایہ دار حکومتوں کے ذریعے دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور ننگی جارحیت کے لئے تھپکیاں دینے کا کام اب لینن کے سویٹ یونین نے قومی پالیسی کے طور پر اپنا لیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام کے قتل عام کو روکنے اور ان کی آزادی کی جدوجہد کے نیک کام میں ہاتھ بٹانا سوشلسٹ بین الاقوامیت کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ اگر یہ ایسا ہی ہے تو پھر 1965ء میں انڈونیشیا میں کمیونسٹوں اور تمام ترقی پسندوں کے

قتل عام کے وقت سویٹ یونین نے حرکت کیوں نہ کی؟ اپنے بحری بیڑا کو انڈونیشی سمندروں میں کیوں نہ لے گیا؟ وزیراعظم ساندرو اور دوسرے ٹریڈ یونین اور کمیونسٹ لیڈروں کی رہائی کے لئے سہارتو کی فاشٹ حکومت کے خلاف کوئی بھی عملی قدم کیوں نہ اٹھایا گیا؟

اس قتل عام کے بعد سہارتو حکومت کو قرضے کیوں معاف کر دیئے گئے اور ان کی وصولی کیوں ملتوی کر دی گئی؟ اور انہیں مزید امداد کیوں دی گئی؟

کیا وجہ ہے کہ فلسطینی مہاجروں کو جو بائیس برس سے دوسرے ملکوں میں مہاجروں کی بے بسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں' انہیں واپس بھیجنے کے لئے سیاسی حل کی تلاش برسوں سے جاری ہے۔ اور فلسطینی گوریلوں کی' جنہوں نے اپنے وطن اور اپنے عوام کی آزادی کے لئے' سامراج کے گماشتے اسرائیل کے خلاف ہتھیار اٹھا رکھے ہیں مدد نہیں کی جاتی بلکہ مخالفت کی جاتی ہے۔ اندرا گاندھی کو بنگلہ دیش کی آزادی کے لئے جنگ کرنے کے لئے نہ صرف ہر قسم کے جدید ہتھیار مہیا کئے جاتے ہیں بلکہ جنگی ماہرین ان کے حملہ میں امداد کے لئے بھیجے جاتے ہیں لیکن مصر کے صدر انور سادات کو جنگ کے لئے تیار نہیں کیا جاتا اور اسے ماسکو یاترا کرا کر سیاسی حل تلاش کرنے کے لئے واپس بھیج دیا جاتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ 1956ء میں تو مصر کے خلاف سامراجی حملہ کے وقت حملہ آوروں کو مداخلت کرنے کی سخت وارننگ دی گئی تھی لیکن 1967ء کی جنگ کے موقعہ پر چپ سادھ لی گئی۔ اس لئے کہ اسرائیل کی پشت پر امریکی سامراج کی طاقت ہے اور امریکی سامراج کے ساتھ بقائے باہمی کے اصولوں اور کیمپ ڈیوڈ کی سپرٹ کے مطابق چلنا ضروری ہے۔ اور چونکہ پاکستان نے سوشلسٹ چین سے دوستی کر رکھی ہے اس لئے پاکستان کے خلاف تمام سوشلسٹ اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر جارحیت کی امداد ضروری ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یحییٰ خاں کی حکومت چونکہ ایک آمرکی حکومت تھی اس لئے اس کے خلاف امداد دینی جائز ہے۔ بالکل بجا ہے۔ لیکن کیا ایوب خاں آمر نہ تھا؟ پاکستان میں قومی سوال کی انتہائی شکل ایوب خاں کی طویل آمریت کے دوران ہی مرتب ہوئی۔ لیکن اس آمر کو تاشقند میں سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ کیا تاشقند کا ڈرامہ محض بنگلہ دیش بنانے کے لئے سٹیج کیا گیا تھا؟ یا محض پاک چین دوستی کو ختم کرنے کے لئے؟ یہ کیسی سوشلسٹ بین الاقوامیت ہے؟ بلند بانگ اعلان ناموں کی یہ کیسی تاویلیں ہیں؟

یہ سب پالیسی مجیب الرحمٰن کے 6- فروری 1972ء کو کلکتہ میں اس اعلان کی روشنی میں

کیا معنی رکھتی ہے جس میں انہوں نے کہا "کمیونزم بنگلہ دیش کے خلاف ہے۔ اس لئے بنگلہ دیش میں کمیونزم کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کیا بنگلہ دیش بنانے کی پالیسی کی تہ میں وہی قومی مفادات پوشیدہ ہیں جن کا مطلب ہے بحر ہند میں بحری اڈے' بنگلہ دیش میں فوجی اڈے اور سوشلسٹ چین کی سرحدوں پر ایک مضبوط' وسیع مارواڑی گجراتی اجارہ دار سرمایہ داروں کی ریاست۔

ترقی پسند اور رجعتی نظریات کی کش مکش

پچھلے چوبیس برس سے پاکستان میں دائیں اور بائیں بازو کے نظریات کی جنگ جاری ہے نومبر 1949ء میں پاکستان ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ لاہور نے اپنے منشور میں اعلان کیا کہ "ہمارے حکمرانوں نے پاکستان بننے سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان ایک آزاد جمہوری ملک ہو گا۔ انہوں نے اپنے سب وعدے بھلا دیئے ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے اینگلو امریکی سامراجی بلاک میں شامل ہو گئے ہیں۔ وہ پاکستان کی رائے عامہ کو ٹھکراتے ہوئے پاکستان کو برطانوی کامن ویلتھ میں شریک کئے ہوئے ہیں..... وہ محکوم ملکوں کی جنگ آزادی کی بھی مخالفت کرتے ہیں..... جس ملک میں بھی عوام اپنے غدار حاکموں اور اینگلو امریکی سامراجیوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں تو ہماری حکومت سامراجیوں کا ساتھ دیتی ہے..... اسٹرلنگ بلاک کے اندر رہ کر ملک کی معاشیات کو اینگلو امریکی سامراجی مفادات کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ ملک کو صنعتی بنانے کے تمام منصوبے میز کی درازوں میں بند کر دیئے گئے ہیں۔ اینگلو امریکی سرمائے کو پاکستان میں آنے اور ہماری قومی دولت کو لوٹنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ملک کی زرعی زندگی اور درہم برہم ہو رہی ہے۔ جاگیری نظام بدستور قائم ہے اور یہی زندگی کو سرمایہ داری نظام کے شکنجے میں کسا جا رہا ہے۔ اس نظام میں زندگی کی تمام اعلیٰ قدریں۔ آرٹ' ادب' حسن و محبت' اخلاق و مروت اور انسانیت..... بازاری جنس بن گئی ہیں۔ آدمی آدمی کا غلام ہے..... تہذیب کی تمام نعمتیں مٹھی بھر مفت خوروں کا اجارہ بن گئی ہیں۔

ہمارے وطن کے اس معاشی زوال اور تہذیبی اور تمدنی انحطاط کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں انگریز سامراجیوں کے زمانے میں نیم نوآبادیاتی اور فرسودہ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام ابھی تک قائم ہے۔ پاکستان کے تمام محنت کش آج اس فرسودہ نظام کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی جنہیں حکمران طبقے اور اس کی سیاسی تنظیم کی جانب سے خوش

فہمیاں تھیں اپنے تجربہ کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ اس سماجی نظام کو بدلے بغیر ہماری حالت نہیں سدھر سکتی۔ اس جدوجہد کو کچلنے کے لئے ارباب اقتدار جن کا مفاد اس سماجی نظام کی بقا سے وابستہ ہے سیفٹی ایکٹ اور سیٹی آرڈیننس نافذ کرتے ہیں۔ ہم کو ہمارے انسانی اور جمہوری حقوق سے محروم کرتے ہیں۔ زبان اور قلم پر پہرے بٹھاتے ہیں..... لیکن ان تمام سختیوں کے باوجود ملک کی جمہوری تحریک برابر ترقی کر رہی ہے۔ سچی آزادی کی جنگ بدستور جاری ہے'....." یہ ہے وہ اعلان جو پاکستانی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے آج سے بائیس برس قبل پاکستان کے ترقی پسند دانشوروں نے لاہور میں کیا۔ آج یہ اعلان ہر گلی' ہر کوچے ہر کھیت سے کیا جا رہا ہے آج پاکستانی عوام کی بہت بڑی اکثریت ان مسائل کے حل پر متفق ہے۔ لیکن اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے پاکستانی عوام کو کتنی بڑی قربانی دینی پڑی ہے۔ آج 7 کروڑ بنگالی پاکستان سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ لاکھوں پاکستانیوں کا خون بہایا گیا ہے لیکن پھر پاکستانی عوام کے ذہنوں کو الجھانے کے لئے امریکی سامراج سے دوستی کے لئے دلائل دیئے جا رہے ہیں جاگیرداری سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنے کے لئے نئے حالات میں نئے حربے استعمال کئے جا رہے ہیں اور استحصالی طبقوں کی بقا کی خاطر نئے جادو ڈھونڈے جا رہے ہیں۔ اسی طرح مذہبی پیشواؤں اور جاگیردار سرمایہ دار طبقوں کے دانشوروں نے ان طبقوں کے مفادات کی حفاظت کے لئے پاکستانی عوام کے ذہنوں کو ماؤف کرنے کے لئے کریہہ سے کریہہ ہتھکنڈے استعمال کئے۔ اور پاکستان کے اندر جنم لیتی ہوئی نئی حقیقتوں کو نہ صرف دیکھنے سے انکار کر دیا بلکہ ان پر ایسے دبیز پردے ڈال دیئے کہ عوام انہیں پہچان ہی نہ سکیں۔

جب بھی کسی نے پاکستانی حقائق کو سامنے رکھ کر ملکی حالات کی جدید سائنٹیفک نظریات کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی اسے غدار اور بیرونی ایجنٹ قرار دیا گیا۔ اور پاکستانی عوام کو باور کرایا گیا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام میں اتحاد کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ اسلام کا رشتہ ہے۔ لیکن ان پیشواؤں اور دانشوروں نے یہ جاننے اور سمجھنے کی کبھی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ اسلام کا رشتہ تو دنیا بھر کے ساٹھ کروڑ کے قریب مسلمانوں میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود افغانی' ایرانی' عراقی' ترکی' مصری' الجزائری اور انڈونیشی مسلمان ایک ریاست کے نظام میں متحد نہیں اور نہ ہی اس دور میں متحد ہو سکتے ہیں۔ پان اسلام ازم کی بڑی سے بڑی تحریک بھی ان کو ایک ریاست میں متحد نہیں کر سکتی۔ انہوں نے اس بات کو کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ جیسے جیسے سرمایہ داری عہد نشوونما پاتا گیا

ہے۔ مختلف ملکوں کے مسلمان اپنی قومی ریاستوں کی تشکیل اور آزادی کے لئے برسرپیکار ہو گئے اور آخر ایک مرکز کو ختم کر دیا۔ ایک مرکز کو بار بار قائم کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن یہ تمام کوششیں ہمیشہ ناکام ہوتی رہیں۔ ان حقائق کے متعلق صرف یہ رونا رویا گیا کہ مسلمان اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے ان کی صفوں میں شگاف پڑ رہے ہیں۔ لیکن اس استدلال سے جو سوال پیدا ہوتا ہے اس کا جواب دینے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ آخر مسلمان اسلام سے دور کیوں ہو رہے ہیں؟ اور نیک خواہشات کے باوجود ان زرین اصولوں پر عمل پیرا کیوں نہیں ہو سکتے؟ اور ان کے ذہنوں میں نئے نئے خیالات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟ رجعت پسند دانشوروں نے ان سوالات کا آسان سا حل ڈھونڈ لیا۔ اور ہمیشہ یہ کہا کہ نئے خیالات اشتراکی ملکوں سے درآمد کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اشتراکی ملکوں سے تمام لٹریچر کی درآمد بند کر دی جائے اور جو لوگ ملک کے اندر یہ خیالات پھیلاتے ہیں وہ دوسرے ملکوں کے ایجنٹ ہیں غدار ہیں۔

انہوں نے اس استدلال کی کمزوری اور کھوکھلے پن پر کبھی غور نہیں کیا۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اسلام نے بھی پاکستان کی جغرافیائی حدود میں جنم نہیں لیا اور اس کا گہوارہ سعودی عرب ہے۔ تو کیا اسلام کا پرچار کرنے والے سعودی عرب کے ایجنٹ ہیں۔ اور چونکہ سعودی عرب امریکہ کا حلقہ بگوش ہے اس لئے وہ سب امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔ میں کوئی عالم دین نہیں ہوں مگر علم سے عالم گیر استفادہ کے سلسلہ میں علماء دین کی تقاریر میں اکثر یہ حدیث سنی ہے کہ اطلبو العلم ولو کان بالیقن۔ ترجمہ: علم کو تلاش کرو چاہے وہ چین میں ہو۔ اس حدیث پاک میں کس قدر جامعیت ہے کہ انسانی فلاح و بہبود پر مبنی کسی بھی علم و فن کو کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے ہی دانشوروں نے شام ہمدرد کی تنظیم قائم کر رکھی ہے جس کی مجلسیں ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کی شرابور فضاؤں میں منعقد کی جاتی ہیں۔ اور قحط الرجال کے متعلق مضامین پڑھے جاتے ہیں، تقریریں کی جاتی ہیں اور پھر کسی غازی، کسی شاہین، کسی صف شکن مومن کی انتظار کی جاتی ہے۔ لیکن وائے قسمت کوئی شاہین پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کہ نئی پیداواری قوتیں جو اپنے ساتھ نئے پیداواری رشتے بھی لاتی ہیں نئے خیالات اور نئے نظریات کو جنم دیتی ہیں اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ نئے خیالات اور نئے نظریات بڑھتے اور پھیلتے چلے جاتے ہیں کیونکہ ملک کے کونے کونے کو سرمایہ داری

کی نئی پیداواری قوتیں اور پیداواری رشتے اپنی لپیٹ میں لیتے چلے جاتے ہیں۔ خود یہی لوگ تو ان قوتوں کو پھیلانے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں وہ اس نئے سرمایہ داری نظام کے بطن سے جنم لیتے ہوئے نئے خیالات' نئے نظریات جن کی نمائندگی مزدور طبقہ کرتا ہے نفرت کرتے ہیں' حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں اور ان پر غداری کا لیبل لگا دیتے ہیں اور ان پر ملک دشمنی اور بیرونی نظریات کا الزام تھوپ دیتے ہیں۔ لیکن اس سرمایہ داری نظام کے بطن سے جنم لینے والے رجعت پسند' عیش کوش' بھوک' مفلسی اور بے روزگاری پیدا کرنے والے' تشدد اور ظلم کو جائز قرار دینے والے خیالات اور نظریات کو وہ سینے سے لگاتے ہیں اور ان گھناؤنے نظریات کا پرچار کرنے کے لئے ان پر اسلام کا خول چڑھاتے ہیں' انہیں صیقل کرتے نہیں' چمکاتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں جنم جنم کے بے بس اور مقہور انسانوں کے ذہنوں میں انڈیل دیتے ہیں۔

سوشلزم کی مخالفت کرنے کے لئے یہی دانشور عموماً ایک اور دلیل بھی دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دیکھئے روس میں سوشلزم چالیس سال بھی ٹھیک طرح نہ چل سکا اور اس میں شگاف پڑ گئے۔ اگر اس میں صداقت' کوئی پائیداری ہوتی تو اتنی جلدی اسے دیمک نہ لگ جاتی۔ اتنی جلدی اس میں انتشار کی قوتیں جنم نہ لے لیتیں۔ گویا کہ چالیس برس میں سوشلزم کے اندر انتشار کی کیفیت پیدا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ جھوٹا نظریہ ہے اس میں کوئی صداقت نہیں یہ عوام دشمن اپنی اس دلیل سے سوشلزم کو جو گزند پہنچاتے ہیں وہ اپنی جگہ درست۔ لیکن غیر شعوری طور پر یہ عناصر اس دلیل سے اسلام کو بہت بھاری نقصان پہنچا رہے ہیں اور اس کی بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد اسلام کو نئے سانچے میں ڈھال دیا گیا' خلافت ختم کر دی گئی اور بادشاہت اور جاگیرداری نظام قائم کر دیا گیا۔ تو کیا اسلام میں (نعوذ باللہ) صداقت نہیں ہے؟ اس لئے اتنے تھوڑے عرصے میں خلافت ختم کر کے بادشاہت قائم کر دی گئی۔ یہی دانشور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر سوشلزم کا نظریہ درست ہوتا تو اس میں مختلف خیالات پیدا نہ ہوتے۔ اس میں روسی سوشلزم' چینی سوشلزم' کاسٹروکی سوشلزم' یوگو سلاویہ کی سوشلزم کے علیحدہ علیحدہ راستے اس بات کا ثبوت ہیں کہ سوشلزم کا کوئی مربوط نظریہ نہیں اور اس میں انتشار کی یہ کیفیت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ سوشلزم کے نظریے کی کوئی مستقل بنیاد نہیں۔ ہم ان دانشوروں سے پھر بصد ادب یہی عرض کریں گے کہ آپ کی یہ دلیل بھی اسلام کو سخت

نقصان پہنچا رہی ہے۔ کیونکہ اسلام میں حنفی' وہابی' شیعہ' احمدی' اہل حدیث اور درجنوں مزید فرقے سینکڑوں سالوں سے جنم لے چکے ہیں اور ابھی تک تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ اس لئے آپ کی یہ دلیل بھی وزن نہیں رکھتی۔

اسلام اشاعت اور پراپیگنڈے کے لحاظ سے دنیا بھر میں سب سے منظم مذہب ہے۔ اور ہر روز لاکھوں مسجدوں میں پانچ بار کروڑوں انسان بارگاہ ایزدی میں حاضری دیتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار ہر گلی' ہر محلہ میں جمعہ کے اجتماع ہوتے ہیں' سال میں تیس دن روزے رکھے جاتے ہیں اور دو بار عیدوں میں تمام ملت اسلامیہ کے اجتماع کئے جاتے ہیں اور سال میں ایک بار دنیا بھر کے مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ لیکن اس تمام تنظیم' اشاعت اور پراپیگنڈے کے باوجود مسلمان ممالک ذلت و خواری کے عمیق گڑھوں میں گرے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے ساتویں عشرے میں سقوط یروشلم اور ڈھاکہ سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور انہیں اپنی شکستوں اور تباہی اور انحطاط کی وجوہات مادی دنیا میں ڈھونڈنی چاہئیں۔ انہیں سماج کے ارتقاء اور نشوونما' اور ارتقاء اور انقلاب کے عمل کا جو ہمیشہ سے جاری اور ساری ہے اور جو جاری اور ساری رہے گا اور تغیر کے جس عمل کو ثبات حاصل ہے بغور مطالعہ کرنا چاہئے اور ان قوانین کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے جو قدرت اور سماج کے بطن میں موجود ہیں اور جو انسانی خواہشات کے پابند نہیں۔ سماجی ارتقاء اور انقلاب کے اصول اور نظریات مزدور طبقے کو ان کی زندگی سکھلا رہی ہے۔ ان کا عمل ہر لحظہ انہیں نئے نظریات کے نزدیک لا رہا ہے اور یہی وہ طبقہ ہے کہ جب وہ ان نظریات سے پوری طرح لیس ہو جائے گا گراوٹ اور ذلت کی اتھاہ گہرائیوں سے سماج کو بچا لے گا۔ موجودہ مادی حالات کی بنیادوں پر ایک نئے صحت مند اور خوبصورت معاشرے کی تعمیر کرے گا۔ گلے سڑے جاگیرداری' سرمایہ داری نظام کے نقیب دانشور اگر دلی خواہش رکھتے ہیں کہ پاکستانی معاشرہ کی نشوونما صحت مندانہ خطوط پر ہو تو انہیں مزدوروں اور دوسرے محنت کشوں کے ذہنوں کو معاؤف کرنے کی کوششیں ترک کر دینی چاہئیں۔

پاک بھارت بنگلہ دیش جنگ نے کئی اور نظریاتی سوالات کو بھی جنم دیا ہے پاکستانی عوام کے لئے اپنی بقا اور نشوونما کے لئے ان سوالات پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ جہاد کا مسئلہ ہے۔ جنگ کے دوران پاکستانی عوام شب و روز جہاد کا نعرہ لگاتے رہے ہیں اور ہر شخص اس جذبہ سے سرشار ہے۔ لیکن یہ جہاد یحییٰ خان اور

اس کے فوجی ٹولے کی رہنمائی میں لڑا جا رہا تھا جو ننگ دین' ننگ وطن اور ننگ انسانیت ٹولہ تھا۔ یہ ٹولہ گندی نالی میں رینگتے ہوئے گندے کیڑوں سے بھی گندہ اور غلیظ تھا۔ اگر بڑے بڑے مذہبی پیشوا' علماء اور حکما یہ کہیں کہ انہیں اس ٹولے کی بد کرداری کے متعلق کچھ علم نہ تھا تو پھر انہیں پاکستان کی سیاست میں دخل دینا چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ یہ ان کے بس کی بات نہیں انہیں پھر اس ملک کے عوام کی نظریاتی رہنمائی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ان حالات میں شب و روز اس غلیظ ٹولے کی رہنمائی میں جہاد کرنے کی تلقین کہاں تک درست تھی! پاکستان کے مذہبی پیشواؤں کا یہ فرض ہے کہ وہ پاکستانی عوام کو اس سوال کا جواب دیں۔

اور اگر یہ علماء اور مذہبی پیشوا سب کچھ جانتے ہوئے بھی یحییٰ خاں کی قیادت میں جہاد کرنے کی تلقین کئے جا رہے تھے تو پھر اس سے زیادہ پاکستانی عوام سے بد دیانتی اور ریا کاری نہیں ہو سکتی۔ اور پھر وہ علماء' دانشور اور سیاسی رہنما جو اس سارے تاریک دور میں یحییٰ خان کے ایل۔ ایف۔ او کو مشعل راہ بتاتے رہے اور تاریخ کے اس ذلیل ترین شخص سے اسلامی آئین بنوانے کے لئے امید رکھتے رہے وہ اسلام کے کس حد تک علمبردار ہیں!

اس کے علاوہ بھارت میں پانچ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ بھارتی ریڈیو سے اکثر بھارت کے علماء کے یہ فتوے نشر ہوتے رہے کہ بھارتی مسلمان پاکستان کی ناپاک' شرابی قیادت کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بھارتی مسلمان جہاد کر رہے تھے؟ یا مغربی پاکستان کے مسلمان۔ اور اگر مغربی پاکستان کے مسلمان جہاد کر رہے تھے تو کیا بھارت کے مسلمان اور علماء سب کافر ہو گئے ہیں؟ اور اگر بھارت کے مسلمان جہاد کر رہے تھے تو کیا مغربی پاکستان کے مسلمان کافر ہو گئے ہیں یا دونوں ملکوں کے مسلمان جہاد کر رہے تھے؟

اس طرح مشرقی پاکستان کے مسلمان جن کی آبادی مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے (مغربی پاکستان میں بھی سرحد بلوچستان' سندھ اور ان کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بہت سے مسلمان جنگ کے خلاف تھے) مغربی پاکستان کے خلاف جو جنگ کر رہے تھے کیا وہ جہاد تھا؟ یا وہ لوگ جنہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کا ساتھ دیا تھا کافر ہو گئے تھے؟

گول میز کانفرنس کے موقعہ پر وہ رہنما جو شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائی کے بعد شمولیت کے بغیر کانفرنس میں شامل نہ ہونے کا اعلان کر رہے تھے کیا وہ اسلام کی آبیاری کر رہے تھے یا بیخ کنی؟

اس جنگ کے دوران بڑی بڑی کاروں پر ایسے اشتہار چسپاں تھے جن پر لکھا تھا کہ "جنگ اسلام لڑ رہا ہے۔" اس جنگ میں ایسے ترانے گائے گئے ہیں۔ جن کا مفہوم "مومن لڑدا اے ہتھیار بنا" کے ترانے سے واضح ہوتا ہے۔ اور اگر کسی بڑے صاحب نے خون کا حقیر سا عطیہ دے دیا تو انہوں نے ساتھ ہی فرمایا کہ میرا خون صرف کسی مسلمان مجاہد کو دیا جائے کیا دوسرے مذاہب کے لوگ پاکستان کی اس جنگ میں شریک تھے یہ پڑھ کر ان کا جذبہ ٹھنڈا نہیں پڑا ہو گا۔ کیا ایسے لوگ مسلمانوں کے بغیر باقی تمام پاکستانیوں کو پاکستانی نہیں سمجھتے؟ اور اگر کسی دوسرے سپاہی کو ان کا پاک خون دے دیا جاتا تو کیا خون دینے والا بھی غیر مسلمان ہو جاتا؟

یہ نعرے اور نظریات ہیں جو ساری قوم پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ مومن بغیر ہتھیار اور روٹی پانی کے لڑ سکتا ہے (خواہ اس کے لئے مادی اور نظریاتی حالات نہوں یا نہ ہوں) اس لئے کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ ہم جنگ ہار سکتے ہیں۔ اور جب شکست کی آواز ریڈیو پاکستان پر سنائی دی تو لاکھوں پاکستانی دم بخود ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے چوبیس برس سے سستے نعروں اور غیر سائنسی نظریات کا اس قدر پرچار کیا گیا ہے کہ موجودہ پاکستانی اور بین الاقوامی حالات پر سیاہ پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ اور پاکستان کی دفاع کے لئے جو ضروری اقدامات ہیں ان کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں دی گئی۔ نہ سامراجی غلبے کو ختم کیا گیا' نہ جاگیرداری اجارہ دار سرمایہ داری نظام کا قلع قمع کیا گیا۔ نہ پبلک سیکٹر میں فولاد اور کیمیکل کے کارخانے قائم کئے گئے۔

جن لوگوں نے ان نعروں کا صدق دلی سے پرچار کیا ہے اور مقبول بنایا ہے اور پاکستانی "معیشت پر سامراجی غلبہ اور جاگیرداری سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنے میں مدد و معاون رہے ہیں انہیں ویسی سے صدق دلی سے موجودہ حقائق کو پرکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اب اس صدر یحییٰ اور اس کے نااہل فوجی ٹولے کو نشانہ بنایا جا رہا ہے جس کے وضع کردہ ایل۔ ایف۔ او کے ذریعے پاکستان میں اسلامی آئین کے نفاذ کی بشارت دی جا رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کی شکست میں بہت بھاری ذمہ داری ہے لیکن یہ ساری حقیقت نہیں ہے یہ لوگ بھی اسی گندے سماج کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں جسے سرمایہ داری جاگیرداری نظام کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں اور رہنماؤں نے اوپر بیان کردہ نعرے اور نظریات پھیلائے ہیں وہ دراصل کسی نہ کسی شکل میں اس نظام کو جوں کا توں یا چھوٹے

موٹے رد و بدل کے ساتھ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ محض ایک شخص پر جنگ ہارنے کی تمام ذمہ داری ڈالنا بھی سوچی سمجھی تدبیر کے تحت ہے اور اس طرح سامراجی اثرات' جاگیرداری سرمایہ داری نظام جس کی کوکھ سے اس شخص نے جنم لیا ہے کی پردہ پوشی کی جا رہی ہے۔ پاکستان کی ہزیمت اور شکست دراصل اس نظام کا نتیجہ ہے جو پچھلے چوبیس برس سے اسلام اور پاکستان کی سالمیت کے نام پر یہاں قائم کیا گیا ہے۔ پچھلے چوبیس برس میں جو حکومت بھی یہاں بنی ہے اس نے ملک کی ترقی اور تحفظ کا ایک ہی راستہ اختیار کیا ہے جس نے لازماً پاکستان کی تباہی کی طرف لے جانا تھا۔

آج پاکستانی عوام کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ سامراجی غلبے' جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ اس نظام کو ختم کرنے کی جدوجہد ہی باقی ماندہ پاکستان کی سالمیت اور عوام کی خوشحالی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

موجودہ پاکستان میں قوموں کے مسائل کا حل

آج پاکستان کے عوام کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ موجودہ پاکستان کی آزادی اور سالمیت کو کیسے برقرار رکھا جائے۔ اور

پاکستانی عوام کے روٹی اور روزگار' بھوک اور بیماری' جہالت اور تہذیبی پسماندگی کے مسائل کیسے حل کئے جائیں؟

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ دور میں جبکہ سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام نہایت تیزی سے اپنی موت کی طرف جا رہا ہے سوشلزم کے بغیر ان تمام مسائل کا خاطر خواہ حل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے اندر ان مسائل کا قطعاً کوئی حل نہ ہے۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے تحت بھی ملکی سالمیت اور آزادی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے اور عوام کے مسائل کی شدت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

آج کچھ لوگ تشدد اور ڈنڈے کے زور سے پاکستان کی سالمیت اور آزادی کو برقرار رکھنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تشدد اور دباؤ سے پاکستان کی سالمیت اور آزادی کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ بلکہ اگر تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا تو اس کے نتائج مزید انتشار کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔ تشدد کا راستہ بڑے سرمایہ داروں اور سامراج کے مفادات کی حفاظت کا راستہ ہے اس لئے ہر محب وطن اور خاص طور پر محنت کش طبقوں کو اس پالیسی کی مخالفت کرنی چاہئے۔

دوسری طرف کچھ گروہ پاکستان کے موجودہ قومی مسائل کا حل علیحدہ علیحدہ آزاد قومی ریاستوں کی تشکیل بتا رہے ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں علیحدگی کی تحریکوں کو تقویت دینے میں مصروف ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پالیسی پاکستان کے محنت کشوں کی صفوں میں انتشار ڈالنے کی پالیسی ہے اور چھوٹے صوبوں کے بڑے اور چھوٹے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور سامراج کے مفادات کی حفاظت کی پالیسی ہے۔ محنت کشوں اور ترقی پسند قوتوں کو ان سرمایہ داروں کا دم چھلا بننے سے انکار کر دینا چاہئے اور ان کے رجعتی نعروں اور پالیسیوں کو

ننگا کرنا چاہئے۔

موجودہ حالات میں مارشل لاء کو فوراً" ختم کر دینا چاہئے اور جمہوریت کو بحال کرنا چاہئے اور فوری طور پر جمہوری مرکزیت کے اصولوں پر آئین کی تشکیل کرنی چاہئے۔

○ جمہوری مرکزیت کے اصولوں کی روشنی میں ملکی دفاع' خارجہ پالیسی' بیرونی تجارت' قرضے کرنسی' ذرائع نقل و حمل یعنی ریلوے' پی آئی اے' قومی شاہراہیں' ڈاک و تار و ٹیلی فون وغیرہ' پبلک سیکٹر میں بھاری اور بنیادی صنعتیں (یعنی فولاد اور کیمیکل وغیرہ) بجلی' گیس اور سائنٹیفک ریسرچ اور مرکزی قانون وغیرہ کے محکمے مرکزی حکومت کو دیئے جائیں۔ اور مرکزی حکومت کو ان محکموں کو چلانے کے لئے ٹیکس لگانے کے اختیارات ہوں۔

○ باقی تمام محکمے صوبائی حکومتوں کو سونپ دیئے جائیں۔ اور ان محکموں کے سلسلہ میں صوبائی اسمبلیوں کو قانون نافذ کرنے کے مکمل اختیارات ہوں۔

○ موجودہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو قرار دے دی جائے اور انگریزی زبان کی جگہ فوری طور پر اردو کو دفتری اور عدالتی زبان قرار دیا جائے۔ اور سائنٹیفک اور دوسرے علوم اردو میں منتقل کرنے کا فوراً" بندوبست کیا جائے۔

○ پنجابی' پشتو' سندھی اور بلوچی زبانوں کو صوبوں میں سرکاری زبانیں قرار دیا جائے اور ان کی ترقی اور نشوونما کے لئے بھرپور کوشش کی جائے۔ ان کے علاوہ دوسری زبانوں کو بھی ترقی دی جائے۔

○ گو مکمل جمہوریت پاکستان کی سالمیت اور آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے لیکن محض جمہوریت پاکستانی عوام کے سارے مسائل کا حل نہ ہے اور نہ ہی جمہوریت پاکستانی عوام کے غربت اور پسماندگی کے مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ اس لئے موجودہ حالات میں ضروری ہے کہ جاگیرداری نظام کو فوری طور پر ختم کر دیا جائے۔ اور زمین کاشتکاروں میں تقسیم کر دی جائے۔ سامراج سے غلامی اور ماتحتی کے رشتے توڑ دیئے جائیں۔ اور اپنی تجارت اور صنعتوں کو سامراج کے غلبہ سے آزاد کرایا جائے۔ سامراجی ذہنی اور فوجی اڈے ختم کر دیئے جائیں چین کے ساتھ گہرے اقتصادی اور سیاسی تعلقات قائم کئے جائیں۔ پبلک سیکٹر میں بنیادی اور بھاری صنعتیں قائم کی جائیں۔ بڑی صنعتوں کو مکمل طور پر قومی ملکیت میں لیا جائے۔ اور انہیں محنت کشوں کی کمیٹیوں کے ذریعے چلایا جائے۔ پرانے تعلیمی نظام کو یکسر ختم کر کے سائنٹیفک بنیادوں پر نئے تعلیمی نظام کو استوار کیا جائے اور اسے پیداوار کے

ساتھ مربوط کیا جائے۔

○ پچھلے تین چار سال کی سیاسی جدوجہد اور بین الاقوامی حالات میں پاکستانی عوام میں بے پناہ بیداری اور جذبہ پیدا کر دیا ہے اور ان میں زبردست پہل قدمی اور جدوجہد کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔ ان صلاحیتوں اور اس جذبے اور بیداری کو پاکستانی سماج کی از سرنو تشکیل کے لئے بروئے کار لانا چاہئے۔

نیا عالمی نظام

بیسویں صدی کے آخری عشرے کا یہ عظیم المیہ ہے کہ ایک قدیم سرزمین پر جو کہ نہایت ہی ارفع اور عالیشان تہذیب کی گہوارہ رہی ہے اور جہاں انسانی ترقی کی عظیم کامیابیاں منقش ہیں' اسے آزادی اور قانون کی حکمرانی کے نام پر دوزخ کی آگ کی نذر کر دیا گیا ہے۔

گورباچوف کی امن یلغار جس نے دائمی امن اور جنگ سے پاک دنیا کے متعلق غیر حقیقی امیدیں پیدا کر دی تھیں وہ گلا سناسٹ اور پریسٹرائیکا کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہیں دوسری جنگ عظیم کے بعد دوسری بار سویت یونین نے سیکورٹی کونسل میں اقوام متحدہ کے پرچم تلے امریکی سامراج کی راہنمائی میں لڑی جانے والی جنگ کے روکنے کے لئے اپنا حق استرداد استعمال نہیں کیا۔ پہلی بار جنگ کوریا کے شروع ہونے پر اسٹالین نے سابق اتحادیوں پر اعتماد کرتے ہوئے باوجود اپنے مشیروں کے مشورے کے نئے حالات کو نہ سمجھتے ہوئے سیکورٹی کونسل کی میٹنگ میں شامل نہ ہو کر امریکی سامراج کو شمالی کوریا کے خلاف اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے جنگ کرنے کے لئے کھلی چھٹی دے دی۔ اس وقت گو سویت یونین نے دوسری جنگ عظیم میں زبردست کامیابیاں حاصل کی تھیں لیکن اس کی معیشت جنگ کے چرکوں سے نڈھال تھی مگر آج وہ بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت نہ رکھتی ہوئی اندرونی پالیسیوں کی وجہ سے سامراجی ممالک کے سامنے کشکول اٹھائے نظر آتا ہے۔ سعودی عرب سے اس نے 4 ارب اور کویت سے ایک ارب ڈالر قرضے حاصل کئے ہیں۔ امریکہ اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں سے وہ قرضوں اور امداد کی بھیک مانگ رہا ہے۔ اور ان قرضوں کے حصول کے لئے جو اسے قیمت ادا کرنی پڑی ہے وہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس بار وہ سلامتی کونسل کی میٹنگ میں شامل نہیں ہوا بلکہ شامل ہو کر اس نے جنگ لڑے جانے کے حق میں ووٹ بھی دیا ہے۔

دنیا بھر کے عوام پر ایک بار پھر یہ تلخ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ جب تک موجودہ سرمایہ داری نظام قائم ہے' جنگیں ختم نہیں کی جا سکتیں۔ عین اس وقت جب دنیا کو یہ خوش

خبری سنائی جا رہی تھی کہ سوشلسٹ ممالک میں (سرمایہ دارانہ) منڈی کی معیشت قائم ہونے سے دنیا میں جنگ کے امکانات ختم کر دیئے گئے ہیں' مشرق وسطیٰ میں ایک نہایت ہی خوفناک جنگ پھوٹ پڑی۔ جو ساری دنیا کو نگلتی ہوئی نظر آتی ہے مسٹر گورباچوف جس کی تعریفوں کے مغربی ذرائع ابلاغ پل باندھ رہے تھے اور جس کے انقلابی اقدامات گلا سناسٹ اور پریسٹرائیکا کو تمام امن پسند اور اچھے لوگ سراہ رہے تھے' نے غیر ارادی طور پر دنیا کو جنگ کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ دنیا ابھی تک سویت یونین کے وزیراعظم کی اس گونجدار آواز کو نہیں بھولی جس نے دو سامراجی طاقتوں۔ (برطانیہ اور فرانس اور ان کے پالتو اسرائیل کو نہر سویز کو قومیانے کے موقعہ پر جنگ شروع کرنے پر للکارا تھا۔ اور اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ جنگ فوراً" بند ہو گئی تھی۔

لیکن آج امریکی سامراج تمام دنیا کی قسمتوں' خاص طور پر تیسری دنیا کی قسمت کا مالک بن گیا ہے۔ آج جبکہ تیسری دنیا کے پس ماندہ ممالک اپنے وسائل اور کچے مال پر اپنا کنٹرول قائم کرنے کی تگ و دو کر رہے ہیں' امریکی سامراج نے مشرق وسطیٰ کے تیل پر بلا شرکت غیرے بالا دستی حاصل کرنے کی سازشیں تیار کرنا شروع کر دی ہیں۔ کیونکہ باوجود تمام سائنسی ترقی اور نئی نئی ایجادات اور دریافتوں کے ابھی تک تیل سے سستا ایندھن دستیاب نہیں ہو سکا۔

آج تک اس قدر طاقتور ریاستوں کے گروہ نے جس کی فوجیں نہایت ہی بھیانک اور مہلک جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہوں' اس قدر چھوٹے علاقہ اور اس قدر تھوڑے وقت میں اتنے بہیمانہ طریقہ سے محض بڑے زمینی حملہ کے لئے میدان ہموار کرنے کے لئے بمباری نہیں کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آتش و آہن کی یہ بارش کویت کی چھوٹی سی خوشحال ریاست کو آزاد کرانے کے لئے کی گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عملی طور پر اس ظاہری اعلان کی آڑ میں عراقی ریاست کو نیست و نابود کرنے کی سازش کار فرما ہے۔ اور یہ اس قدر شیطانی اطمینان اور ظالمانہ طریقے سے کیا گیا ہے کہ انسانیت کی حفاظت کے تمام ارفع اور اعلیٰ اعلان انسانی آدرشوں اور نومولود بچوں کی لاشوں تلے دبے جا رہے ہیں۔

تقریباً تمام جدید ترین ذرائع ابلاغ سامراجیوں کی گرفت میں ہیں اور وہ شب و روز حقائق کو دھندلا رہے ہیں اور سامراج کی برتری کا ڈنکا بجا رہے ہیں اور ان کے حقیقی نصب العین اور عزائم کو چھپا رہے ہیں۔ اب تک دنیا بھر کے عوام کے جنگ کے خلاف مظاہرے

جنگ کی تیزی اور تندی میں نرمی پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں اور بغداد اور دوسرے شہروں کے پرامن شہریوں پر بمباری برابر جاری ہے۔ بلکہ ہر روز نہایت ہی ظالمانہ اعداد و شمار اور خوف ناک واقعات کو نئی خوشخبری اور وعظوں میں لپیٹ کر پیش کیا جا رہا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جنگ جس میں سامراجی طاقتیں اس قدر شد و مد سے حصہ لے رہی ہیں' کیوں ہو رہی ہے؟ کیا امن قائم رکھنے کے لئے گفت و شنید کے تمام ذرائع استعمال کر لئے گئے تھے؟ کیا امن کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں اور کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہا تھا؟

اعلان کیا جا رہا ہے کہ قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے لئے جنگ ناگزیر ہو چکی تھی اور جابر و ظالم صدام کے پنجوں سے ننھی سی ریاست کویت کی آزادی کو بحال کرنے کے لئے کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔

ہم کسی طور پر صدام حسین کے 2 اگست 1990ء کے اقدام کو درست قرار نہیں دے رہے لیکن اس مضمون میں ہم صدام کے اس اقدام کے جائز و ناجائز ہونے کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے کیونکہ حالات اس قدر تیزی سے بدل چکے ہیں کہ دنیا بالکل ایک نئی صورت حال سے دوچار ہے اور اس مسئلے کے کئی نئے نئے گوشے سامنے آ چکے ہیں لہٰذا ضروری ہو گیا ہے کہ ہم سنجیدگی سے غور کریں کہ واقعی سمندر پار سے آنے والے پولیس مین محض کویت، کی آزادی اور قانون کی حکومت کی پاسداری کے لئے مشرق وسطیٰ میں نازل ہوئے ہیں؟

اگر ایسا ہی ہے تو یہ بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ چند سال پہلے امریکہ نے ایک نہایت ہی کمزور اور چھوٹی سی ریاست گرنیڈا پر حملہ کر کے تلوار کی نوک پر اس کی جائز قانونی حکومت کا تختہ کیوں الٹ دیا تھا؟ اس وقت اقوام متحدہ کا ضمیر کیوں نہ جاگا اور اقوام متحدہ نے اس چھوٹی سی ریاست کی چیخ و پکار کیوں نہ سنی؟

یہ بھی بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے امریکہ نے پانامہ کی چھوٹی سی ریاست پر کیوں حملہ کیا اور پانامہ کے صدر کو ایک چوہے کی طرح پکڑ کر امریکی جیل میں کر بین الاقوامی قانون کے تحت بند کر دیا؟ حالانکہ اس صدر کو امریکی سی آئی اے کی مدد او اعانت حاصل تھی اور ایسی ہی امریکی ایجنسیوں نے اسے مضبوط اور توانا کیا تھا۔ قانون کی بالادستی اور آزادی کے تقدس کو اس قدر ظالمانہ طریقے سے پیروں تلے دن دیہاڑے کیوں

روند دیا گیا؟ اور اقوام متحدہ کا ضمیر کیوں اس واقعہ پر آنکھیں بند کئے ہوئے سویا رہا؟

یہ بھی بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ پچھلے چالیس سال سے اقوام متحدہ کی کشمیر میں استصواب رائے کی قرارداد کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا جا رہا؟ اور اس قدر طویل عرصہ تک طاق نسیاں میں کیوں رکھ دیا گیا ہے۔ اور اقوام متحدہ کا روشن ضمیر اس بارے میں کیوں جاگنے کا نام نہیں لیتا تھا؟

اور آخر میں یہ بھی بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ پچھلے چالیس برس سے فلسطینی ریاست کے علاقوں کو اسرائیل سے خالی کروانے کے متعلق قرار دادوں پر عمل کیوں نہیں کیا جا رہا؟ اور اسرائیل میں آزادی پسند فلسطینی نوجوانوں کو پچھلے تین سال سے گولیوں کی بوچھاڑ کرکے کیوں بھونا جا رہا ہے؟ اور اقوام متحدہ کا ضمیر اس ظلم و ستم پر کیوں آنسو نہیں بہاتا؟

یہ تو اب روز روشن کی طرح ظاہر ہو چکا ہے کہ قانون کی حکمرانی اور کویت کی آزادی محض ایک پردہ ہے جس کی آڑ لے کر امریکی سامراج ایک پوری قوم کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے سرگرم ہے۔

سوال یہ ہے کہ تمام پرامن طریقوں کو بروئے کار لائے بغیر جنگ کا راستہ اختیار کرنے کی وجوہات کیا ہیں؟ امریکی سامراج کا نصب العین اور عزائم کیا ہیں؟ عالمی ڈکٹیٹر۔ بش۔ نے کیوں ہر بار کویت کے مسئلے کو فلسطین کے سوال سے جوڑنے کی تجویز کو نہایت رعونت سے دھتکار دیا ہے اور اگر سوال صرف کویت کی آزادی کے حصول کا ہی تھا تو بش نے اقوام متحدہ کو فرانسیسی تجویز جسے سویت یونین اور فرانس کی بھی حمایت حاصل تھی کیوں نہ آزمانے دیا۔ تاکہ مشرق وسطیٰ کے تمام مسائل پرامن طریقے سے حل کئے جا سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سرد جنگ کے دوران جب امریکہ سوشلزم کے چھلاوے کو دنیا بھر میں چیلنج کر رہا تھا' دوسری جنگ عظیم کی شکست خوردہ جرمنی اور جاپان کی دو ریاستیں نئی نئی ایجادات کے ذریعے پرامن معاشی میدان میں ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھیں۔ وہ عوامی ضروریات کے لئے پیداوار بڑھا رہی تھی۔ وہ پیداوار کے تمام شعبوں ماسوائے جنگی ہتھیاروں کے امریکہ سے سبقت لے گئی تھیں۔ ان کی معیشت نہایت مضبوط اور توانا ہو چکی تھی اور وہ امریکی سامراج کو پیداوار کے میدان میں مات دے رہی تھی لیکن امریکہ کی تمام توجہ جنگی صنعت پر مرکوز تھی اور یہ دونوں ملک عوامی استعمال اور آسائشوں کے شعبوں میں بے پناہ

ترقی کر رہے تھے۔

جونہی سویت یونین میں گلاس ناسٹ اور پرایسٹرئیکا کی بالادستی سے جامد اور جابر نظام کی بیخ کنی کے بعد بڑی طاقتوں کے درمیان سرد جنگ ختم ہوئی' امریکی سامراج کے ہر چار سو پھیلے ہوئے فوجی نظام سے امریکی معیشت کا دم گھٹنے لگا' بنک دیوالیہ ہونے لگے۔ معیشت اندرونی اور بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے دبنے لگی۔ بے روزگاری نے محنت کشوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ سماجی خدمات میں کمی واقع ہونے لگی اور بجٹ میں خسارہ آسمان سے باتیں کرنے لگا حتیٰ کہ 318 بلین ڈالر کی خطیر رقم تک پہنچ گیا۔ امریکی حکومت کی تمام کوششیں اور جتن اس انحطاط کو نہ روک سکیں۔ ایک خوف ناک بحران کی آمد آمد نے دائمی ترقی کے نظریات کو پاش پاش کرنا شروع کر دیا اس روز بروز بڑھتے ہوئے معاشی بحران سے چھٹکارا حاصل کرنے میں دوستوں نے بھی امداد کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ جی اے ٹی ٹی GATT کی آخری میٹنگ نے یورپ کے دستکاروں کی سب سڈی ختم کرنے کی امریکی تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا۔

اس نئی صورت حال سے نپٹنے کے لئے امریکی اجارہ دار اور پینٹاگان میں ان کے نمائندے ایک عرصہ سے سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کر رہے تھے چنانچہ اس بہیمانہ جنگ کے پس پردہ امریکی اجارہ داروں اور پینٹاگان کا نصب العین محض کویت کو آزاد کرانا نہ تھا بلکہ ان کے عزائم مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا اور اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کو مجموعی طور پر کمزور کرنا اور عراق اور صدام حسین کو ختم کرنا تھے۔

لیکن اس کے باوجود بار بار یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ جنگ محض کویت کی آزادی کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ ان سرکاری اعلانوں کی وہ تلخ حقیقتیں مکمل طور پر نفی کرتی ہیں جو کہ کویت پر قبضہ کے بعد یکے بعد دیگرے آشکار ہوئی ہیں۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ پہلے نہ صرف صدام کو اکسایا گیا اور ایران پر حملہ کرنے کے لئے اس کی ہر طرح امداد کی گئی تاکہ امریکی سامراج کے مفادات کے خلاف خمینی انقلاب کے اثرات کو ضائع کیا جا سکے۔ کیونکہ خمینی انقلاب نے مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات پر کاری ضرب لگائی تھی۔ عراق ایران جنگ کے دوران نہ صرف امریکہ بلکہ سویت یونین اور جرمنی بھی صدام کی پیٹھ ٹھونکتے رہے اور اس کی مدد کرتے رہے۔ اس سارے عرصہ میں ان کے ضمیر نے ان کو ایران پر حملے کے سلسلے میں کبھی نہیں جھنجھوڑا اور کبھی انہوں نے ان اصولوں

کی بات نہیں کی جسے آج کل ڈکٹیٹر بش دنیا کے سامنے اپنے ظالمانہ اقدام کو درست قرار دینے کے لئے پیش کر رہا ہے۔ اس کے برعکس خود امریکہ نے اپنے جدید ترین ہتھیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو ایران کی حاکمیت کو پاؤں تلے روندتے ہوئے ایران میں داخل کر دیا۔ اس کی مہم جوئی بری طرح ناکام ہوئی اور وہ دنیا بھر میں بدنام ہو گیا اور آخر میں اپنے یرغمالیوں کو رہا کرانے کے لئے گفت و شنید کا ہی راستہ اختیار کرنا پڑا لیکن اس دفعہ امریکہ نے اپنے سابق ساتھی کو دھوکہ دے کر کویت پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا۔ کویت پر حملہ سے ایک ہفتہ پہلے صدام نے عراق میں امریکی سفیر سے ملاقات کی تو امریکی سفیر گلاسپی نے صدام حسین کو یقین دلایا کہ عربوں کے باہمی اختلافات میں' جیسے کہ عراق اور کویت کے درمیان ہیں امریکہ کسی قسم کی مداخلت کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ان مسائل سے امریکہ کا کوئی تعلق نہیں چنانچہ عراق اور کویت کے درمیان جھگڑے کو نپٹانے کی بجائے امریکہ نے عراق کو حملہ کے لئے اکسایا اس کے علاوہ امریکہ نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی کہ امریکہ چند مہینوں بعد خود کویت پر قبضہ کرنے والا ہے۔ صدام کی زیرک نگاہی اس سنہرے جال کو نہ دیکھ سکی اور وہ اپنے تمام تر تجربے کے باوجود اس دام میں پھنس گیا۔ عراق کے کویت پر حملے کے دو دن بعد ہی یعنی 4 اگست کو امریکی کمانڈو پاول نے مشورہ دیا کہ خلیج میں ہوائی بحری اور فوجوں کے ذریعے مداخلت ضروری ہے۔

20 فروری 1991ء کے فرنٹیر پوسٹ میں لکھتے ہوئے سید ادیب نے نیویارک ٹائمز 4 اگست 1990ء کے حوالے سے لکھا کہ امریکی فوج کو سعودی عرب میں داخل کرنے کے سلسلے میں کویت میں عراق کے داخل ہونے سے بہت پہلے منصوبہ بندی ہو چکی تھی۔ 10 اگست 1990ء کے نیویارک نیوز میں اس بات کا انکشاف بھی کیا کہ عراق نے رومالیہ کے تیل کے کنوؤں اور ایرانی خلیج تک رسائی کے عوض اپنی فوجیں واپس بلانے کی پیش کش کی تھی لیکن امریکہ نے یہ پیش کش فوجی کاروائی کرنے کے لئے ٹھکرا دی۔

امریکہ اس سے بہت پہلے اپنی فوجیں مشرق وسطیٰ میں داخل کر کے اپنے سٹریٹیجک مفادات کی حفاظت کے لئے منصوبے بنا رہا تھا لیکن سویت یونین اس کے راستے میں حائل تھا اس سلسلہ میں امریکہ نے بحر ہند میں ڈیگو گارشیا کا جزیرہ برطانیہ سے خرید لیا اور اپنی فوجیں وہاں پہنچا دیں وہاں 5 ایم پی سی 11 مال بردار جہازوں کا سکوارڈن موجود ہے اور کافی تعداد میں اسلحہ اور بارود سے لیس ہے جو 16400 سپاہیوں پر مشتمل ایک بریگیڈ کو لڑائی کے

تیس دن کی سپلائی کے لئے کافی ہے۔

ایک عرصہ سے یہ افواہیں عام ہیں کہ امریکہ بلوچستان کی ساحلی پٹی پر اپنے اڈے بنانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ ان تمام بحری راستوں پر امریکہ کا کنٹرول پکا ہو جائے جو مشرق وسطیٰ کے تیل کو غیر ممالک میں لئے جانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ چند روز پہلے بلوچستان کے جمہوریت پسند راہنماؤں نے اپنے ایک بیان میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ بلوچستان میں امریکہ نے اپنے اڈے قائم رکھے ہیں اور ان اڈوں میں پاکستانیوں کو جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ مشرق وسطیٰ کی موجودہ لڑائی میں ڈیگو گارشیا اور بلوچستان میں امریکی اڈے امریکی فوجوں کے لئے بہت مفید ثابت ہو رہے ہیں کیونکہ وہ مشرق وسطیٰ کے قریب ترین امریکی اڈے ہیں جہاں سے ہر قسم کا فوجی ساز و سامان عراق پر آتش و آہن کی بارش کرنے والی فوجوں کو سپلائی کیا جا رہا ہے۔

امریکی سامراج کا سب سے بڑا مقصد دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر پر بالا دستی حاصل کرنا ہے جو مشرق وسطیٰ میں موجود ہیں۔ امریکہ چاہتا ہے کہ تیل کی قیمتیں مقرر کرنے کا اختیار اسے حاصل ہو اور تیل کس قدر مقدار میں نکالا جانا چاہئے بھی اس کی صوابدید کے مطابق ہو۔ تیل پر بالا دستی حاصل کرنے سے وہ تمام ترقی پذیر ملکوں کی تقدیر کا مالک بن جائے گا۔

تیل کے ان ذخائر پر قبضہ کرنے کا دوسرا بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ جرمنی اور جاپان کو بھی اپنا دست نگر کر سکے گا۔ جو اپنی روز افزوں پیداواری صلاحیتوں کی وجہ سے دنیا بھر میں معاشی میدان میں امریکی بالا دستی کو چیلنج کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یورپ کے باقی ملکوں کے سیاسی اور معاشی فیصلوں پر بھی اثر انداز ہو سکے گا۔

اس کا تیسرا بڑا مقصد مشرقی یورپ اور سویت یونین کی ٹیکنالوجی کی وسیع منڈی پر بھی غلبہ حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ وہ دوسری جگہوں پر جرمنی اور جاپان سے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتا۔

اس کا چوتھا مقصد دنیا بھر کے سامنے اپنے جدید اور مہلک ہتھیاروں کی دھاک بٹھانے کے لئے نمائش کرنا ہے۔ دنیا پہلے ہی چھ ہفتوں کی جنگ کی ہولناکیوں سے انگشت بدنداں ہے۔

اس کے علاوہ اسے تیسری دنیا کے ایک ملک عراق کے مظلوم عوام اپنے نئے ہتھیاروں

کے ٹیسٹ کرنے اور آزمانے کے لئے میسر آ گئے ہیں۔

غرضیکہ امریکی سامراج اکیسویں صدی کے دوران دنیا بھر میں بلا شرکت غیرے اپنی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں عراق کی فوجی طاقت امریکی سامراج کے ان عزائم اور منصوبوں کے راستے میں حائل تھی۔ اس جنگ سے بہت پہلے امریکی شہ اور رضا مندی سے اسرائیل نے بلا کسی وجہ کے عراقی ایٹمی کارخانہ کو تباہ کرنے کے لئے حملہ کیا تھا۔ سب دنیا کو ابھی تک یہ واقعہ یاد ہے۔ لیکن بڑے بڑے اصولوں کے علمبرداروں نے اس ننگی جارحیت پر انگلی تک نہیں اٹھائی تھی اور نہ ہی اقوام متحدہ کا ضمیر جاگا تھا۔

کویت پر امریکی فوجوں کے حملہ کے دو گھنٹوں بعد ڈکٹیٹر بش نے امریکی ٹیلی ویژن پر تقریر نشر کی جو کئی ہفتہ سے لکھی جا رہی تھی۔ اس نے کہا کہ امریکہ کا مقصد عراق کو فتح کرنا نہیں بلکہ صرف کویت کو آزاد کرانا ہے۔ لیکن تقریر کے دوران بش نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ عراق دشمن اتحاد عراق کی فوجی مشینری کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ وہ اپنے ہمسایوں کے لئے خطرہ نہ رہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مصمم ارادہ ہے کہ صدر صدام حسین کی ایٹمی قوت کو بالکل تہس نہس کر دیا جائے اور ہم اس کے کیمیائی ہتھیاروں کی صلاحیتوں کو بھی ختم کر دیں گے (ٹائم 17 جنوری 1991ء)

یہ حقیقت عیاں ہے کہ کویت کی آزادی کے نام پر امریکی فوجیں کویت پر حملہ کرنے کی بجائے عراق کو مشرق وسطیٰ کے نقشہ سے مٹانے کی حکمت عملی اختیار کئے ہوئے ہیں اور وہ صدام حسین اور عراق کی فوجی طاقت اور کارخانوں کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ قانون کی حکمرانی کی آڑ میں وہ بین الاقوامی قانون کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بش عراق کی فوجی صلاحیتوں اور طاقت کو ختم کرنے کے کیوں درپے ہے؟ وجہ یہ ہے کہ عراق اسرائیل کے لئے سخت خطرہ بنا ہوا ہے اور اسرائیل سامراجی اجارہ داروں کا پالتو گماشتہ ہے اور ان کے مفادات کا محافظ ہے اور مشرق وسطیٰ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو دبانے کا ذریعہ ہے۔ بش کو اسرائیل کی ایٹمی قوت سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور نہ اسے اسرائیل کی فوجی طاقت اور صلاحیتوں سے کوئی خطرہ ہے۔ بش کا ضمیر اسے اس بات پر ملامت نہیں کرتا کہ اسرائیل نے فلسطینی ریاست کو وجود میں ہی آنے نہیں دیا اور فلسطینی علاقوں پر بزور شمشیر قابض ہو گیا ہے اور پچھلے چالیس سال سے فلسطینیوں کو دنیا بھر میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا ہے اور ناحق ان کا خون بہا

رہا ہے اور اقوام متحدہ کی متعدد قراردادوں کے باوجود وہ فلسطینی علاقوں کو خالی کرنے پر تیار نہیں ہے۔ حقیقت یہ کہ اسرائیل کثیرالاقوامی اجارہ دار امریکی کمپنیوں اور پینٹاگان کی چوکی ہے جس کے ذمے کام یہ ہے کہ وہ عالمی سرمایہ داروں کے مشرق وسطیٰ میں مفادات کی حفاظت کرے۔ اس لئے اسرائیل کو مضبوط کرنا سامراجی اجارہ داروں کے لئے ضروری ہے اور اس کے مد مقابل طاقت کو کمزور کرنا ان کے لئے سود مند ہے۔ اگر آج عراق پر حملہ کر کے اسے نیست و نابود کیا جا رہا ہے تو کل کو ایران کی باری آ سکتی ہے اور پھر پاکستان بھی اس پالیسی کی زد میں آ سکتا ہے۔ کیونکہ پاکستان بھی اسی علاقہ میں جدید تربیت یافتہ فوج رکھتا ہے اور ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کر رہا ہے۔ بارہا یقین دہانیوں کے باوجود کہ پاکستان ایٹمی صلاحیت صرف پرامن مقصد کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے' امریکی سامراج ماننے کو تیار نہیں ہے بلکہ کئی بار امریکہ اس بارے میں پاکستانی کی کلائی مروڑ چکا ہے۔ اس نے امداد اور قرضے بند کئے ہیں یا التوا میں ڈالے ہیں اور پاکستان کو ہر طرح ذلیل و خوار کیا ہے۔ اس نے باہمی معاہدوں کا کبھی پاس نہیں کیا۔ اسرائیل نے بھی کئی بار کہوٹہ کو تباہ کرنے کے لئے پاکستان کو دھمکیاں دی ہیں اور کئی بار سازشیں کی ہیں۔ اس وقت بنیاد پرست' انقلابی اور جمہوریت پسند سبھی گروہ زور شور سے امریکی سامراج کی مخالفت کر رہے ہیں اور جائز طور پر ہر سینے میں امریکی سامراج کے خلاف نفرت ابل رہی ہے۔ جنگ کی ابتدا ہی سے امریکی حکومت نے پاکستان سے اپنے تمام شہریوں اور ملازمین کو واپس بلا لیا ہے۔ حتیٰ کہ امریکی اساتذہ کو بھی پاکستان چھوڑنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔

خلیج کی جنگ کا نتیجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ایک بات بالکل صاف ہے کہ اسلامی دنیا کے حکمران طبقوں کے اوپری حصوں کو چھوڑ کر تمام عوام امریکی سامراج کے خلاف جدوجہد کا راستہ اختیار کریں گے۔ امریکی سامراج صرف ان کی بنیادی دولت کو ہی نہیں لوٹتا بلکہ وہ اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ان کی ثقافت اور مذہب کو بھی ملیا میٹ کرنے پر تلا ہوا ہے۔

یوں تو خلیجی جنگ اقوام متحدہ کے نام پر اس کے جھنڈے تلے لڑی جا رہی ہے۔ لیکن نہ تو اقوام متحدہ اور نہ ہی سلامتی کونسل کی کوئی ایسی میٹنگ ہوئی ہے جس میں یہ فیصلہ کیا گیا ہو کہ اس جنگ کی کمان کس کے ہاتھ میں ہو گی اور اس کی حکمت عملی کیا ہو گی۔ بلکہ عالمی ڈکٹیٹر بش نے خود ہی اکیلے جنگ چھیڑنے کا وقت مقرر کر دیا اور خود ہی اس کی حکمت عملی

تیار کر لی۔ جنگ چھیڑتے وقت اس ظالمانہ اقدام کو قابل قبول بنانے کے لئے اسے نہایت خوبصورت الفاظ میں لپیٹ کر پیش کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ یہ جنگ قانون کی حکمرانی کی بالادستی کے لئے لڑی جا رہی ہے اور اس کے بعد دنیا میں ایک نیا عالمی نظام قائم کر دیا جائے گا۔

یہ پہلی بار نہیں ہے کہ رہزن اور لٹیرے نیا عالمی نظام قائم کرنے کا اعلان کر رہے ہیں۔ آج سے پانچ سو سال پہلے ان کے آباؤ اجداد نے پھرتے پھراتے ایک نئی دنیا دریافت کر لی۔ لیکن ان کی یہ نئی دنیا وہاں کے اصلی باشندوں کے لئے ان کی پرانی دنیا تھی۔ انہوں نے ان اصلی باشندوں کو ریڈ انڈین کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ جو ایک پرانی تہذیب کے امین تھے۔ اور پس ماندگی اور اوہام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے ہتھیار تیر کمان اور برچھی نئے آنے والوں کے جدید ہتھیاروں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ ترقی یافتہ نئے آنے والوں نے پرانے باشندوں کی اس پرانی دنیا میں نیا نظام زندگی قائم کرنا شروع کر دیا اور انہیں مار مار کر گھنے جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ ان کا جنگلی جانوروں کی طرح شکار کیا گیا۔ ہر نیا شکار نئے نظام کے قیام کی طرف ایک کامیاب قدم سمجھا جاتا تھا۔ اس نئی دنیا کے حقیقی باشندے اپنے ہی ملک میں اجنبی بنا دیئے گئے اور جب یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تو انہوں نے سمندر پار کر کے ایک دوسرے براعظم کے مغربی کنارے پر یلغار کر دی اور اس کا نام انہوں نے تاریک براعظم رکھ دیا اور اس تاریک براعظم کے پرامن باشندوں کا بھی جنگلی جانوروں کی طرح شکار کرنا شروع کر دیا اور تقریباً ایک کروڑ باشندوں کا شکار کیا۔ ان میں سے آدھے شکار کے دوران اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے سمندری سفر کے دوران لقمہ اجل بن گئے اور جو باقی بچے وہ ڈھور ڈنگروں کی طرح کھلی منڈیوں میں بیچ دیئے گئے۔ انہیں طوق غلامی پہنا دیئے گئے۔ ان غلاموں کی محنت شاقہ سے جنگلوں کو صاف بنا دیا گیا۔ فصلیں اگائی گئیں۔ معدنیات نکالی گئیں۔ شہر آباد کئے گئے۔ اور اس امریکہ کی بنیاد رکھی جسے آج ہم دیکھ کر مبہوت ہوئے جا رہے ہیں لیکن جب دو عظیم امریکیوں نے آزادی کا اعلان نامہ لکھا اور اس کے روح پرور الفاظ' سب انسان پیدائشی طور پر برابر ہوتے ہیں' رقم کئے گئے تو ان کا اطلاق ان سیاہ فام حبشیوں اور ریڈ انڈینز پر نہ کیا گیا کیونکہ انہیں انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ اعلان نامہ لکھنے والے خود آٹھ آٹھ نو نو ہزار غلاموں کے آقا تھے۔ چنانچہ یہ نیا عالمی نظام ان کے لئے نہ تھا جن کے لئے ظاہری طور پر رقم کیا گیا تھا۔

کچھ عرصہ ہوا میں نے کینیڈا میں ریڈ انڈینز کے لئے ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے

سلسلہ میں ایک نہایت ہی دلچسپ مضمون پڑھا۔ اس یونیورسٹی کے افتتاحی اجلاس کی صدارت ایک ریڈ انڈین کر رہا تھا جو کسی نہ کسی طرح محنت مشقت کر کے پڑھ لکھ گیا تھا۔ کینیڈا کی حکومت کے نمائندوں نے نہایت ہی خوبصورت اور حسین الفاظ میں ریڈ انڈینز کو کینیڈا کی حکومت کی طرف سے اس نئی یونیورسٹی کو تحفے کے طور پر پیش کیا اور انہیں مبارک باد دی۔ صدارتی خطبہ دیتے وقت صدر نے نہایت ہی سیدھے سادھے الفاظ میں کہا "جب میں چھوٹا تھا تو میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ ان کھلے مرغزاروں اور جنگلوں میں مویشی چرایا کرتا تھا۔ یہ سب زمین تاحد نظر ہماری تھی اور کسی دوسرے کا اس پر حق نہیں تھا۔ میں حیران ہوں کہ آج ہماری ہی زمین ہمیں کمال مہربانی کے ساتھ تحفے کے طور پر دی جا رہی ہے۔"

چنانچہ آج بھی وہی ڈرامہ وہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن نہایت اونچی سطح پر۔ تاریخ دائروں میں ترقی کرتی ہے۔ ہر دائرہ پہلے سے بڑا ہوتا ہے۔

کچھ سادہ لوح لوگ کہیں گے ان باتوں کو بھول جاؤ۔ یہ سب زمانہ جاہلیت کی ظلم بھری داستانیں ہیں۔ ان سیاہ ادوار کی خونیں داستانوں کو دہرانے سے کیا فائدہ۔ آج کی رنگا رنگ دنیا پر نگاہ ڈالو۔ انسان نے کس قدر خوبصورت چیزیں پیدا کی ہیں۔ یہ ساری زندگی انسان کے لئے تراشی گئی ہے۔ کیا ہوا اگر اس کی بنیادیں ٹوٹے ہوئے انسانی اعضاؤں اور مقتولوں کی آہ و بکار رکھی گئی ہیں۔ لیکن یہ انسان کے لئے بنائی گئی ہیں۔ انسان کو ان سے حظ اٹھانا چاہئے اور اس زندگی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونا چاہئے۔

میں ان خیالوں میں غرق تھا کہ ٹیلی ویژن پر شہر بصرہ کی فلم دکھائی جانے لگی۔ بصرہ جو انسانی تاریخ کی حسین داستانوں کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔ ننھے منھے بچوں کی لاشیں موت کی آغوش میں خوبصورت لیکن تباہ و برباد گھروں میں قطار اندر قطار پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے معصوم چہروں پر خون کی لکیریں تھیں۔ یہ عظیم ترین تہذیب کے علمبرداروں کی کاربٹ بمباری کا شکار ہوئے تھے۔ یہ بصرہ کے معصوم بچے تھے جو بن کھلے مرجھا گئے تھے اور پھر سین بدل گیا۔ اب واشنگٹن کی تصویر سامنے تھی۔ سکرین پر ایک ظالم' بدصورت انسان بے جان ادھ موئے الفاظ بول تھا۔ "ہمارا نصب العین کویت کی آزادی ہے اور دنیا میں امن قائم کرنا ہے۔ اور ایک نیا عالم نظام قائم کرنا ہے" بولنے والا شخص نہایت ہی تہذیب یافتہ ملک کا صدر تھا۔ نئی دنیا کا صدر جو ریڈ انڈینز کی پرانی دنیا تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ کیوں بار بار میرے خیالات خونیں ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

انسان صدیوں سے آزادی، مساوات اور نئے نظام زندگی کے لئے بار بار ذبح کیا گیا ہے۔ تباہ و برباد کیا گیا ہے۔ وہ خوبصورت اور حسین دنیا کب وجود میں آئے گی جس کے لئے انسان کو صدیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا رہا ہے۔ اسے ارفع اصولوں کے حصول کے لئے روم کی شاہراہوں پر درختوں کے ساتھ زندہ لٹکا دیا گیا کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ پھر اسے پانی سے محروم کر دیا گیا اور اس کے سوکھے ہونٹوں کو مسخ کر دیا گیا اور اس کے جسم کو زہریلے تیروں سے چھلنی کر دیا گیا۔ حملہ آور رسولؐ کے قریبی ساتھی تھے اور شہادت پانے والے وہ تھے جو کبھی رسولؐ کی چھاتی پر کھیلتے تھے۔ لاکھوں کروڑوں انسان مرد عورتیں اور بچے دو عالمی جنگوں میں اسی ارفع نصب العین کی بھینٹ چڑھ گئے اور ناگا ساکی اور ہیرو شیما کے ہنستے بستے گھر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ اور وہ لوگ جن کے آباؤ اجداد نازی کیمپوں میں گیس چمبروں میں بھسم کر دیئے گئے آج دوسرے لوگوں کا جینے کا حق چھین کر پینتاگان اور کثیر الاقوامی اجارہ داریوں کے اشاروں پر ان کی زندگی اجیرن بنائے ہوئے ہیں اور وہ انسانی نسل کو دبانے اور ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود انسان امید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ نیکی اور محبت اور حسن سے انسان والہانہ پیار اور لگن رکھتا ہے۔ اسے درد اور بدصورتی اور بدی سے نفرت ہے۔ ان شیطانی قوتوں کو زیر کرنے کے لئے ایک زبردست جدوجہد جاری ہے۔ پچھلے تیس سالوں میں انسان نے قدرت کی بے شمار چھپی ہوئی حقیقتوں کو سر کر لیا ہے جنہیں پچھلے تین ہزار سال کی تہذیب بھی دریافت نہیں کر سکی تھی۔ چنانچہ جنگ، ماحول کی آلودگی، روز بروز کم ہوتے ہوئے وسائل، روز افزوں آبادی، قومی اور نسلی اور انفرادی نفرتوں پر کسی نہ کسی دن انسان غلبہ حاصل کر لے گا۔ اس کے متعلق کوئی شک نہیں ہے لیکن اس ارفع اور اعلیٰ نصب العین تک پہنچنے کے لئے انسان کو ابھی خار دار وادیاں عبور کرنا ہوں گی اور طویل سفر کرنا ہو گا۔

یہ نظریہ کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور اسی قسم کے دوسرے مہلک ہتھیاروں کی دریافت سے دنیا کی دو کیمپوں کی پرانی تقسیم ختم ہو گئی ہے اور اب صرف ایک ہی کیمپ رہ گیا ہے اور وہ کیمپ ہے انسان! آج دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی امین سر زمین روزانہ لاکھوں بموں کی آگ اور آہن کی بارش تلے پڑی کراہ رہی ہے۔ اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں ایٹم بم لئے اور دوسرے ہاتھ میں امن کی بشارت لئے تلوار اور بائبل کی پرانی

کہانی کو ایک بار پھر دہرایا جا رہا ہے اور صحراؤں کو انسانی خون سے سرخ کیا جا رہا ہے جنہوں نے انسانی تاریخ کے بڑے بڑے مدبرین اور عالموں کو جنم دیا' جنہوں نے سماجی سائنسوں میں ترقی کے لئے بے مثال کردار ادا کیا۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ اب قوموں اور ریاستوں کی تمام تر جدوجہد صرف اور صرف انسان کی بہتری پر ہی مرکوز رہے گی۔ لیکن امن اور انسانیت کے پرستاروں کو نہایت ہی مایوسی ہوئی ہے کہ یہ نظریہ مشرق وسطیٰ کی تلخ حقیقتوں سے پہلی بار ہی ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہے۔ زیر زمین کالے سونے کے ذخائر پر بالادستی حاصل کرنے کی تگ و دو نے روز محشر سے قبل ہی عراقی سرزمین کو جہنم زار بنا دیا ہے۔ سویت یونین جو کبھی امن کا سب سے بڑا پرچارک تھا' نہ صرف یہ کہ جنگ کو بند کرنے والی روحوں کو مسخر کرنے والی آواز نہیں دے رہا بلکہ وہ جنگ بندی کے لئے سلامتی کونسل کی میٹنگ بلانے کو بھی تیار نہیں اور جب اس کے امن منصوبوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا جاتا ہے تو وہ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ کو جنگ کے دوزخ میں دھکیلنے والی طاقتوں کا چھوٹا حصہ دار بن گیا ہے۔ امریکی سامراج کے شیطانی اقدامات جو عراق میں لاکھوں پرامن شہریوں' عورتوں اور بچوں کو نیست و نابود کر رہے ہیں' اسے وہ شخص نہایت ہی اطمینان سے دیکھ رہا ہے جسے ابھی کل ہی نوبل انعام ملا ہے۔ یقیناً یہ ان قوتوں کے لئے نہایت ہی شرمناک ہے جنہوں نے اپنے پرانے نظام زندگی کو یہ کہہ کر تہس نہس کر دیا کہ یہ اقدام دنیا میں امن اور خوشحالی کے دور کو جنم دے گا۔ وہ نظام اپنی تمام تر کمزوریوں اور ناکامیوں کے باوجود اس قدر بڑے پیمانے پر جنگ چھڑنے کے راستے میں حائل تھا۔ سویت یونین کے اندر جاری جدوجہد کی بدولت ہی شیورنانڑے کو استعفیٰ دینا پڑا جس کی وجہ سے آج دنیا سویت فوجوں کو سامراجی فوجوں کے شانہ بشانہ عراق کے خلاف لڑتے ہوئے نہیں دیکھ رہی۔ جو بے گناہ اور معصوم لوگوں کو نیست و نابود کر رہی ہیں اور ایک پرانی تہذیب کو صفحہ ہستی سے مٹا رہی ہیں۔ حتیٰ اسلامی دنیا کے مقدس مقامات کو بھی زمین بوس کر رہی ہے۔

کیا یہ مقامی جنگ ہے' کیا یہ علاقائی جنگ ہے؟ نہیں جب 28 قومیں جدید خوفناک ہتھیاروں سے لیس ہو کر ایک چھوٹی ریاست کے خلاف برسرپیکار ہیں تو اسے مقامی یا علاقائی جنگ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ پہلے ہی تمام دنیا کو فوجی' سیاسی' معاشی اور ذہنی طور پر اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ جنہوں نے اس جنگ کو چھیڑا اور جنہیں اپنے ناقابل شکست ہونے کا یقین

تھا کیونکہ ان کی فوجیں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تھیں اور دنیا بھر کی ریاستوں کی بڑی اکثریت ان کے ساتھ تھی اور انہوں نے جلد بازی میں جنگ کے اکھاڑے میں چھلانگ لگا دی' ان کا خیال تھا کہ جنگ ہفتہ دو ہفتہ میں ختم ہو جائے گی۔ لیکن اب ان کے سامنے "قانون کی حکمرانی اور چھوٹی ریاستوں کی آزادی" کو محفوظ کرنے کے لئے ایک ریاست کی تمام آبادی کو تہس نہس کرنے کے علاوہ کوئی راستہ رہا ہی نہیں۔ امریکی سامراج اور برطانیہ کے ان شیطانی کارناموں نے اتحادیوں کے فوجیوں کے ضمیروں کو بھی جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ اور فرانس کے وزیر دفاع' ترکی کی فوجوں کے سربراہ اور اٹلی کے بحری ایڈ مرل نے جلد بازی میں خلیج میں جنگ چھیڑنے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا ہے۔

سویت یونین کے اندر آج کل ان طاقتوں جو سرمایہ داری نظام کے اندر امریکی سامراج کی رہنمائی میں بطور چھوٹے حصہ دار کے شامل ہونا چاہتی ہیں اور ان طاقتوں کے درمیان جو ماضی میں سوشلسٹ نظام کے بھیانک' جابرانہ اور جامد نقوش کو مٹا کر حقیقتی سوشلسٹ جمہوری نظام قائم کرنے کی خواہاں ہیں زبردست جدوجہد جاری ہے۔ اس جدوجہد کے نتیجے پر دنیا کے مستقبل کا انحصار ہے۔

اگر اول الذکر طاقتیں جیت جاتی ہیں اور سویت یونین عالمی سرمایہ داری نظام کا حصہ بن جاتا ہے جیسا کہ بش چاہتا ہے تو یہ دنیا بھر کے ترقی پذیر' پس ماندہ ممالک کے لئے مہلک ثابت ہو گا۔ کم از کم چند سالوں کے لئے امریکہ تمام روئے زمین پر سیاہ سفید کا مالک بن کر من مانے طریقے سے حکمرانی کرے گا اور وہ تمام ملکوں کی سیاست اور معیشت پر بالادستی حاصل کر لے گا۔ اور عالمی کثیرالاقوامی اجارہ داریوں کے مفادات کو آگے بڑھائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جرمنی اور جاپان معاشی طور پر بہت ہی مضبوط اور توانا ہو چکے ہیں اور ان کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک بھی امریکہ کے شکنجے سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لئے تگ و دو کر رہے ہیں۔ لیکن اگر مشرق وسطیٰ کے تیل کے وسائل جو دنیا کے تیل کے وسائل کا دو تہائی ہیں' پر امریکہ کی بالادستی قائم ہو گئی تو یہ ممالک بھی اس کی کاسہ لیسی پر مجبور ہو جائیں گے۔ گو وہ براہ راست عراق کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لے رہے ہیں لیکن پھر بھی وہ مشرق وسطیٰ کی جنگ کے اخراجات کے لئے اربوں ڈالر امریکہ کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اسرائیل کے نقصانات کا ازالہ کرنے کے لئے بھی اسے اربوں

ڈالر سے نواز رہے ہیں۔

تین فروری 1991ء کے نوائے وقت میں بش کے نئے عالمی نظام کا ہلکا سا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ امریکہ نئے عالمی نظام کا نقشہ تیار کر رہا ہے جس کے چیدہ چیدہ خدوخال یہ ہوں گے (1) عراق کی شکست کے بعد اسے چار حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور اسے دوسرے ملکوں جن میں شام' اردن اور ایران شامل ہیں' میں مدغم کر دیا جائے گا۔ (سعودی عرب' مصر اور ترکی کو جان بوجھ کر ان ممالک میں فی الحال شامل نہیں کیا گیا۔ (2) ہوائی اور بحری فوجیں مستقل طور پر مشرق وسطیٰ میں رکھی جائیں گی۔ (بری فوجیں بھی کافی عرصہ تک سعودی عرب اور عراق کویت کو نہیں چھوڑیں گی) (3) معاشی' دفاعی اور ہتھیاروں کے کنٹرول کی پالیسیاں اسرائیل اور فلسطین کے جھگڑے کو مدنظر رکھ کر مرتب کی جائیں گی۔ فوجی سلامتی کے مشیر رابرٹ گیٹ اسی سلسلہ میں محکمہ خارجہ اور محکمہ دفاع کی مدد سے ایک فارمولا تیار کر رہے ہیں اور ڈکٹیٹر بش نے امریکی سپاہیوں کے خاندانوں سے گفتگو کرتے ہوئے نہایت ہی رعونت اور گھمنڈ سے کہا کہ عراق کی شکست ساری دنیا کے لئے عبرتناک ہو گی اور ان کے لئے ایک سبق ہو گا کہ آئندہ کوئی طاقت امریکہ کے ساتھ جنگ مول نہ لے۔ امریکی سامراج کے نظریہ کے مطابق اس کے مفادات تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان مفادات کی حفاظت کے لئے وہ ساری دنیا میں سینکڑوں فوجی اڈے قائم کئے ہوئے ہے جن میں فوجی ساز و سامان' بیشمار ایٹم بم اور دوسرے مہلک ہتھیار موجود ہیں۔

برطانیہ کے سیکرٹری خارجہ مسٹر گلس ہرٹ جو کہ نہایت ہی شاطر اور تجربہ کار سامراجی ملک کا نمائندہ ہے' نے بھی مشرق وسطیٰ کی سلامتی کے لئے ایک منصوبہ پیش کیا ہے جس کے مطابق اس نے پاکستان' مصر' ترکی اور شام کی ایسوسی ایشن بنانے کی تجویز پیش کی ہے اور اس طرح خلیج کی سلامتی کی تجویز کا اشارہ کیا ہے۔ اس نے مزید تجویز کیا ہے کہ مغربی طاقتوں کو بحری فوجیں رکھنے کی سہولتیں دی جائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامراجی طاقتیں اپنی لوٹ مار اور استحصال کو جاری رکھنے کے لئے پس ماندہ ممالک کے سینوں پر سوار ہونا چاہتی ہیں۔ تاکہ وہ ان کے وسائل کو اپنی گرفت میں لے سکیں' نئے حالات میں کسی نئے سنٹو معاہدے کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔

پچھلے تیس سال سے امریکہ مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر پر براہ راست بالادستی قائم کرنے کی منصوبہ بندی کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ یہ مغربی دنیا کی صنعتوں کی رگوں میں دوڑنے

والا خون ہے۔ جس کسی نے بھی امریکہ کے اس نظریہ کو چیلنج کیا اسے امریکہ نے طاقت سے دبا دیا ہے۔ بیسویں صدی کے امن اور انسانی حقوق کے اس علمبردار نے قذافی کو قتل کرنے سے بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور اس پر حملہ کر دیا جس میں اس کی لے پالک بچی مر گئی۔ جب بھی امریکہ کو موقع ملا فوراً" اس کے بحری دستے مشرق وسطیٰ کے ساحلوں پر آ براجمان ہوئے۔ ایران عراق جنگ کے دوران یہ بحری دستے لبنان کے ساحل پر اتر گئے لیکن ان کی ایسی درگت بنی اور ایسا نقصان پہنچا کہ امریکی عوام کے دباؤ کے تحت انہیں فوراً" واپس بلانا پڑا۔ اب جبکہ اسے اقوام متحدہ کی اجازت حاصل ہے اور اس بات میں گوربا چوف کا سویت یونین بھی اس کا ہمنوا ہے' وہ تمام عوامی مخالفت کے باوجود اپنی فوجیں خلیج کے علاقے میں رکھنے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ننگ وطن گلے سڑے نظام کے علمبردار بادشاہ اور شیوخ اور مصر اور شام اور ترکی جیسے بکاؤ ملک' جنہوں نے اپنے سابق قرضے معاف کروانے' نئے قرضے حاصل کرنے اور عراق کے حصے بخرے کر کے اس کے علاقے ہتھیانے کے لالچ میں امریکی مفادات کی حفاظت کے لئے موجود ہوں گے۔ یہ تمام تجویزیں عراق اور صدام کی عنقریب ہونے والی شکست کے مفروضوں پر بنائی جا رہی ہیں جو ان کے حالات کے مطابق زبردست' مہلک اور جدید ہتھیاروں کی برتری کی وجہ سے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ اتحادی فوجیں' بحری اور ہوائی ہتھیاروں میں بہت زیادہ برتری کی مالک ہیں۔

لیکن دوسری طرف امن اور جنگ سے پاک دنیا اور زندگی کی حفاظت اور موت کے خاتمے اور بربریت اور باہمی جنگ و جدل سے پاک خوبصورت اور حسین زندگی کے لئے عوامی تحریک کا ریلا برابر بڑھتا پھیلتا جا رہا ہے۔ اگرچہ وہ اس وقت تک ان اشخاص پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکا جن کے ہاتھوں میں تمام سائنسی ایجادیں اور خوفناک ہتھیار موجود ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہے اور وہ جو کہ آج برسر اقتدار ہیں اور نہایت ہی سفاکانہ اور بہیمانہ طریقے سے عوام کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں' انہیں عوام ان ابابیلوں کی طرح شکست دے دیں جنہوں نے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ابراہا کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔

شائد انہیں حالات سے متاثر ہو کر ولیم پغاف نے بش کے نئے عالمی نظام کو نئی عالمی بدنظمی قرار دیا ہے۔

نوٹ : اس پمفلٹ کی کتابت ہو چکی تھی کہ خبر آئی کہ صدام حسین نے کویت سے فوجیں نکال لی ہیں۔ اس نئی صورت حال کے پیش نظر گوربا چوف نے اور متعدد دوسرے ملکوں نے مطالبہ کیا ہے کہ جنگ فوراً بند کی جائے۔ لیکن ڈکٹیٹر بش نے نہایت ہی رعونت آمیز لہجے میں جنگ بند کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ صدر صدام حسین کو ختم کرنے اور اس کی فوج کو تہس نہس کرنے اور عراق کے حصے بخرے کرنے کے لئے جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور برطانیہ اور فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں نے امریکہ کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔

ان حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ ڈکٹیٹر بش کا اصل نصب العین کویت کو آزاد کروانا نہیں تھا بلکہ عراق کو مکمل طور پر شکست دے کر اسرائیل کو مضبوط کرنا اور تیل کے وسائل پر قبضہ کرنا تھا۔

گو گوربا چوف نے جنگ نہ کرنے کی اپیل کی ہے لیکن گوربا چوف اور چین نے سلامتی کونسل کی سب قراردادوں کو منظور کرنے کا صدام سے مطالبہ کیا ہے جو اس نے منظور کر لیا ہے لیکن اس کے باوجود بش عراقی مقبوضہ علاقے کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ بش کو علم ہے کہ گوربا چوف اپنے اندرونی مسائل میں اس قدر الجھا ہوا ہے اور دنیا میں قرضوں کے حصول کے لئے کشکول لئے پھر رہا ہے۔ اس لئے وہ محض زبانی اپیلیں ہی کر سکتا ہے۔ اس جنگ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ امریکی سامراج اور اس کے ٹولی وال برطانیہ اور فرانس اب عالمی سطح پر کرائے کے غنڈوں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اور عرب ممالک کے بادشاہ اور شیوخ تیل کے قدرتی وسائل کو اپنے گلے سڑے رجعت پسند نظام کو قائم رکھنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے ہیں۔ اور اس جنگ کا سارا خرچہ اٹھا رہے ہیں۔ عرب ممالک کے ان حکمرانوں کی مدد سے امریکہ عالمی چوکیداری کے فرائض انجام دے کر ترقی پذیر ممالک کے عوام کو ان کی دولت سے محروم کرتا رہے گا اور چند سالوں تک بلا شرکت غیرے عالمی ڈکٹیٹر کا کردار ادا کرے گا۔

لیکن اس کی یہ پالیسی دنیا بھر کے عوام کو اس کے خلاف صف آراء کر دے گی اور اسے شکست دے گی۔

"نیا عالمی نظام اور اوکلے کی وضاحتیں"

حال ہی میں امریکی سفیر رابرٹ اوکلے نے "نیا عالمی نظام---- افسانہ اور حقیقت" کے عنوان سے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل آفیئرز سے خطاب کرتے ہوئے کہا "ساری دنیا ایک وعدہ کی پابند ہو گی جو بڑی اور چھوٹی اقوام کے درمیان ہو گا- وہ چند اصولوں کی پابندی کریں گی- بین الاقوامی تنازعات کو پرامن طور پر حل کریں گی- جارحیت کے خلاف یک جہتی کا مظاہرہ کریں گی- فوجی اسلحہ کے ذخائر میں کمی ہو گی اور انہیں کنٹرول کیا جائے گا اور تمام اقوام کے ساتھ منصفانہ سلوک ہو گا-"

"بین الاقوامی امن و استحکام کو سب سے زیادہ شدید خطرہ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے اسلحہ سے ہے- خلیج کی جنگ کے باعث اس تشویش میں اضافہ ہوا کہ عراق ممکنہ طور پر کیمیاوی یا حیاتیاتی بلکہ جوہری اسلحہ تک اتحادی فوجوں کے خلاف یا سعودی عرب اور اسرائیل میں شہری تنصیبات کے خلاف استعمال کر سکتا ہے اور انہیں میزائلوں یا دوسرے ذرائع سے نشانہ بنا سکتا ہے-"

"بین الاقوامی تشویش کا اظہار عراق کے حملے سے پہلے لیبیا اور عراق کے کیمیاوی اسلحہ کو فروغ دینے پر کیا گیا تھا-"

اوکلے نے مزید کہا "1940ء کے عشرے کے بعد کونسل اس طرح کام کر سکی جو اس کے قائم کرنے والوں کا منشاء تھا- وہ تنازعہ کے حل کے لئے' استحکام اور امن کے لئے ایک قوت کی حیثیت سے اقدامات کرنے کے قابل ہو گئی ہے-"

"اقوام متحدہ جس کو اس کے چارٹر کے پرامن اصولوں کی رہنمائی حاصل ہے' ایک دوسرے پہ انحصار کرنے والی دنیا میں بین الاقوامی اتفاق رائے کے حصول کا سب سے ممتاز فورم ہے- ہم اس ادارہ کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں- امریکہ اس کام کی تندہی سے حمایت کرتا رہے گا-"

اس اعلان میں امن اور بقائے زندگی کے لئے نہایت اعلیٰ اور ارفع نظریات اور دعووں

کا اظہار کیا گیا ہے۔ یقیناً ہر ذی ہوش شخص ان نظریات سے اتفاق کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لیکن کہاوت ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اور چونکہ ہم روزانہ انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ داری نظام کی منافقت کا مرقع بین الاقوامی ٹیلی ویژن پر سگریٹ کے رنگا رنگ جاذب نظر اور موہ لینے والے اشتہارات کی شکل میں دیکھتے ہیں جن کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ سگریٹ نوشی مضر صحت ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ اشتہارات سگریٹوں کی فروخت کو بڑھانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور اس دنیا کے مفکروں' حکمرانوں اور سیاستدانوں میں اتنی اخلاقی جرات نہیں وہ کہہ سکیں اگر سگریٹ مضر صحت ہے تو پھر کیوں ایسے اشتہارات نشر کئے جاتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر لوگ زہر بھی نوش کر جائیں۔ آخر وہ انہیں بند کیوں نہیں کر دیتے۔ لیکن سگریٹ پیدا کرنے والے اجارہ داروں کے سامنے وہ بے بس ہیں۔

ایسے ہی ہزارہا وسوسے ہیں جو اوکلے جیسے امریکی رہنماؤں کے بیانات سے جنم لیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ امریکی سماج اور تہذیب کی بنیاد ظلم' ناانصافی' جارحیت' اور نابرابری کے ضمیر سے اٹھائی گئی ہے۔ اس لئے آج جب ہم حق و انصاف کے لئے امریکی تہذیب کے علمبرداروں کے بلند بانگ دعوؤں کو سنتے ہیں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم سوچیں کہ ان دعوؤں کی حقیقت کیا ہے؟

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سرمایہ داری عہد کی آمد کے ساتھ یورپ کے وہ فرزند جنہیں مادر وطن بہتر زندگی مہیا نہ کر سکی انہوں نے سمندر پار کا رخ کیا۔ اور وہاں کے حقیقی باشندوں کو بزور شمشیر' جنگ و جدل' دغا و فریب اور دھوکا دہی سے تقریباً نیست و نابود کر دیا۔ ان کے ملک اور سارے وسائل پر قبضہ کر لیا۔ اور انہیں نہایت ہی پس ماندہ زندگی میں محصور کر دیا۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ پھر افریقی حبشیوں کو لاکھوں کی تعداد میں شکار کر کے امریکہ میں لے جا کر غلام بنا لیا گیا اور ان کی انسانیت چھین لی گئی اور سرمایہ داری نظام کی نشوونما' جس کے سیاسی اور سماجی نعرے آزادی' مساوات' اور جمہوریت کے تھے کے جلو میں ان غلاموں کی محنت شاقہ سے نئی ترقی اور نئی تہذیب کی طرح ڈالی۔ وہ بیچارے دوسری جنگ عظیم کے بعد تک بھی انسانی حقوق کے لئے جدوجہد کے دوران بے بہا قربانیاں دیتے رہے ہیں۔ اور آج بھی تگ و دو کرتے نظر آتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں نے پولینڈ میں لاکھوں لوگوں کو گیس چیمبروں میں

بھسم کر دیا تھا۔ لیکن ابھی چند ماہ پہلے جرمنی کے چانسلر نے ان سے اس بہیمانہ کاروائی کی تلافی کے لئے کھلے عام پولینڈ کے باشندوں سے معافی مانگنے کا اعلان کیا۔

اگر آج امریکی رہنما روحانی طور پر اس قدر مضبوط ہو گئے ہیں کہ وہ دنیا بھر میں آزادی' مساوات اور انصاف کی جنگیں لڑتے ہیں' اور انسان کی بہتری اور بہبود کے لئے ایک نیا نظام قائم کرتے ہیں تو کم از کم انہیں اس قدر عالی ظرف ہونا چاہئے کہ وہ اقوام متحدہ میں کھڑے ہو کر اس بات کا اعلان کریں کہ انہوں نے ریڈ انڈینز پر ظلم ڈھائے' اور ان کے ملک کو ہتھیا لیا۔ اس لئے آج وہ ان سے معافی کے طلبگار ہیں اور ان کی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے وہ ضروری رقم مہیا کریں گے۔

اور انہیں دوسرا اعلان افریقی ملکوں سے معافی مانگنے کا کرنا چاہئے۔ کیونکہ انہوں نے ان کا شکار کھیلا اور انہیں غلام بنایا اور آج بھی زندگی کی دوڑ میں وہ ان سے پیچھے ہیں۔ اس لئے ان کی ترقی و بہبود کے لئے ضروری رقم مہیا کریں۔

ان اعلانات سے ایک طرف یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کی ترقی اور برتری کی بنیادیں کیا ہیں اور دوسری طرف مظلوموں کی ذہنی طور پر داد رسی ہو جائے گی' اور ظالموں کا ضمیر بھی شاید مطمئن ہو جائے۔ پھر وہ موجودہ دنیا کے اندر عدل و انصاف' آزادی اور جمہوریت اور امن کے ارفع ترین اصولوں کے پرچار اور نفاذ کے لئے جو اقدامات کریں گے تو کم از کم ان کی نیک نیتی تو ظاہر ہو گی۔

دنیا کی جو دو جنگیں ہوئی ہیں وہ امریکہ کی جغرافیائی وجہ کی بنا پر امریکہ سے دور ہوئی ہیں۔ ان جنگوں سے اس کی ترقی' تنصیبات اور تعمیرات کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے ساحلوں سے دور لڑی جانے والی جنگوں کے لئے اسلحہ اور بارود اور دوسری اشیاء مہیا کرنے کے لئے اس کے کارخانے اور فیکٹریاں شب و روز چلتی رہیں اور نت نئی ایجادوں سے پیداوار کو بڑھانے میں مدد ملی۔ امریکہ نے ساری دنیا کے سائنس دانوں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنے ملک میں لے جا کر بے پناہ ترقی کی منازل طے کیں۔ اور آخر اسلحہ اور پیداوار کے لحاظ سے اس قدر طاقتور ہو گیا کہ وہ پلک جھپکنے میں دنیا کے کسی بھی کونے میں اپنی فوجیں اور بمبار اتار سکتا ہے کہ اپنے میزائل پھینک سکتا ہے اور اپنی پالیسیوں کا لوہا منوا سکتا ہے۔

دنیا کے ہزارہا برس کے تجربات کا نچوڑ---- طاقت حق ہے۔ طاقت سچائی ہے---- عالمی سطح پر جس قدر آج صادق نظر آتا ہے کبھی بھی نہیں تھا۔ چنانچہ اس طاقت کے بل

بوتے پر رابرٹ اوکلے نے نئے عالمی نظام کے متعلق جو امریکی وضاحتیں کی ہیں وہ توجہ طلب بھی ہیں اور انہیں حقائق کی کسوٹی پر پرکھنا بھی ضروری ہے۔

امریکہ جو چند سال پہلے اقوام متحدہ کا چندہ ادا کرنے سے بھی گریزاں تھا آج اقوام متحدہ کے ذریعے امن و آشتی اور جمہوریت کے قیام کی بشارت دے رہا ہے۔ اس وقت امریکہ کے مد مقابل سوویت یونین سوشلسٹ ممالک کے بلاک کی نمائندگی کرتے ہوئے سامراجی استحصالی پالیسیوں کی مخالفت کر رہا تھا اور امریکی اور دوسرے سرمایہ دار ممالک کی من مانی کارروائیوں کے خلاف حصار بنا ہوا تھا۔ لیکن آج امریکہ کا ساری دنیا میں بول بالا ہے۔ اور ہزاروں ایٹم بموں اور جدید ترین الیکٹرانک ہتھیاروں اور میزائلوں کے ذخیروں کو ایک ہاتھ میں لئے اور دوسرے ہاتھ سے امن و آشتی کے جھنڈے لہراتا ہوا جارحانہ انداز سے نئے عالمی نظام کا اعلان کر رہا ہے۔

وہ ایک بار پھر عراق کو جنگ کی دھمکی دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ عراق اقوام متحدہ کی قراردادوں پر صدق دلی سے عمل نہیں کر رہا۔ اور ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کے ذخیروں اور مراکز کے متعلق انفرمیشن چھپا رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ یہ سب کچھ عالمی امن، جمہوریت اور آزادی کی خاطر کر رہا ہے۔ اور مفروضہ یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے ممالک کے چھوٹے دماغوں اور محدود سوچ رکھنے والے رہنما ایٹمی ہتھیاروں جیسے مہلک ہتھیاروں کو رکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ وہ جھنجلاہٹ اور مایوسی کے عالم میں کسی وقت بھی انہیں استعمال کر کے دنیا کو بھسم کر دیں گے۔ اسی لئے ضروری ہے کہ انہیں ایسے ہتھیار تلف کرنے کے لئے مجبور کیا جائے اور انہیں ایسے ہتھیار بنانے کے لئے تجربات کرنے سے باز رکھا جائے۔ سطحی نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس بات میں کوئی زیادہ قباحت نظر نہیں آتی۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ معاملہ اس قدر سادہ نہیں ہے۔ انسانی سوچ یہ دیکھ کر چونک جاتی ہے کہ عراق کے قریب ایک اور چھوٹا سا ملک ہے جو اقوام متحدہ کا ہی پیدا کردہ ہے اور جسے قائم رکھنے کے لئے امریکہ ہر سال 2 بلین ڈالر امداد دے رہا ہے اور خلیج کی حالیہ جنگ کے دوران 14 بلین ڈالر کی مزید امداد کا وعدہ کر چکا ہے۔ اسرائیل کے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں اور حال ہی میں امریکہ نے اسے مزید مہلک ہتھیار مہیا کئے ہیں اور مستقبل میں مزید ہتھیار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اس نئے عالمی نظام کے آغاز سے لے کر اب تک کبھی ایک بار بھی مطالبہ نہیں کیا گیا کہ اسرائیل اپنے ایٹمی ہتھیار تباہ کر دے

اور اپنی ایٹمی تجربہ گاہوں کا معائنہ کرائے۔ حالانکہ اسرائیل متواتر 45 سال سے جارحیت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ لیکن جارحیت کے ان مسلسل شواہد کے باوجود اسرائیل سے نہ صرف ایٹمی ہتھیار تلف کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ اسے مزید جدید ترین ہتھیار مہیا کئے جا رہے ہیں۔

اسی طرح پاکستان میں ایٹمی صلاحیتوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے یک طرفہ مطالبات کئے جا رہے ہیں۔ ہم واضح طور پر یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کو اپنے وسائل ایٹم بم بنانے کی بجائے عوام کی بہتری اور بہبود کے لئے استعمال کرنے چاہئیں۔ لیکن عوام جب دیکھتے ہیں کہ ان کا ہمسایہ ملک ہندوستان' جو 44 سال میں پاکستان کے ساتھ تین جنگیں کر چکا ہے' ایٹمی قوت بن چکا ہے تو قدرتاً" وہ اپنے دفاع کے لئے ایٹمی قوت بننے کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی آرزو کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ جنوبی ایشیا کو مجموعی طور پر ایٹم فری زون قرار دے کر ہی حل کیا جا سکتا ہے اور پاکستان اور ہندوستان کو ایٹمی ہتھیار بنانے کی دوڑ سے باز رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ کی طرف اقوام متحدہ کی طرف سے مطلوبہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے اور نئے عالمی نظام کا علمبردار۔ امریکہ---- اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کرتا۔ دوسری اقوام متحدہ کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے امریکہ نے ایک بار پھر نہایت ہی جارحانہ انداز سے عراقی ایٹمی تنصیبات اور تجربہ گاہوں کو تہس نہس کرنے کی دھمکی دی ہے اور حملہ کی تیاری کے لئے اپنے جرنیل کو سعودی عرب روانہ کر دیا ہے اور ایک بار پھر کردوں کو بغاوت کے لئے شہ دے رہا ہے۔

لیکن فلسطینی ریاست کو وجود میں لانے کے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نہ صرف یہ کہ ایسا کوئی اعلان نہیں کیا جاتا بلکہ امریکی خارجہ سیکرٹری---- بیکر---- بار بار مشرق وسطیٰ کے چکر کاٹ رہا ہے اور اس الجھے ہوئے معاملہ کو اسرائیل کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے کا عمل کر رہا ہے۔ اول تو عراق اور کویت کے الجھے ہوئے مسئلہ کو گفت و شنید کے ذریعے اس طرح حل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی اور پہلے دن سے سخت قسم کی تجارتی ناکہ بندی کا قدم اٹھایا گیا جو آج تک جاری ہے اور معصوم بچوں اور بوڑھوں اور بیماروں اور عورتوں کو لقمہ اجل بنا رہا ہے اور عراق کی تعمیرنو کے راستے میں دیوار چین کی طرح حائل ہے باوجودیکہ اسرائیل اس وقت تک اقوام متحدہ کی قراردادوں کو نہایت حقارت سے ٹھکراتے ہوئے دوسرے ممالک سے نئے آنے والے

یہودیوں کو دھڑا دھڑ بستیاں بنائے چلا جا رہا ہے اور باوجودیکہ تقریباً تمام عرب ممالک اور آزادی فلسطین کی تنظیم اپنے پرانے رویوں کو ختم کر کے اسرائیل کے ساتھ گفت و شنید کی میز پر بیٹھنے کے لئے تیار ہیں' پھر بھی امریکہ ناقابل برداشت صبر و تحمل کو اپناتے ہوئے اسرائیل کی طرف سخت رویہ اختیار کرنے کو تیار نہیں ہے۔

جہاں تک اس مفروضہ کا تعلق ہے کہ چھوٹے ملکوں کے چھوٹے رہنما جھنجھلاہٹ کے عالم میں ایٹم بم استعمال کر کے دنیا کو بھسم کر سکتے ہیں' حقائق کی روشنی میں پرکھنا ضروری ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ عراق کے صدام حسین نے دو بار ہمسایہ ملکوں کے خلاف جارحیت کی ہے۔ ایک بار اسے امریکہ کی مکمل حمایت اور مادی مدد اور ہتھیاروں کی ترسیل حاصل تھی اور دوسری بار وہ اپنے ہی بل بوتے پر ایک چھوٹے ملک کویت پر چڑھ دوڑا لیکن اس نے باوجود بیکراں تباہی' وحشت اور بربریت اور شرمناک شکست سے دوچار ہونے کے ایٹم بم یا کیمیائی ہتھیار استعمال نہیں کئے۔

آج دنیا میں ایک ہی قوت ہے جس نے بیس ہزار سے زائد ایٹمی ہتھیار اپنے اسلحہ خانوں' بحری بیڑوں اور دوسرے ملکوں کی سرزمین پر اپنے فوجی اڈوں پر جمع کر رکھے ہیں اور وہ قوت ہے امریکہ۔ امریکہ ہی وہ ملک ہے جس نے سب سے پہلے ایٹم بم بنایا۔ امریکہ کی سرزمین پر آج تک کسی بیرونی طاقت نے حملہ نہیں کیا اور نہ ہی اس کی شہری آبادی اور صنعتی مراکز کو نشانہ بنایا ہے۔ قدرت نے اسے ایسا جغرافیائی تحفظ دیا ہے کہ ابھی تک تحفظ کی اس قدرتی خلائی فصیل کو کسی نے عبور نہیں کیا۔ سوائے یورپ کے ان تارکین وطن کے جنہوں نے سات سمندر پار کر کے امریکہ کے اصلی باشندوں ریڈ انڈینز کو تباہ و برباد کر کے ان کے ملک پر قبضہ کر لیا اور ان کی نسل کشی کی۔

لیکن اس کے باوجود امریکہ ہی وہ پہلا ملک ہے جس نے ایٹم بم استعمال کیا اور جاپان کے دو شہروں۔ ہیرو شیما اور ناگا ساکی---- کو 1945ء میں خاکستر کر دیا اور یہ حملہ ایسے وقت میں کیا گیا جب اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جب دوسری جنگ عظیم اختتام کو پہنچ رہی تھی اور جاپان ہتھیار ڈالنے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ ایسے وقت میں تباہ کن ایٹم بم استعمال کرنے کا امریکہ کے پاس کیا جواز تھا؟ جو آج عالمی امن و آشتی کے قیام اور الجھے ہوئے مسائل کو باہمی گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے اور جمہوری نظام قائم کرنے کے

بلند بانگ دعوے کر رہا ہے۔

دراصل ہیرو شیما اور ناگا ساکی پر ایٹمی حملہ کر کے امریکہ اپنی عالمی برتری اور طاقت کا مظاہرہ کر رہا تھا اور ان دھماکوں کے ذریعے نئے عالمی نظام کا اعلان کر رہا تھا۔ لیکن اس جارحانہ اعلان کا اس کی مد مقابل طاقت سوویٹ یونین نے 45 سال تک ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جس سے اس کے عزائم خاک میں مل گئے۔ چنانچہ اس نے مجبور ہو کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ دنیا بھر میں 3300 فوجی اڈے قائم کئے۔ ان پر ہزاروں مہلک ہتھیار ذخیرہ کئے۔ جگہ جگہ پس ماندہ ممالک میں انقلابات کو فیل کرنے یا اپنی سوچ کے مطابق ڈھالنے کے لئے فوجی مداخلت کی۔ کوریا اور ویٹ نام' [illegible] اور گرنیڈا پر براہ راست حملہ کیا' لیبیا پر بم باری کی' لبنان میں فوجیں اتاریں' کیوبا کی ناکہ بندی کی' انگولا' موزنبیق' ایتھوپیا' افغانستان اور دوسرے ممالک میں عوامی جدوجہد کو دبانے کے لئے رجعت پسند طاقتوں کی ڈالروں اور ہتھیاروں سے پشت پناہی کی' ناٹو اور بغداد پیکٹ' سیٹو اور سنٹو کے فوجی معاہدوں کی بنیاد رکھی اور تمام ان ملکوں کے خلاف جہاں سامراج کے خلاف جدوجہد آزادی جاری تھی یا کامیاب ہوئی تھی ان پر تجارتی پابندیاں لگائیں۔ انہیں نرم شرائط پر قرضوں سے محروم کیا اور ان کے خلاف تجارتی جنگ جاری رکھی۔ انہیں جدید ٹیکنالوجی منتقل نہ ہونے دی۔ غرضیکہ انہیں پسماندہ اور غریب رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ آج سینتالیس سال بعد طاقتور سرمایہ داروں ملکوں کی مدد اور تعاون سے اس کے یہ منصوبے بار آور ہوئے ہیں۔

آج دنیا میں پہلی بار۔ طاقت سچائی ہے۔ طاقت انصاف ہے۔ کے صدیوں پرانے مقولوں کی سچائی کو عالمی سطح پر پیش کیا جا رہا ہے۔ امریکی سامراج ایک بہت بڑی اور مہیب طاقت بن چکا ہے۔ باوجودیکہ جرمنی اور جاپان جیسے ممالک معاشی میدان میں اسے مات دے رہے ہیں اور باوجودیکہ خود امریکی عوام بے پناہ مسائل میں گرفتار ہیں۔ جہاں بیس لاکھ کے قریب لوگ بے گھر ہیں لیکن اپارٹمنٹ خالی پڑے ہیں۔ بے روزگاری روز بروز بڑھ رہی ہے۔ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ درجنوں بنک فیل ہو چکے ہیں۔ اخلاقی قدریں تباہ و برباد ہو رہی ہیں اور جرائم میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ آج اس قدر گھناؤنی طاقت بن چکا ہے کہ دنیا کچھ سالوں کے لئے اس کے اشارے پر چلنے پر مجبور ہو گی۔ اس کی بے پناہ طاقت سے اسے جو جوڑ توڑ کی صلاحیتیں حاصل ہیں' اس طاقت کی بالادستی کو قائم رکھنے کے لئے اس کے ساتھ ہیں۔

ہمارے جیسے غریب اور پس ماندہ ممالک جو بڑھتی ہوئی آبادی کے بے پایاں سیلاب کی زد میں ہیں' جو ناخواندگی اور جہالت میں ترقی کر رہے ہیں' جو قرضوں کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں' جو افغانستان میں جہاد کے نام پر امریکی سامراج کی جنگ لڑتے لڑتے اپنے عوام کو ہیروئن اور کلاشنکوف کے شکنجوں میں دے چکے ہیں اور جہاں سمگلر اور جعل ساز اور ڈاکو اور راہزن حکومتی ایوانوں میں پہنچ گئے ہیں' کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ امریکی عزائم کو سمجھتے ہوئے' نعرہ بازی سے اجتناب کرتے ہوئے' اپنی ترقی کے لئے ایسی پالیسیاں اختیار کریں کہ موجودہ عالمی دور میں جو مواقع میسر ہیں ان سے پورا پورا استفادہ حاصل کریں۔ اور خالی خولی جہاد کی بڑکیں مارنے کی بجائے اپنی معیشت اور صنعت اور ثقافت کو ترقی دیں۔ سماج سے غلاظتوں کو ختم کریں۔ اور محض غبارہ نما رنگین نعروں کے طلسم میں نہ پھنسے رہیں۔ اور ایسے ناقابل عمل منصوبوں اور نظریوں کو سینے سے نہ لگائے رکھیں جن پر کبھی عمل ہوا ہے اور نہ ہی ہونا ہے۔ جتنا ان نظریوں اور اصولوں کا پرچار ہوتا ہے اتنا ہی ہم ان سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور یہ نعرے محض گھناؤنی زندگی' لوٹ مار' مار دھاڑ اور کشت و خون کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔

ہمیں امیر اور بڑی طاقتوں کو یہ کہنا ہو گا کہ اگر وہ واقعی نیا عالمی نظام قائم کرنا چاہتی ہیں تو پہلے انہیں اپنے ایٹم اور ہائیڈروجن بم اور دوسرے مہلک الیکٹرانک ہتھیاروں کو ضائع کرنا ہو گا۔ اور اس طرح کمزور اور چھوٹے ملکوں کے لئے ایک مثال قائم کرنا ہو گی۔ ان پر طاقت کا دباؤ ڈالنے کی بجائے ان اقدامات سے وہ اپنے مجروح اعتماد کو بحال کر سکیں گے۔ عراق کے بارے میں اقوام متحدہ کے ذریعے جو زہریلا ماحول پیدا کیا جا رہا ہے۔ کسی طرح بھی سودمند ثابت نہیں ہو گا۔

یہ نیا عالمی نظام کیسا ہو گا جو تمام قوموں۔ امیر اور غریب' بڑی چھوٹی---- کے درمیان مساوات قائم نہ کر سکے؟ یہ نیا عالمی نظام کیسا ہو گا جو ذات پات اور رنگ و نسل اور امارت اور غربت کے فاصلوں اور بعد کو دنیا بھر میں دور نہیں کر سکتا؟ یہ نیا عالمی نظام کیسا ہو گا جو صدیوں کے بہیمانہ مظالم کے داغ سماجی زندگی سے مٹانے سے قاصر ہے؟ پس ماندہ' جاہل اور صدیوں سے ذلت و غربت کی آفات میں گھری ہوئی مخلوق کے ساتھ نفرت و حقارت سے پیش نہ آؤ۔ کم ترقی یافتہ ملکوں کے روزمرہ کے استعمال کے لئے پیدا کئے جانے سامان اور اشیاء کے درآمد کئے جانے کے راستے میں رکاوٹیں مت کھڑی کرو۔ نقل و حمل اور امیگریشن

قوانین کو ڈھیل دو اور جنم جنم کے پیاسے بھوکے لوگوں کو ترقی یافتہ امیر ملکوں میں جانے کے لئے سہولتیں فراہم کرو تاکہ وہ بھی ترقی یافتہ عالی شان تہذیب کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں جو محکوم قوموں کے خون اور ہڈیوں سے استوار ہوئی ہے۔ انہیں ہنر مندی دو اور ان کے ذہنوں کو نئی سائنسی ایجادات سے روشناس کراؤ تاکہ صدیوں سے جامد ان کی سوچ میں حرکت پیدا ہو سکے۔ اگر آج تہذیب کی بلند و بالا چوٹیوں پر بیٹھے تم اتھاہ گہرائیوں میں بے بسی اور جہالت میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو اٹھانے کے لئے نیچے نہیں اترو گے تو وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ تم اپنی آستینوں میں نئے عالمی نظام کے پردے میں نئے فریب اور چالاکیاں چھپائے ہوئے ہو۔

پہلے قدم کے طور پر ان کے جان لیوا سرطانی قرضے معاف کر دو۔ اگر نیا عالمی نظام قائم کرنا ہے تو سلامتی کونسل کے پانچ بڑوں کو سب سے پہلے اپنے ایٹمی اور کیمیائی اسلحہ کے ذخائر تباہ کرنے ہوں گے اور ان کے علاوہ جدید الیکٹرانک ہتھیار اور میزائل وغیرہ بھی ختم کرنے ہوں گے۔ اور چھوٹے ملکوں پر اسلحہ کے ذخائر کو ختم کرنے کے لئے دباؤ ڈالنے کی بجائے مثال قائم کرنی ہو گی تاکہ دنیا میں بڑی طاقتوں کی دیانتداری کے متعلق اعتماد پیدا ہو سکے۔

اگر آج واقعی دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہے کہ ہو چکی ہے تو پھر آج سے پینتالیس سال پہلے وجود میں آنے والی اقوام متحدہ کی تنظیم پرانی شکل میں قائم نہیں رہ سکتی۔ پس ماندہ اور سابق محکوم ملکوں کے کروڑوں عوام آزاد ہو چکے ہیں۔ انہیں بھی سلامتی کونسل میں جگہ ملنی چاہئے۔ ان کے خیالات اور جذبات اور مفادات کی حفاظت کے لئے سلامتی کونسل میں ان کی بھی آواز ہونی چاہئے۔ اگر پانچ بڑے ہی سلامتی کونسل میں سارے اختیارات اپنی مٹھی میں لے کر دنیا کو چلانے کی کوشش کرتے رہے تو یقیناً بہت جلد ان کے خلاف جذبات جنم لیں گے۔ اور آوازیں اٹھیں گی اور یہ تنظیم بجائے انصاف و امن کا پیکر بننے کے طاغوتی طاقت کا روپ دھار لے گی۔ جمہوریت کے اس آدرش کو محض روس اور مشرقی یورپ میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں خصوصاً سعودی عرب اور مشرق وسطیٰ کی دوسری ریاستوں میں بھی قائم کرنے میں مدد دو۔

عجب بات ہے کہ اس نئے عالمی نظام کے خدوخال کو ابھارنے کے لئے عراق میں تو آمرانہ حکومت بدلنے کے لئے پس پردہ کوششیں جاری ہیں اور جمہوریت کے قیام کے لئے دلائل پیش کئے جا رہے ہیں لیکن دوسری طرف مشرق وسطیٰ میں اپنے مفادات کی حفاظت

کے لئے گلی سڑی بادشاہتوں اور امارتوں کو ہر قسم کا تحفظ دیا جا رہا ہے۔ اور نہایت ہی گھناؤنی قسم کی شخصی حکومتوں کی نشوونما کے لئے آبیاری کی جا رہی ہے۔ اور انہیں قائم رکھنے کے لئے پالیسیاں عمل میں لائی جا رہی ہیں اور بنیادی انسانی حقوق جن کا امریکی حکمران اس قدر ڈھنڈورا پیٹتے ہیں' کا قطعاً" ذکر نہیں کیا جاتا۔

ان دوہرے معیاروں کی وجہ سے بدظنی اور وسوسے جنم لیتے ہیں۔ یہ یقیناً نئے جنم لینے والے عالمی نظام کے چہرے پر بدنما دھبے ہیں لیکن انہیں مٹانے کے لئے انگلی تک نہیں ہلائی جاتی۔

انہی وجوہات کی بنا پر امریکہ کے نئے عالمی نظام کے متعلق اوکلے کی وضاحتیں تشنہ اور مبہم ہیں اور ان کے پیچھے چھپے ہوئے ان کے مفادات صاف نظر آ رہے ہیں۔ ایسے حالات میں پس ماندہ اور محروم عوام کو نئے حالات میں اپنے مفادات کی حفاظت اور اپنی نشوونما کے لئے نئے طریقے اختیار کرنے ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ صورت حال زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکے گی۔ ذلتوں اور پس ماندگی کے مارے ہوئے لوگ یقیناً نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔

دنیا بھر کے عوام کی خاموش جدوجہد پہلے ہی بار آور ثابت ہو رہی ہے۔ قنوطیت کے پیغمبر جو یہ سمجھتے تھے کہ خلیج کی جنگ نے فلسطینی عوام کے جائز مفادات کو نقصان پہنچایا ہے اور اسرائیل کو بہت طاقت ور بنا رہا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ امریکی صدر نے پہلی بار ہٹ دھرم اسرائیلی حکومت پر دباؤ ڈالا ہے کہ وہ مستقبل کی فلسطینی حکومت کے نمائندوں سے امن کے لئے بات چیت کرے اور اب اقوام متحدہ نے اسرائیل کی 12 فلسطینیوں کو ملک سے باہر نکالنے کی مذمت کی ہے۔ پہلے یہ ایک ان ہونی بات تھی۔

پاکستان کے عوام اچانک سطحی اطمینان اور خواب خرگوش سے جاگنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ سوویٹ یونین میں پرانے قسم کے سوشلسٹ نظام کے خاتمے کے بعد امریکہ کے ساتھ قدرتی اور اٹوٹ سمجھی جانے والی دوستی ریزہ ریزہ ہو چکی ہے اور نئے حالات میں نئی دوستیاں اور تعلقات قائم ہو رہے ہیں۔ پاکستان جسے کبھی اس وجہ سے امریکہ سے قربت حاصل تھی کہ اس نے چین اور امریکہ کے درمیان پل کا کام دیا' محض اس وجہ سے آج امریکہ سے دور ہو رہا ہے کہ پاکستان کی چین کے ساتھ دوستی ہے۔ اور آج کے حالات میں امریکہ ہندوستان کے ساتھ مراسم بڑھانے کے لئے کوشاں ہے۔ جن ملکوں نے

آج دنیا بھر کے عوام کی تقدیروں کے فیصلہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے ان کے لئے مشرق وسطیٰ کے اسلامی ملکوں کے تیل کے ذخائر عالمی سرمایہ داری نظام کی تہذیب کی ترقی کے لئے محور بن چکے ہیں۔ ان کی سب پالیسیوں کا یہی مرکز ہے اور وہ ایک عرصے تک اسی نقطے کے گرد گھومنے پر مجبور رہیں گے۔

نئے عالمی نظام کے کردار سے پردہ اٹھتا ہے

خلیج کی جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی امریکہ نے جو کہ تاریخ کے اس زمانہ میں دنیا کی تقدیروں کا فیصلہ کرنے والا واحد اور مضبوط ترین ملک ہے' فلسطین کے مسئلہ کے حل کے لئے میڈرڈ میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جو ایک نہایت ہی عالی شان' ترقی یافتہ اور طاقتور سنہری اسلامی تہذیب کا مدفن ہے۔ وہ تہذیب جو کبھی اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے یورپی باشندوں کے لئے علم و ترقی اور دانش کا مینار تھی اور جس نے جاہل اور اجڈ یورپی باشندون کو انسانیت اور رحم و کرم کا درس دیا تھا۔ ایسے مقام پر اس کانفرنس کا انعقاد دراصل مسلمانان عالم کو اس اسلامی تہذیب کے خوفناک انجام کی یاد دلاتا تھا۔

پرسٹرائیکا اور گلاس ناسٹ کا شہرت یافتہ عظیم گورباچوف بھی وہاں ہاتھوں میں بھیک کا کشکول اور الجھے ہوئے ذہن میں چیتھڑا شدہ نظریہ سموئے موجود تھا اور شاطر مداری کے سامنے ذلت آمیز انداز میں ناچتے ہوئے اپنے نئے مربی کو امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور عظیم لینن کے حنوط شدہ جسم کو بیچنے کی پیشکش کر رہا تھا۔ بش اپنے اس نئے عظیم شکار کو اس حالت میں دنیا بھر کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ کانفرنس کے دوران میں اسرائیل برابر لبنان پر آتش و آہن کی بارش کرتا رہا۔ کسی نے بھی اس بربریت کی طرف توجہ نہ دی اور فلسطینی علاقوں کو خالی کرنے کے لئے ایک لفظ بھی نہ کہا گیا' جن پر اسرائیل نے طاقت کے بل پر قبضہ جما رکھا تھا اور اسرائیل کا وزیراعظم جو کبھی دہشت گردی کے الزام میں حکومتوں کو مطلوب تھا از خود سیر کی چھٹی منانے کے لئے وطن واپس چلا گیا۔

فتح و کامرانی کے شادیانوں سے فضائیں گونج اٹھیں کیونکہ آخرکار امریکی وزیر خارجہ مسٹر بیکر کی متحرک اور جارحانہ ڈپلومیسی رنگ لائی تھی اور دو متحارب طاقتوں اسرائیل اور فلسطینی کو جو ایک دوسرے کو دیکھنا بھی پسند نہ کرتی تھیں کمال چابکدستی سے بات چیت کے لئے ایک میز پر بٹھا دیا گیا تھا۔ تاکہ وہ نہ حل ہونے والے مسائل پر گفتگو کر سکیں اور مفاہمت کا کوئی راستہ نکال سکیں لیکن اقوام متحدہ' جس کے جھنڈے تلے خلیج کی جنگ کویت کی آزادی

بحال کرنے کے لئے لڑی گئی تھی اسے اس کانفرنس میں کوئی کردار نہ دیا گیا تھا۔

باہمی گفت و شنید کے لئے دوسری میٹنگ واشنگٹن میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ عربوں نے اس تجویز کو مان لیا۔ لیکن اسرائیل نے گو مگو کی پالیسی اختیار کی۔ آخر بڑی تگ و دو کے بعد میٹنگ تو ہو گئی لیکن یہ میٹنگ بھی بے نتیجہ رہی۔

اس کے ساتھ ہی اسی طاقت کے نمائندے، جس نے دنیا بھر میں جگہ جگہ فوجی اڈوں میں ہزاروں ایٹم بم اور دوسرے مہلک ہتھیار جمع کر رکھے ہیں ایک طرف خیر سگالی کے جذبات اور دوسری طرف قہر آلود دھمکیوں کے جلو میں پاکستان کی سرزمین پر وارد ہوئے۔ اور پاکستان کے یہ مژدہ سنایا کہ ایٹمی حملہ کے خلاف وہ ان کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ لیکن پاکستان کو نیوکلیائی تجربات کو خیرباد کہنا ہو گا۔ حتیٰ کہ پرامن ضروریات کے لئے بھی تجربے بند کرنے ہوں گے۔

امن اور آزادی کے ان محافظوں نے لیبیا کو بھی صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی دھمکی دی ہے کیونکہ لیبیا کے خلاف الزام یہ کہ چند سال پہلے برطانیہ میں ہوائی جہاز کے مہلک حادثہ میں اس کا ہاتھ ہے۔ لیبیا نے یہ الزام بے بنیاد قرار دیا اور انصاف کی بین الاقوامی عدالت کی طرف رجوع کرنے کے لئے کہا لیکن اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا گیا اور اب امریکی بیڑا لیبیا پر دھونس جمانے کے لئے اس کے ساحلوں کے قریب پہنچ کر شہری ہوا بازوں کو ڈرا دھمکا رہا ہے۔

امریکی وزیر خارجہ بیکر نے چین کا بھی دورہ کیا اور چین پر دباؤ ڈالا کہ پاکستان اور ایران کو ایٹمی ری ایکٹر دینے سے باز آ جائے لیکن چین نے یہ دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ عجب بات ہے کہ امریکہ نے خود تو مشرق وسطیٰ کے آمر حکمرانوں کو ہتھیاروں کی سپلائی بڑھا دی ہے لیکن دوسروں پر اپنی طاقت کے گھمنڈ میں ناجائز دباؤ کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے۔ چین پر یہ دباؤ کھلے طور پر اور مخفی طریقوں سے برابر جاری ہے۔

ایک اور اچنبھے کی بات ہے کہ وارسا پیکٹ کے ختم ہونے اور سوویٹ یونین کے حصے بخرے ہونے کے باوجود نیٹو کو ختم کرنے کی بجائے مزید مضبوط کیا جا رہا ہے اور اس میں مشرقی یورپ اور ٹوٹے ہوئے سوویٹ یونین کی ریاستوں کو بھی ممبرشپ دی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ مزید جدید ہتھیاروں کو بنانے کے لئے ریسرچ جاری ہے اور برابر فنڈ مہیا کئے جا رہے ہیں۔ یہ نیٹو اب کس کے خلاف صف آرا ہو گا۔ یہ نئے جدید ہتھیار اب کن کے

خلاف استعمال ہوں گے۔ سوائے پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے اور کوئی ٹارگٹ نظر نہیں آتا۔ یہ یقیناً بہت ہی تشویشناک بات ہے۔

لیکن دوسری طرف مشرق وسطیٰ میں نہایت ہی عالیشان کامیابیوں کے باوجود بش کی ہردلعزیزی بجائے بڑھنے کے برابر کم ہو رہی ہے۔ امریکہ میں بحران برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ جنرل موٹرز جسے بجا طور پر امریکی صنعت کی ماں کہا جاتا ہے نے اعلان کیا ہے کہ وہ اگلے تین چار سالوں میں 74 ہزار ملازمین کو نکال رہی ہے۔ اس کے چند ایک کارخانے بند بھی کر دیئے گئے ہیں۔ ادھر نسا نے چار ہزار ملازمین کی چھانٹی کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ باون سال سے قائم "پین ایم ہوائی کمپنی" فیل ہو گئی ہے جسے ڈیلٹا کمپنی نے خرید لیا ہے۔ کچھ لوگ جو امریکی دولت و ثروت سے بہت مرعوب ہیں ان سماجی حالات کو محض عارضی اور معمولی سمجھتے ہیں لیکن یہ ان کی بھول ہے۔ سوویٹ یونین کو تو وہ توڑنے اور شکست دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن اس واقعہ نے سرمایہ داری نظام کے وقفے وقفے سے نمودار ہونے والے بحرانوں کے جن کو بھی آزاد کر دیا ہے جو ان ممالک کی معیشتوں کو اپنے پنجوں میں دبوچ رہا ہے اور بے شمار مسائل کھڑے کر رہا ہے۔ امریکہ کے ایک شہر میں تو ایک رہنما نے یہ تجویز تک پیش کی ہے کہ امریکہ میں گداگروں کو باقاعدہ لائسنس جاری کئے جائیں۔ ان شواہد سے حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ سرمایہ دار ملکوں کے درمیان ایک جانکاہ معاشی جنگ جاری ہے۔

امریکی سینٹ نے یونائیٹڈ سوورن سٹیٹس کو امداد دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ خود ان کے عوام کے لئے سرمایہ درکار ہے۔

بش نے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لئے عراق کے خلاف کردوں کے ذریعے ایک نئی جنگ جاری کرنے کی بھی دھمکی دی ہے۔ اور اب رچرڈ نکسن سابق صدر امریکہ نے بھی صدام حسین کو ختم کرنے کے لئے عراق پر دوبارہ حملہ کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ ابھی تک عراق کے خلاف تجارتی پابندیاں جاری ہیں۔ اور اس ملک کے عوام کو بے پناہ دشواریوں کا سامنا ہے۔ اب آہستہ آہستہ عراقی مظالم کی داستانوں سے بھی پردہ اٹھ رہا ہے۔ جنگ سے پہلے امریکی ذرائع ابلاغ کے سامنے ایک نوجوان لڑکی کو پیش کیا گیا تھا جس نے یہ بیان دیا کہ عراقی فوج نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہسپتال میں بیس نوزائیدہ بچوں کو سڑک پر پھینک دیا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ اب پتہ چلا ہے کہ یہ سب کچھ عراق کے خلاف امریکی عوام کو بھڑکانے اور ان میں جنگی جنوں پیدا کرنے کے لئے ایک سازش تھی۔ وہ لڑکی

امریکہ میں کویت کے سفیر کی بیٹی تھی اور سی آئی اے نے اسے اس کام کے لئے استعمال کیا تھا۔

بش کو اپنی ہردلعزیزی بچانے اور امریکہ کے معاشی بحران کے حل کے لئے آسٹریلیا اور جاپان کا دورہ کرنا پڑا۔ ان ملکوں میں وہ امریکی مصنوعات کے لئے منڈی ڈھونڈنے گیا تھا۔ آسٹریلیا میں اس کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے اور جاپان نے پہلے اس کی درخواست کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں ڈرا دھمکا کر بیس ہزار امریکی موٹریں خریدنے کے لئے جاپان کو رضامند کروا لیا۔ مسائل کے اس ہجوم کے بوجھ تلے وہ بش جو خلیج کی جنگ کے دوران نہایت ہی تحکمانہ انداز سے احکام صادر کرتا تھا اور بات بات پر الٹی میٹم دیتا تھا' ٹوکیو میں کانفرنس کے کمرہ میں اپنی کرسی سے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ شاید عراق کے لاکھوں بے گناہ اور معصوم بچوں' بوڑھوں اور عورتوں کی آہوں نے اس کے دل کا قرار اور ذہن کی یکسوئی کو چھین لیا ہے اور آج جنگ کے چند ماہ بعد وہ نفسیاتی مریض بن کر رہ گیا ہے۔

ترقی پذیر ممالک کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ان نئے حالات میں وہ کیا کریں اور کس طرح ان کا مقابلہ کریں؟ یقیناً جواب یہ ہے کہ انہیں نہایت ہی ثابت قدمی سے ان ظالمانہ نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ لیکن کیسے؟ بے تکی نعرے بازی' کھوکھلی جذباتیت اور صدام کی طرح سیدھی امریکہ سے ٹکر لے کر نہیں یہ تو خودکشی کے مترادف ہو گا لیکن انہیں نئے عالمی نظام کا اصل مطلب ضرور سمجھنا چاہئے اور صلح حدیبیہ اور برسیٹ لٹزواسک معاہدہ سے ازسرنو سبق سیکھنا چاہئے۔ انہیں بھوکے بھیڑیئے سے بچنے کے لئے فوری ٹکر لینے سے گریز کرنا چاہئے اور غیر جارحانہ اور مصالحانہ رویہ اختیار کرنا چاہئے اور اپنی حیثیت اور سماجی ڈھانچوں کو مضبوط کرنا چاہئے۔

یہ پالیسی کامیابی سے تبھی ہمکنار ہو سکتی ہے اگر وہ اپنے ملک کے لٹیرے طبقوں اور افراد کو جدوجہد کے ذریعے ملیا میٹ کر دیں جو تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہوئے اپنے ملکوں کے غریب اور بے کس عوام کو شب و روز دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔

پاکستان کے عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ نئے حالات میں افغانستان میں امن کی کوششوں کی پوری طرح حمایت کریں اور وہ طاقتیں اور افراد جو جنیوا معاہدے پر عملدرآمد کی بجائے کابل و قندھار کو فتح کرنے کی باتیں کرتے ہیں ان کی پرزور مخالفت کریں اور انہیں شکست دیں۔ تاکہ پاکستان سے 35 لاکھ افغان مہاجرین عزت و وقار کے ساتھ اپنے ملک میں

واپس لوٹ سکیں۔ ہیروئن اور کلاشنکوف کا کلچر ختم ہو اور پاکستانی معیشت پر ناجائز بوجھ سے نجات حاصل ہو۔ اور افغانستان اور سوویت یونین سے آزاد ہونے والی ریاستوں کے ساتھ تجارتی روابط بڑھیں۔

ان نئے حالات میں یہ بھی ضروری ہے کہ جنوبی ایشیا کو نیوکلیر ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دیئے جانے کے لئے پاکستان کی حکومت پرزور کوشش کرے اور ہندوستان کے ساتھ چالیس سالہ عداوت اور دشمنی کو خیرباد کہہ کر برابری کی بنیادوں پر دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی جائے۔ اور ہندوستان پر زور دیا جائے کہ وہ کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرے۔ اس طرح فوجی اخراجات کم کرنے کے مواقع میسر آئیں گے۔ ملک کے زیادہ سے زیادہ وسائل بنیادی صنعتیں لگانے، تیل کے ذخائر اور دیگر معدنیات کی دریافت پر خرچ کئے جائیں۔ ملک میں ٹیکنیکل تعلیم کو سائنسی بنیادوں پر عام کیا جائے اور ملک کے اندر حقیقی جمہوریت کے قیام کے لئے، گھٹے ہوئے رجعت پسند خیالات کا پرزور مقابلہ کیا جائے۔

تیسری دنیا کا مقدر

آج ترقی یافتہ قومیں سائنس، ٹیکنالوجی اور ایجادات میں سماجی ارتقاء کی ایسی منزلوں پر پہنچ گئی ہیں جہاں انسانی زندگی بھوک اور احتیاج کی حدوں کو عبور کر کے آزادی اور بہتات کی وادیوں میں داخل ہونے کی تیاری کر رہی ہے۔

لیکن تیسری دنیا کے لوگ، جن کی آبادی دنیا کی آبادی کی تین چوتھائی کے قریب ہے اور جو بارہویں صدی تک، جبکہ یورپ اور امریکہ جہالت کی سیاہ راتوں میں گھرے ہوئے تھے۔ علم و سائنس کی شمعیں جلائے ہوئے تھے، آج وہ غلامی کی زندگی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو ہزاروں مسائل سے دوچار پاتے ہیں۔ وہ آج بھی پسماندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ علم کے نور سے بے بہرہ ہیں۔ کروڑوں بے روزگار ہیں۔ کروڑوں کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔ کروڑوں یہ نہیں جانتے کہ غسل خانہ کیا ہے۔ رہنے کو گھر نہیں۔ پیٹ بھر کر کھانے کو روٹی نہیں۔ لاکھوں ہر سال بھوک سے مر جاتے ہیں۔ ہزاروں ان حالات کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں۔

ہم جو مغربی دنیا کی ترقی، طاقت اور عظمت کے گن گاتے نہیں تھکتے اور اس عظیم ترقی اور تہذیب کو سرسری اور سطحی نظر سے دیکھ کر ہماری آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور ہم جو اٹھتے بیٹھتے آزادی، مساوات اور انصاف کے نعرے لگاتے ہیں اور انہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے جسموں کی شمعیں جلاتے ہیں اور مساوات کا نعرہ لگاتے ہوئے سولی پر لٹک جاتے ہیں اور ان آدرشوں کی محبت میں شاہی قلعہ میں اذیتیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ کوڑے کھاتے ہیں۔ ہمیں ان الفاظ اور نعروں کے معنی اور ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تیسری دنیا کے المیے کے پیچھے چھپی ہوئی ایک بہت بڑی حقیقت کو سمجھنا چاہئے۔

آیئے ذرا حقائق کی روشنی میں برطانوی اور دوسرے مغربی ملکوں اور امریکہ کی تہذیب

کے ارتقاء پر ایک سرسری سی نظر ڈال لیں' جنہوں نے تیسری دنیا کو بزور شمشیر غلام بنایا اور آج اپنے سرمائے سے وہی مفاد حاصل کر رہے ہیں۔

1750ء سے 1810ء کے درمیان ساٹھ سال برطانوی سرمایہ داری نظام کی ترقی کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دوران برطانوی سامراج نے ہندوستان سے پانچ صد ملین اور ہزار ملین پونڈ کے درمیان رقم برطانیہ منتقل کر لی۔ اس میں وہ منافع شامل نہیں جو نابرابر تجارت سے حاصل کیا گیا۔

1757ء میں برطانوی نو آبادیاتی رہزن فوجوں نے لارڈ کلائیو کی رہنمائی میں کلکتہ پر قبضہ کر لیا۔ کلکتہ کی لوٹ مار کے متعلق خود لارڈ کلائیو نے جس بہیمانہ انداز سے اپنی ڈائریوں میں لوٹ مار کا ذکر کیا ہے' عالمی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ معروف برطانوی ماہر معاشیات لارڈ کینز نے اس لوٹ مار کے متعلق قابل غور حساب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اگر وہ تمام خزانہ جسے کلکتہ فتح کرتے وقت لوٹا گیا۔ بنک آف انگلینڈ میں سود مرکب پر جمع کر دیا جاتا تو بیسویں صدی تک اس کی مالیت برطانیہ کی تمام قومی دولت کے برابر ہوتی۔"

1860ء کے عشرے میں ہندوستان نے جو ٹیکس برطانیہ کو ادا کئے ان کی مالیت 65 ملین پونڈ سالانہ تھی۔ یعنی کہ برطانیہ کی قومی آمدنی کا 22 فی صدی۔ لارڈ کرزن نے اس صدی کے شروع میں یہ اعتراف کیا کہ ہر پانچواں پونڈ جو برطانیہ خرچ کرتا ہے' وہ ہندوستان سے آتا ہے۔ حتیٰ کہ 1945ء تک ہندوستان برطانیہ کو سالانہ 155 ملین پونڈ خراج ادا کرتا رہا۔

کلکتہ کی فتح کے بعد لارڈ کلائیو اور اس کے جانشینوں نے لوٹ مار کے نئے نئے طریقے رائج کئے۔ انہوں نے ڈھاکہ کے پارچہ بافوں کے انگوٹھے تک کٹوا دیئے تاکہ کپڑے کی ترقی یافتہ صنعت دم توڑ دے اور برطانوی صنعت کو فروغ حاصل ہو سکے۔ انہوں نے بہار کے نیل اگانے والوں کو نیل اگانے سے جبراً" بند کر دیا تاکہ برطانیہ کی مصنوعی نیل تیار کرنے والی صنعت پھل پھول سکے۔

ہندوستان میں برطانیہ کی آمد کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے قحط پڑنے لگے۔ جن میں لاکھوں لوگ بھوک سے بلک بلک کر مرتے رہے اور آخری قحط 1943ء میں بنگال میں پڑا کیونکہ بنگال سے چاول فوجی ضروریات کے لئے باہر بھجوا دیا گیا۔ اس قحط میں 35 لاکھ لوگ ایاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ تیس ہزار عورتیں بازار میں بک گئیں۔ ہزاروں بچوں کو والدین

نے بیچ دیا۔ ان لٹیروں نے تخت طاؤس اور کوہ نور لوٹ لیا اور لارڈ کلائیو کے جانشینوں نے 1857ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی "خوشنودی" کے لئے تحائف بھیجے اور جب ٹرے سے کپڑا اٹھایا گیا تو اس میں بادشاہ کے پوتوں کے بریدہ سر تھے۔

ہندوستان کو زیر کرنے کے بعد ہی وہ دور شروع ہوا' جس میں برطانوی تہذیب کو چار چاند لگے۔ صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ جمہوریت کے پودے نے نشوونما پائی جسے ہندوستان کے خون سے سینچا گیا۔

اسی طرح 1832ء میں برطانیہ میں جب چارٹسٹ تحریک زوروں پر تھی اور ہر طرف جمہوری حقوق کے حصول کا غلغلہ تھا اور برطانیہ میں نئے نئے جمہوری ادارے اور حقوق وجود میں آ رہے تھے تو یہی وہ وقت تھا جب برطانوی سامراج ہندوستانی ریاستوں کو فتح کرنے کے ساتھ ساتھ چین کے لوگوں کو بزور شمشیر افیمی بنانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے انیسویں صدی کے نصف تک ہزاروں من افیون چین میں زبردستی فروخت کی۔ چینیوں نے اپنی قوم کو اس موذی بلا سے بچانے کے لئے تین جنگیں لڑیں۔ پہلی جنگ وہ جیت گئے اور افیون کے بیس ہزار بکس جلا دیئے۔ لیکن تیسری جنگ وہ ہار گئے اور انہیں 6 لاکھ ڈالر تاوان ادا کرنا پڑا کیونکہ انہوں نے افیمی بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح لاکھوں چینیوں کو نہ صرف ناکارہ بنا دیا گیا بلکہ کروڑوں ڈالروں کی چاندی بھی چین سے باہر چلی گئی۔ عیسائیت کے فروغ اور تہذیب پھیلانے کے مشن کے جھوٹے اور جعلی نعروں کی آڑ میں سامراجی حملہ آوروں نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور نوآبادیاتی سلطنتیں قائم کر لیں۔ برطانیہ' جس نے سب سے زیادہ تہذیبی مشن منظم کرنے کا ڈھونگ رچایا' نے چار صدیوں میں دنیا بھر میں 240 جنگیں اس مشن کی تکمیل کے لئے لڑیں۔

برطانیہ نے اپنی نوآبادیات کے نوجوانوں کو مسلح کر کے مزید نوآبادیات کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہندوستان' مصر اور دوسری نوآبادیات کے بیس لاکھ سے زائد نوجوان برطانوی فوج میں بھرتی کئے گئے اور ان میں بے شمار نے نوآبادیاتی نظام کی آبیاری کے لئے جانیں قربان کیں۔

جب انیسویں صدی کے آخر میں فلپائن میں عوامی بغاوت پھوٹ پڑی تو امریکی سامراجی

فوجوں نے چھ لاکھ کے قریب لوگوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے آخر میں جب مڈغاسکر کے جزیرے کو فرانس کی فوجوں نے فتح کیا تو اس لڑائی کے دوران سات لاکھ مڈغاسکر کے باشندے مارے گئے۔

تیسری دنیا کے عوام کا گھمبیر المیہ ہے کہ جن سامراجی طاقتوں نے اپنی بہیمانہ لوٹ کھسوٹ سے ان کے ملکوں کو غریب اور نادار بنایا ہے' آج انہوں نے ایک ایسا طلسماتی نیا نوآبادیاتی نظام قائم کر لیا ہے کہ ان ملکوں کے پسماندہ اور مفلس لوگ ترقی یافتہ سامراجی ملکوں کی آغوش میں پناہ لے کر اپنی محنت بیچنے پر مجبور ہیں۔ وہ ان کی چکا چوند کر دینے والی تہذیب اور استحصالی طبقوں کی آسائشوں بھری زندگی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ وہ گرین کارڈ کی خاطر اپنا سب کچھ بھلا دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنا وطن' اپنا ماضی' اپنا تشخص اور اپنی پہچان کو کھو دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ سامراجی ملکوں کا پراپیگنڈہ جو ہزار طریقوں سے ان کے ذہنوں کو ماؤف کئے ہوئے ہے' انہیں نئی ذہنی غلامی میں جکڑے جا رہا ہے۔

انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ امریکی تہذیب جس کے وہ اس قدر دلدادہ ہیں اور جس کی صفات کے وہ دن رات گن گاتے نہیں تھکتے' افریقی حبشیوں کے خون اور ہڈیوں پر استوار ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چار صدیوں میں تقریباً 5 کروڑ افریقیوں کو غلام بنا کر امریکہ میں بیچ دیا گیا۔ اگر یہ تخمینہ لگایا جائے کہ غلاموں کے شکار کے دوران ہر پکڑے جانے والے افریقن کے ساتھ ایک افریقن مارا گیا تو ہم اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں (جو ایک سیاہ فام محقق وسیم ایڈورڈ ڈوڈائس نے لگایا ہے) یعنی اس تہذیبی مشن کے دوران 10 کروڑ افریقن شکار ہوئے اور یہ سب کچھ ایسے زمانہ میں ہوا جب سرمایہ دارانہ نظام کی نشوونما ہو رہی تھی اور جمہوریت اور مساوات کے نعرے لگ رہے تھے۔ تاریخی جبر نے فیوڈل ازم سے پہلے انسانوں کو غلام بنا دیا تھا۔ لیکن سرمایہ داری عہد میں غلاموں کو ذریعہ پیداوار بنانا نہایت ہی ظالمانہ اور کریہہ فعل تھا۔ آج کی امریکی ترقی اور تہذیب انہی بے بس اور مقہور انسانوں کے گوشت پوست پر تعمیر کی گئی ہے۔ جس امریکی رہنما نے آزادی کا شہرہ آفاق اعلان نامہ لکھا وہ خود آٹھ ہزار سے زائد غلاموں کا مالک تھا۔ لیکن آزادی کا یہ اعلان نامہ جو آج تک دنیا بھر کے دلوں کو گرماتا ہے' ان بے بس اور مجبور غلاموں کے لئے نہیں تھا کیونکہ انہیں

انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد تک نابرابری کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور آج بھی ہر شعبہ زندگی میں انہیں برابری اور عزت وقار حاصل نہیں ہو سکا۔ گو اب چند حبشیوں کو بڑے عہدوں پر متمکن کیا جانے لگا ہے لیکن جب بھی ایسا ہوتا ہے اسے انہونی بات سمجھا جاتا ہے۔

تیسری دنیا کی جدوجہد آزادی بہت بڑی اور ہمہ گیر کامیابیاں حاصل کر چکی ہے اور اس وقت تک 120 سے زائد محکوم ممالک آزاد ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی جنوبی افریقہ، فلسطین اور بے شمار چھوٹے چھوٹے جزائر استعمار پرستوں کے قبضہ میں ہیں، جہاں انہوں نے فوجی اڈے بنا رکھے ہیں۔ ابھی تک سیاسی طور پر آزاد ممالک میں بھی امریکی سامراج کے فوجی اڈے قائم ہیں۔ مثلاً کیوبا، جنوبی کوریا، تائیوان، فلپائن اور ڈیگو گارشیا وغیرہ۔ ابھی ان ملکوں کی جنگ آزادی نامکمل ہے۔

تیسری دنیا کے جن ملکوں نے آزادی حاصل کر بھی لی ہے وہ بھی ابھی تک سامراج کی معاشی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان کی سیاسی آزادیاں ہر وقت خطرے میں رہتی ہیں۔

آج تیسری دنیا کے عوام اور خاص طور پر نوجوانوں کے سامنے ایک سلگتا ہوا گھمبیر سوال یہ ہے کہ آیا وہ دنیا ختم ہو چکی ہے جس میں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک محکوم ممالک کے عوام کی ہزاروں سالوں کی محنت سے کمائی ہوئی دولت کو دونوں ہاتھوں سے طاقت کے بل بوتے پر کھلے بندوں لوٹ رہے تھے یا وہ لوٹ کھسوٹ اور استحصال آج بھی جاری ہے اور آیا تیسری دنیا کی آزادی کی جدوجہد کرنے والے عظیم رہنماؤں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی میدان میں مکمل آزادی کے خواب پورے ہو چکے ہیں۔ یا نہیں؟

آج ہم گرد و پیش میں نظر دوڑاتے ہیں تو تیسری دنیا میں بے شمار، خوش آئند تبدیلیوں اور ترقیوں اور نئی زندگی کی نشوونما کی نوید کے باوجود آج بھی اس کی پسماندگی، افلاس، جہالت اور بے بسی کے سربفلک، خوفناک اور سنگلاخ پہاڑ نظر آتے ہیں۔ آج جبکہ ترقی یافتہ دنیا کا انسان زہرہ اور مشتری پر کمندیں ڈال رہا ہے اور چاند پر اتر کر چہل قدمی کرتا ہے اور اس کی مٹی تجربات کے لئے زمین پر لاتا ہے، ہم چاند کے نظر آنے یا نہ آنے کی بے ثمر بحثوں میں سر پھٹول کرنے میں مصروف ہیں۔

سامراجی طاقتوں نے جنگ و جدل اور نہایت ہی بہیمانہ طریقوں سے تیسری دنیا کے عوام کو مغلوب کر کے براہ راست حکومتیں اس لئے قائم نہیں کی تھیں کہ ان ممالک کے عوام کو مہذب بنانا چاہتے تھے یا انہیں ان کے ساتھ پیار تھا اور ان کے چہرے انہیں اچھے لگتے تھے۔ بلکہ وہ حکومتیں لوٹ کھسوٹ کے جابر ہتھیار تھیں' آج سامراجی طاقتوں کی تیسری دنیا میں براہ راست حکومتیں تقریباً ختم ہو چکی لیکن انہوں نے لوٹ کھسوٹ کے پرانے ننگے اور ظالمانہ طریقے ختم کر کے نئے نئے طریقے اختیار کر لئے ہیں اور استحصال کا ایک مربوط اور ہمہ گیر قسم کا نظام قائم کر لیا ہے اور لوٹ کھسوٹ کے اس نئے نظام کو دوام بخشنے کے لئے نہایت ہی اعلیٰ درجے کے نئے جال اور پھندے بنا لئے ہیں جو بظاہر دیکھنے میں خوبصورت اور پرکشش نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے غیر مرئی شکنجے تیسری دنیا کے لوگوں کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں اور نظر نہ آنے والی سرنجوں کے ذریعے ان کا خون پہلے سے بھی زیادہ مقدار میں کشید کر رہے ہیں۔

ان نئے طریقوں میں سرفہرست پسماندہ ترقی پذیر ملکوں کی ترقی کے لئے مشروط سودی قرضے ہیں جو وہ مربی اور مہربان بن کر اپنی طاقتور ایجنسیوں' بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بنک اور ایسے ہی دوسرے اداروں کے ذریعے ترقی پذیر ملکوں پر نچھاور کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ جب یہ قرضے ملکی معیشت میں دخول حاصل کر لیتے ہیں تو پھر وہ معیشت کو قرضوں کے استعمال کا اس قدر عادی اور محتاج بنا دیتے ہیں کہ وہ ہیروئن کے نشے کے عادی کی طرح ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

یہ حقیقت ہے کہ پچھلے تین عشروں میں ترقی پذیر ملکوں کا قرضہ سو فیصدی بڑھ گیا ہے اور اس وقت تقریباً تین ٹریلین ڈالر سے تجاوز کر گیا ہے۔ 1985ء میں ترقی پذیر ملکوں کا کل قرضہ اندرون ملک قومی پیداوار کے 1/3 حصہ سے زائد ہو چکا تھا اور ان کی برآمدات اور خدمات کی قیمت سے تقریباً ڈیڑھ گنا تک پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ ترقی پذیر ملکوں کو اپنے قرضوں کی ادائیگی کے لئے بیرونی تجارت سے کمائی ہوئی دولت کا 1/3 یا نصف حصہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ان کے بیرونی قرضوں میں کمی نہیں ہو سکتی۔ صرف 1981ء میں قرضوں کی واپسی کے سلسلہ میں ترقی پذیر ملکوں کو 122 بلین ڈالر صرف کرنے پڑے۔ یہ قرضے برابر بڑھ رہے ہیں اور اگر یہ موجودہ حساب سے ہی بڑھتے رہے تو اسی صدی کے آخر تک تین بلین ڈالر

سے کہیں تجاوز کر جائیں گے۔

یہ بات ناقابل برداشت معلوم ہوتی ہے کہ 1990ء تک قرضوں کی ادائیگی ان ممالک کی کل برآمدات کا 40 فی صدی ہڑپ کر جائے گی۔ یہ صورت حال ان ممالک کے لئے نہایت ہی بھیانک نظر آتی ہے جو تیل درآمد کرتے ہیں' انہیں اپنے قرضے اور سود ادا کرنے کے لئے 80 فیصدی برآمدات کی آمدنی خرچ کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ درآمدات کے لئے اگر 1982ء میں 142 بلین ڈالر میسر آتے تھے تو 1990ء میں انہیں صرف 71 بلین ڈالر حاصل ہو سکیں گے۔

اگر اس صورت حال کا پوری طرح مقابلہ نہ کیا گیا تو بہت سے ترقی پذیر ممالک اپنی حقیقی آزادی کھو بیٹھیں گے۔

کیوبا کے انقلابی رہنما فیڈل کاسٹرو نے ہرارے میں منعقد ہونے والی غیر جانبدار ملکوں کی آٹھویں کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"قرضہ ایک نہایت ہی گھناؤنا اور بھیانک سرطان ہے۔ جس کے خلئے نہایت ہی تیزی سے نشوونما پاتے ہیں اور اپنے آپ کو بار بار وجود میں لاتے ہیں۔ یہ سرطان آخر میں بے حد و حساب بڑھ جاتا ہے۔" انہوں نے مزید کہا کہ "ایک دن ہم نے یہ اندازہ لگانے کے لئے فیصلہ کیا کہ لاطینی امریکہ کے بیرونی قرضے کو ایک ڈالر فی سیکنڈ کے حساب سے گنا جائے تو ایک شخص کو گنتی کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا' تو حساب کرنے پر معلوم ہوا کہ بارہ ہزار سال۔"

آج ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کے یہ مشروط سودی قرضے اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ وہ ترقی پذیر ملکوں کے سینوں پر سوار ہو کر ان کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور ترقی پذیر تیسری دنیا کے ممالک سانس لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور اپنی گلو خلاصی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

22- اگست 1989ء کے ہفت روزہ "دوست" میں تیسری دنیا کے قرض کے متعلق منعقد ہونے والی کانفرنس میں برازیل کے ایک مزدور رہنما کی تقریر کا حوالہ دیا گیا ہے' جس میں یہ کہا گیا ہے کہ "حقیقت یہ ہے کہ تیسری عالمگیر جنگ شروع ہو چکی ہے۔ یہ ایک خاموش جنگ ہے۔ لیکن اپنی خاموشی کی وجہ سے کوئی کم بھیانک نہیں ہے۔ [illegible] برازیل

لاطینی امریکہ اور عملی طور پر تیسری دنیا میں تباہی مچا رہی ہے۔ اس جنگ میں سپاہیوں کی جانوں کی جگہ بچے جان دے رہے ہیں۔ لکھو کھا زخمیوں کی جگہ لکھو کھا بے روزگاروں نے لے لی ہے۔ سڑکوں اور پلوں کی تباہی کی جگہ فیکٹریوں' سکولوں اور ہسپتالوں نے لے لی ہے اور پوری معیشتیں تباہ ہو رہی ہیں۔ یہ جنگ مغربی سرمایہ دار ملکوں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی امریکہ کے براعظم اور تیسری دنیا کے درمیان ہے۔ یہ جنگ غیر ملکی قرضوں کے متعلق ہے۔ اس کا بڑا ہتھیار سود ہے جو ایٹم بم اور لیزر شعاعوں کے ہتھیاروں سے زیادہ تباہ کن ہے۔

تیسری دنیا کے مزدور رہنما کے یہ خیالات مظلوم اور پسماندہ اقوام کے درد مند دانشوروں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان قرضوں نے جو تباہی مچا رکھی ہے اور جو آئندہ مچانے والے ہیں' اس کی عکاسی ایک کارٹونسٹ نے نہایت ہی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ اس نے تیسری دنیا کی حالت زار کا اپنے ایک کارٹون میں یوں نقشہ کھینچا ہے۔ کارٹون میں ایک شخص کو ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے پاس ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا پکڑے دکھایا گیا ہے۔ اس کاغذ پر صرف ایک لفظ لکھا ہے "قرضے۔" قریب کھڑے اپنے افلاس زدہ بھوکے بچوں کو مخاطب کر کے وہ کہتا ہے کہ "کسی روز یہ سب کچھ تمہارا ہو گا۔" یہ ایک نہایت ہی تلخ حقیقت ہے کہ تیسری دنیا کے لوگ اپنے ورثاء کے لئے صرف ایک ہی چیز پس انداز کر کے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں اور وہ ہے روز بروز بڑھتے ہوئے قرضے۔"

ترقی یافتہ سرمایہ دار ریاستوں کے ہاتھوں میں نئے حالات میں تیسری دنیا کے استحصال کے لئے تجارت بھی ایک بڑا ہتھیار ہے۔ ترقی یافتہ ممالک پس ماندہ ممالک کو اپنی مصنوعات نہایت ہی مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔ لیکن تیسری دنیا کے ممالک سے ان کا کچا اور نیم پکا مال سستے داموں خریدتے ہیں۔ نیز قرضوں کی آڑ میں انہیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ ان کی مصنوعات کی درآمد پر کوئی پابندی نہ لگائیں جبکہ اپنے ملکوں میں پسماندہ ممالک کی مصنوعات کی درآمد کے دروازے بند کر دیئے ہیں جس کے نتیجے میں ایک طرف تیسری دنیا کے ملکوں کی نوزائیدہ صنعتیں پنپ نہیں سکتیں اور انہیں مہنگے داموں ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کی مصنوعات خریدنی پڑتی ہیں۔

نامنصفانہ اور نابرابر تجارت کی وجہ سے پسماندہ ممالک عالمی تجارتی ترقی کی دوڑ میں بہت

پیچھے رہ گئے ہیں۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کے علاوہ تیسری دنیا کے ممالک کا عالمی برآمدات میں حصہ 1950ء میں 23ء6 فی صدی تھا۔ لیکن 1980ء میں کم ہو کر 11ء2 فی صدی ہو گیا۔ اگر بین الاقوامی تجارت کی موجودہ صورت قائم رہی تو تیسری دنیا کا مستقبل نہایت ہی تاریک نظر آتا ہے۔ موجودہ صورت حال کی بنیاد پر جو اندازہ لگایا گیا ہے' اس کے پیش نظر 1980ء تک پسماندہ ممالک کی معیشت کے لئے اپنے قرضوں کی ادائیگی نہایت مشکل ہو جائے گی۔

امریکہ کے سیکرٹری تجارت نے امریکی "امداد" مہیا کئے جانے کے مخالفین کا جواب دیتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا کہ "اکثر امداد اس شرط کے ساتھ مہیا کی جاتی ہے کہ اس سے امریکی اشیاء خریدی جائیں گی۔ چنانچہ 75 سے 80 فی صدی تک "امداد" امریکہ میں ہی خرچ کرنی ہوتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس انداز کے معاہدہ کے تحت میں پاکستان نے جو اشیاء امریکہ سے خریدیں ان کی قیمتیں عالمی منڈی سے 13ء5 فی صدی زیادہ تھیں۔ اگر امریکہ کی "امداد" غیر مشروط ہوتی تو پاکستان اس "امداد" سے چھ کروڑ ڈالر کی مزید اشیاء خرید سکتا تھا۔

1960ء میں 6ء3 ٹن تیل ایک ٹن چینی کی قیمت سے خریدا جا سکتا تھا۔ لیکن 1983ء میں ایک ٹن چینی کی قیمت سے صرف 0ء7 ٹن تیل خریدا جا سکتا ہے۔ 1959ء میں 24 ٹن چینی کی قیمت سے 60 ہارس پاور کا ٹریکٹر خریدا جا سکتا تھا۔ لیکن 1983ء میں 1.5 ٹن چینی ایک ٹریکٹر خریدنے کے لئے چاہئے۔ 1959ء میں 6 ٹن پٹ سن کے ریشے سے سات آٹھ ٹن کا ٹرک خریدا جا سکتا تھا۔ لیکن 1983ء میں اسی ٹرک کو خریدنے کے لئے 26 ٹن پٹ سن کا ریشہ درکار ہے۔ 1952ء میں ایک ٹریکٹر خریدنے کے لئے 1300 من گندم درکار تھی۔ لیکن آج وہی ٹریکٹر خریدنے کے لئے انتائیس صد من گندم درکار ہے۔

نئے آزاد ملکوں کا ہر سال مجموعی تجارتی نقصان دو ہزار ملین ڈالر سے تین ہزار ملین ڈالر کے برابر ہوتا ہے۔ امریکہ جو قرضے تیسری دنیا کو فراہم کرتا ہے' ان میں سے یہ ممالک صرف وہی مصنوعات خرید سکتے ہیں جو امریکہ چاہتا ہے اور وہ پسماندہ ممالک میں بنیادی اور بھاری صنعتیں لگانے کے لئے قرضے مہیا نہیں کرتا۔ ان قرضوں سے جو سامان پسماندہ ممالک خریدتے ہیں وہ امریکی جہازوں پر ہی لایا جا سکتا ہے۔ اور ان امریکی جہاز ران کمپنیوں کے

کرائے عالمی منڈی سے کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں اور پھر ان مشینوں کو نصب کرنے کے لئے امریکی ماہرین ہی کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہیں اور ان کی تنخواہیں اس قدر زیادہ ہوتی ہیں کہ منتقل شدہ وسائل کا ایک بڑا حصہ ان پر خرچ ہو جاتا ہے اور جو صنعت وجود میں آتی ہے وہ ہمیشہ فاضل پرزوں کے لئے ان ملکوں کی محتاج ہو جاتی ہے جن سے مشینری درآمد کی جاتی ہے۔ چنانچہ مشروط قرضوں کی وجہ سے نہ تو ہم خود کفیل ہونے کے لئے بنیادی صنعتیں لگا سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی مرضی سے عالمی منڈی سے مشینری خرید سکتے ہیں۔

سرمائے کی برآمد ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کے بنکوں اور کارپوریشنوں کے ہاتھ میں پس ماندہ ممالک کے استحصال کا ایک اور بہت بڑا ہتھیار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئے آزاد شدہ ممالک میں بیرونی سرمائے کی منتقلی ایک حد تک ان کی ترقی میں کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن بین الاقوامی کمپنیاں یہ راستہ ان کا قیمتی کچا مال حاصل کرنے، سستی محنت سے استفادہ کرنے، اپنی منڈیوں کو وسیع کرنے اور زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ بین الاقوامی کمپنیاں ترقی پذیر ملکوں سے منافع کی شکل میں اس سرمائے سے زیادہ منافع ترقی یافتہ ملکوں کو منتقل کر لیتی ہیں جو سرمایہ وہ ان ملکوں میں لگاتی ہیں۔

آج گیارہ ہزار بین الاقوامی کمپنیوں کی اسی ہزار شاخیں دنیا بھر میں قائم ہیں۔ وہ ترقی پذیر ملکوں کی کل پیداوار کے چالیس فیصدی حصے پر قابض ہیں اور تقریباً نصف تجارت پر حاوی ہیں اور عالمی سرمایہ دارانہ معیشت کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کا 80 فی صدی حصہ ان کی تحویل میں ہے۔ بین الاقوامی کمپنیوں نے ترقی پذیر ممالک کے بین الاقوامی استحصال کو ایک نئی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔

ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں دو ہزار ملین سے اڑھائی ہزار ملین ڈالر سالانہ بیرونی سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یعنی تین ہزار ملین ڈالر سالانہ ان ملکوں سے منافعوں کی شکل میں باہر لے جایا جاتا ہے۔

1970-80ء کے درمیان ترقی یافتہ ملکوں نے پسماندہ ممالک میں 62'000 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی لیکن اس عرصہ میں ان ملکوں سے 139'000 ملین ڈالر منافع باہر لے گئے۔ 1980ء کے عشرے میں بھی یہی حالت قائم ہے۔

اگر دوسری بین الاقوامی کمپنیاں بیرون ملک لگائے گئے سرمائے کے ہر ڈالر کے عوض

2ء2 ڈالر منافع حاصل کریں تو امریکی کمپنیاں 26ء4 ڈالر یعنی ان سے دو گنا زیادہ وصول کرتی ہیں۔

ان بین الاقوامی امریکی کمپنیوں نے نسلی بنیادوں پر بھی استحصال کے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ امریکی حکومت کے ایک مطالعہ کے مطابق 3547 کمپنیاں جن کے ملازمین کی تعداد دو کروڑ ساٹھ لاکھ تک ہے میں سے 63 لاکھ یعنی 28 فی صدی دوسرے ملکوں میں کام کرتے ہیں۔ ان ملازمین کی فی گھنٹہ اجرتیں حسب ذیل مقدار کے حساب سے دی جاتی ہیں:

امریکی مزدوروں کو 6ء8 ڈالر فی گھنٹہ۔

دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کو 34ء6 ڈالر فی گھنٹہ۔

ترقی پذیر ممالک کے مزدوروں کو 74ء1 ڈالر فی گھنٹہ۔

ہندوستان کے مزدوروں کو 37ء1 ڈالر فی گھنٹہ۔

فلپائن کے مزدوروں کو 57ء0 ڈالر فی گھنٹہ۔

ان اعداد و شمار سے واضح ہے کہ پسماندہ ممالک کے محنت کشوں کو نہایت ہی کم اجرتیں دے کر ایک طرف اربوں روپے منافع کمایا جاتا ہے۔ تو دوسری طرف ان ممالک کے مزدوروں کو گھٹیا سمجھ کر اجرت کم دے کر ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔

یہ کمپنیاں اشیاء کی قیمتوں میں ہیر پھیر سے ہر سال پسماندہ ممالک کو 50 سے 100 بلین ڈالر کا نقصان پہنچاتی ہیں۔ وہ سرمائے کے ارتکاز کی وجہ سے دنیا بھر کے استحصال کا سب سے بڑا ہتھیار بن چکی ہیں۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی پسماندہ ممالک کو ٹیکنالوجی کی برآمد بھی استحصال کا ایک نیا ہتھیار بن گئی ہے اور اس کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کی نوزائیدہ صنعتوں پر کنٹرول حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی ہے۔ ترقی پذیر ممالک بین الاقوامی کمپنیوں سے ٹیکنالوجی خریدنے میں تقریباً 40 بلین ڈالر سالانہ نقصان اٹھاتے ہیں۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک اپنی متروک شدہ ٹیکنالوجی کو ترقی پذیر ممالک میں منتقل کر کے ان کی سستی محنت سے اشیائے صرف کی پیداوار ترقی یافتہ ملکوں میں برآمد کرتے ہیں۔ صرف 1984ء میں 147 بلین ڈالر کی مصنوعات اپنے ملکوں میں درآمد کیں۔ اس طرح سرمایہ دار ممالک ٹیکنالوجی کے میدان میں نئی نئی دریافتوں اور ایجادات کے لئے مواقع حاصل کرتے

ہیں اور پسماندہ ممالک پسماندگی کے گرداب میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک نے ترقی پذیر ممالک کے عوام کو الیکٹرانک نوآبادیاتی نظام میں جکڑ لیا ہے۔ اپنی جدید ٹیکنالوجی کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ الیکٹرانک اشیاء کی برآمد کے ذریعے ایسے سماجی' نظریاتی اور سیاسی ماحول کو جنم دیتے ہیں کہ ان ملکوں کے لوگ غیر شعوری طور پر محتاج تعلقات کو قبول کر لیتے ہیں۔

آج پسماندہ ترقی پذیر ممالک کے پڑھے لکھے تربیت یافتہ نوجوان ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں' خصوصاً امریکہ' مغربی جرمنی' برطانیہ اور جاپان کے ویزے حاصل کرنے کے لئے قطاریں بنائے کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر بھی ہیں' انجینئر بھی' سائنس دان بھی اور سکلڈ ورکر بھی۔ مغربی سرمایہ دار ملکوں کی چکا چوند کر دینے والی تہذیب اور آسائشوں کے متعلق ذہنوں کو ماؤف کر دینے والا پراپیگنڈہ ایک ایسا جادو ہے کہ یہ نوجوان اپنی دھرتی کو چھوڑ دینے پر کمربستہ ہیں۔ کیونکہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں ان کی مادر وطن انہیں زندگی کی ادنیٰ سی بھی آسائشیں مہیا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ وہ صدیوں کے مسلسل استحصال سے کمزور' بانجھ اور پسماندہ ہو گئی ہے۔ جن تہذیبوں کو ان کے خون نے جلا بخشی ہے' یہ نوجوان اسی کی زلف گرہ گیر کے گرفتار نظر آتے ہیں۔ یہ نئے نوآبادیاتی ثقافتی نظام کا کرشمہ ہے کہ سرمایہ دار ریاستیں ترقی پذیر ملکوں کے دانشوروں کو گرویدہ بنانے کے لئے بہت پاپڑ بیلتی ہیں۔

1970ء میں دنیا کے چالیس سے زیادہ صدور اور وزرائے اعظم امریکہ نواز سیاستدان تھے جو امریکی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے۔ چلی کی جس فوج نے صدر الاندے کی جمہوری حکومت کا خاتمہ کیا' اس کے 68 فی صدی آفیسر امریکہ کے تربیت یافتہ تھے۔ 1970ء میں جن فوجی افسروں نے ذوالفقار علی بھٹو شہید کی منتخب حکومت کا تختہ الٹا اور اسے تختہ دار پر لٹکایا وہ بھی زیادہ تر امریکی تربیت گاہوں میں تربیت حاصل کر چکے تھے۔

المیہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک' پسماندہ ممالک کے جن تربیت یافتہ پرسونل کو اپنے ملکوں میں منتقل کرتے ہیں' ان کی تربیت پر وہ کچھ خرچ نہیں کرتے ان کی تربیت پس ماندہ ممالک کے خزانے سے ہی ہوتی ہے اور اس خرچ کا بوجھ ان ممالک کے غریب عوام پر پڑتا ہے۔ اس طرح امریکہ کو ہر سال ایک بلین ڈالر کی بچت ہوتی ہے۔ 1980ء کے وسط تک ایسی بچت 30 بلین ڈالر تک پہنچ چکی تھی۔

1960ء سے 1980ء تک کے درمیان 5 لاکھ سے زائد ماہرین ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ سے نقل مکانی کر کے سرمایہ دار ملکوں میں منتقل ہو گئے۔ ان میں سے تین چوتھائی امریکہ' کینیڈا اور برطانیہ میں گئے۔ ثقافتی استحصال کا یہ نہایت ہی خوشنما طریقہ ہے۔ ایک امریکی محقق نے لکھا ہے کہ "ایک طرف امریکہ لاکھوں ڈالر نئی ریاستوں کو ترقی کے لئے دیتا ہے اور دوسری طرف ایسے تربیت یافتہ لوگوں کو ان ملکوں سے لے جاتا ہے' جو ان ملکوں کی سائنس' ٹیکنالوجی اور طب میں بہت بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یقیناً یہ خوراک وغیرہ سے زیادہ اہم ہے۔ اس طرح یہ نئی ریاستیں ہر سال 5 بلین ڈالر کا نقصان اٹھا رہی ہیں۔

ماہرین کے ایک اندازے کے مطابق پسماندہ ممالک کے ماہرین کو مختلف ترغیبات سے امریکہ میں منتقل کرنے سے دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے ایک ٹریلین ڈالر سے زائد منافع کمایا ہے۔

سامراجی طاقتیں اپنی عظمت کو قائم رکھنے اور اسے نئی بلندیوں تک پہنچانے کے لئے دوسری جنگ عظیم کے بعد مختلف حربوں سے جنگی فضا قائم کئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں امریکی سامراج نے دنیا بھر میں فوجی اڈے قائم کر رکھے ہیں اور ان اڈوں میں ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہزاروں کی تعداد میں امریکی فوجی تعینات ہیں۔ یہ جنگی فضا ترقی پذیر ملکوں کے بین الاقوامی معاشی تعلقات پر منفی اثرات ڈالتی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے بیرونی قرضہ جات بڑھتے جاتے ہیں۔

سامراجی انگیخت پسماندہ ممالک کے درمیان جنگوں کو جنم دیتی ہے۔ جیسے ایران اور عراق کے درمیانہ جنگ' فلسطین اور لبنان کے خلاف اسرائیل کی غیر اخلاقی جنگ' افغانستان کی جنگ' سامراجی طاقتیں اپنے مفادات کے حصول اور سامراجی بالادستی کو قائم رکھنے کے لئے براہ راست حملوں سے بھی اجتناب نہیں کرتیں۔ جیسا کہ فاک لینڈ کے خلاف برطانوی حملہ' گریناڈا پر امریکی حملہ' لیبیا پر امریکی بمباری اور لبنان میں امریکی بحری فوجوں کا داخل ہونا۔

ایسی جنگی فضا پس ماندہ ممالک کو اپنے بجٹ کا زیادہ سے زیادہ حصہ اسلحہ کی درآمد یا اسلحہ بنانے پر خرچ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر 1979ء کو بنیادی سال قرار دیں تو 1972ء میں تیسری دنیا کے ممالک کے فوجی اخراجات 33 بلین ڈالر تھے۔ 10 سال بعد 1981ء میں یہ اخراجات 81 بلین ڈالر سے تجاوز کر گئے اور عالمی اخراجات کا سولہ فی صدی ہو گئے ہیں۔

اسلحہ سازی کی دوڑ کے ساتھ ساتھ اسلحہ کی تجارت میں بے انداز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ 1980ء میں اسلحہ کی تجارت کی مالیت تقریباً 26 بلین ڈالر ہو گئی۔ اس تجارت کا تقریباً تین چوتھائی ترقی پذیر ملکوں کے اسلحہ اور جنگی ساز و سامان کی درآمدات کا ہے۔ حالیہ اندازوں کے مطابق اگر 1975ء کو بنیادی سال قرار دیا جائے تو 1970ء میں یہ تجارت 3 بلین ڈالر کی تھی۔ لیکن 1980ء میں بڑھ کر 9 بلین ڈالر ہو گئی یعنی دس سالوں میں دو صد فی صدی بڑھ گئی۔ موجودہ قیمتوں کے حساب سے پسماندہ ممالک نے 1980ء میں 19ء5 بلین ڈالر کا اسلحہ درآمد کیا۔

ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ہر منٹ میں پندرہ لاکھ ڈالر فوجی ضروریات پر خرچ ہوتے ہیں اور اسی ایک منٹ میں پسماندہ ملکوں میں خوراک یا ادویات کی عدم دستیابی کی وجہ سے تیس بچے مر جاتے ہیں۔ صرف تین عشرے پہلے سرمایہ دار ترقی یافتہ اور پسماندہ ملکوں کی کل قومی پیداوار کی نسبت دس اور ایک کی تھی۔ ستر کے عشرے میں یہ نسبت تیرہ اور ایک کی ہو گئی اور اب تقریباً چودہ اور ایک کی ہے۔ کچھ اندازوں کے مطابق یہ نسبت پچیس اور ایک اور چالیس اور ایک بھی ہو سکتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک کی کمزور معیشت کے لئے اسلحہ کی خریداری بہت بڑا بوجھ ہے۔ یہ تجارت بانجھ اور غیر پیداواری ہے۔ درآمد کرنے والے ممالک کو اسلحہ کی تجارت اس کے اپنے وسائل سے محروم کر دیتی ہے۔ جو دوسری پیداواری سرگرمیوں میں خرچ ہو سکتے ہیں۔ اسلحہ کی درآمد نہ تو زیادہ پیداوار کرنے میں مدد دیتی ہے اور نہ ہی زیادہ کھپت میں اور نہ ہی مستقبل میں پیداوار کا ذریعہ بنتی ہے۔ تاکہ ان کے قرضوں کی ادائیگی کی جا سکے۔ وہ کسی طرح بھی عوام کی صحت، تعلیم اور ثقافت کی ترقی میں مددگار ثابت نہیں ہوتی۔

یہ بات حتمی طور پر ثابت ہے کہ ہر ڈالر جو اسلحہ کی خریداری کے لئے خرچ ہوتا ہے۔ قومی سرمایہ کاری میں 25 فیصدی کی کمی کا موجب بنتا ہے۔ باوجودیکہ عالمی سرمایہ داری نظام نے اپنے حریف سوویٹ یونین کو شکست دے دی ہے اور اب جدید اسلحہ بنانے کی ضرورت نہیں رہی لیکن امریکہ اور دوسرے سرمایہ دار ملک اب بھی جدید سے جدید اسلحہ بنانے کی دوڑ میں مصروف ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ وہ عالمی امن کے قیام پر یقین نہیں رکھتے اور ان کی پالیسیاں پھر جنگی فضا کو جنم دیں گی۔

آج پسماندہ ترقی پذیر ملکوں کی فی کس آمدنی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کی فی کس امدنی کی نسبت تیرہ فی صد کم ہے اور پس ماندہ ممالک میں تقریباً 75 کروڑ انسانوں کو پوری خوراک میسر نہیں آتی۔ 80 کروڑ بالغ ان پڑھ ہیں۔ 25 کروڑ بچے سکول نہیں جا پاتے۔ 1ء5 بلین کو علاج معالجہ کی سہولتیں یا تو بالکل حاصل نہیں ہیں یا بہت کم ہیں اور اس صدی کے آخر تک ان لوگوں کی حالت بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

ان حقائق سے ظاہر ہے کہ پس ماندہ ترقی پذیر ممالک کی دولت اور وسائل کو پرانی سامراجی طاقتیں جدید طریقوں سے لوٹنے میں اسی طرح مصروف ہیں جیسا کہ ان کی آزادی سے پہلے تھیں اور اگر پسماندہ ممالک میں کچھ ترقی ہو رہی ہے تو وہ محتاج ترقی ہے' جو ان ملکوں کی ترقی کو اس ڈھب سے ترتیب دے رہے ہیں کہ وہ بدستور ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کے دست نگر رہیں یا زیادہ سے زیادہ ان ملکوں کے چند ہزار گھرانے بین الاقوامی تجارتی کمپنیوں کے جونیئر ساجھے دار بن کر اس لوٹ کو دوچند کر رہے ہیں۔

تیسری دنیا کے عظیم رہنماؤں نے ان ملکوں کی پسماندگی اور افلاس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے حقیقی مسئلے کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے۔

صدر سیکارنو نے کہا۔ "سامراج کے طویل غلبے کی وجہ سے ہم پسماندہ بن گئے ہیں۔ ہماری پسماندگی قدرتی نہیں' یہ مصنوعی پسماندگی ہے جو ہم پر صدیوں سے ٹھونسی گئی ہے۔"

جواہر لعل نہرو نے کہا کہ "تقریباً ہمارے بڑے مسائل برطانوی سامراج کی بالادستی اور ان کی استحصالی پالیسی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ صنعتوں کا نہ ہونا' زراعت کی طرف عدم توجہی' سماجی خدمات کی خصوصی کمی اور خاص طور پر ہمارے عوام کی المناک غربت۔" ایضاً۔

جمال عبدالناصر نے کہا کہ۔ "سابقہ سامراجی ملکوں کے لئے افریقی ملکوں کی امداد کرنا ان کا فرض ہے۔ یہ اس لوٹ کھسوٹ کا بدل ہے جو وہ کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔" ایضاً۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کی عالی شان تہذیب کی سرخی اور غازہ آج بھی پسماندہ ترقی پذیر ممالک کے خون سے رنگ پکڑے ہوئے ہے اور فوری طور پر ان پھندوں اور جکڑ بندیوں سے نجات کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ ہمیں جتنا اس لوٹ کا احساس ہوتا ہے' اتنا ہی ہم اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مقدر میں پسماندگی' دست

نگری، غلامی اور افلاس کی زندگی ہی لکھی ہے۔ لیکن یہ صورت حال اب اس قدر تکلیف دہ ہوتی جا رہی ہے کہ مشروط قرضوں، محکوم تجارت اور محتاج ترقی کے پھندوں کے انار پھینکنے کے لئے دن بدن آوازیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں۔ قرضوں کی ادائیگی کی قسطیں اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ انہیں ادا کرنا پس ماندہ ممالک کی معیشت کے بس کا روگ نہیں اور اگر وہ ادا نہ کر سکیں تو عالمی معیشت نہ حل ہونے والے بحران میں پھنس کر رہ جائے گی۔ قرضے دینے والی عالمی اداروں کو بھی مستقبل میں یہ تباہی صاف نظر آ رہی ہے۔ چنانچہ وہ قرضوں کی وصولی التواء میں رکھنے اور کچھ حصے معاف کرنے کی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ تیسری دنیا ان سے کوئی خیرات نہیں مانگتی۔ پسماندہ ممالک اپنا حق مانگتے ہیں۔ وہ یہ مطالبہ کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ پسماندہ ممالک کی صدیوں کی لوٹ کا کچھ حصہ انہیں لوٹا دیا جائے۔ وہ دن دور نہیں جب تیسری دنیا کے لوگ اس نئے نظر نہ آنے والے جوئے سے گلو خلاصی پا لیں گے۔

ہم نے مختصر الفاظ میں نو آبادیاتی نظام اور دوسری جنگ عظیم کے بعد نئے نو آبادیاتی نظام کے عمل سے پیدا ہونے والے کچھ تلخ حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور تیسری دنیا کے پسماندہ، محکوم اور نو آزاد ممالک کی پسماندگی، افلاس اور غربت کی وجوہات کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے۔

پاکستان بھی تیسری دنیا کا ایک اہم ملک ہے۔ جس کی آبادی چودہ کروڑ کے قریب ہے اور وہ نہایت ہی اہم سماجی اور جغرافیائی سٹریٹیجک اہمیت کا حامل ہے۔ عالمی سامراجی طاقتوں اور ان کے بنکوں اور کارپوریشنوں کی لوٹ مار اور استحصال کی نئی پالیسیوں نے جن کا ہم نے جائزہ لیا ہے، پاکستان کی معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی کو بھی اسی طرح اپنے خونیں شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے جس طرح دنیا کے دوسرے پسماندہ ممالک کو۔ بلکہ پاکستان اس وقت ان چند ملکوں میں سے ایک ہے جنہیں امریکی نوازشوں کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور اسرائیل اور مصر کے بعد سب سے زیادہ اس کی امداد کی جاتی ہے اور اس کو زیادہ قرض دیا جاتا ہے۔

ایوب خان، اسکندر مرزا اور غلام محمد اور دوسری افسر شاہی نے قرضوں اور فوجی امداد کے عوض پاکستان کی حاکمیت بھی گروی رکھ دی تھی۔ اسے بغداد پیکٹ، سیٹو اور سنٹو کے فوجی معاہدوں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ پشاور کے قریب بڈبیر میں امریکی جاسوسی اڈہ قائم کروایا تھا،

جہاں پاکستان کی سب سے بڑی شخصیت بھی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ ایوب خاں کے دور میں پاکستان کی معیشت مکمل طور پر امریکی سامراج کی محتاج معیشت کے طور پر نشوونما پاتی رہی اور پاکستان کے اسی فیصدی اثاثوں پر بیس بائیس گھرانے قابض ہو گئے۔ اس دور میں صنعتی ترقی ضرور ہوئی لیکن وہ محکوم صنعتی ترقی ہی رہی۔ پاکستانی معیشت کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے قطعاً" مدد نہ کی گئی اور بنیادی اور بھاری صنعتیں قائم کرنے کی بجائے ایسی صنعتیں قائم کی گئیں جو پرزوں اور کچے مال کے لئے بھی بین الاقوامی کمپنیوں کی دست نگر تھیں اور اپنے نیم پختہ مال (دھاگے اور لونگ کلاتھ) وغیرہ کی نکاسی کے لئے بھی ان کا دار و مدار انہی بیرونی کمپنیوں پر تھا۔

ان حالات کے خلاف 1968ء میں ایک عظیم اور ہمہ گیر عوامی تحریک پھوٹ پڑی جس نے بھٹو شہید کی رہنمائی میں ایوبی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ملک کا کونہ کونہ امریکی سامراج دشمن نعروں سے گونج اٹھا۔ 1970ء کے انتخابات مولویوں کے فتوؤں اور رجعت پسندوں کی یلغار کے باوجود پیپلز پارٹی نے روٹی، کپڑا، مکان اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں، کے ولولہ انگیز نعروں کے جلو میں جیت لئے۔ بائیس خاندانوں کی اجارہ داری توڑنے کے لئے بڑی بڑی صنعتوں اور بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا، زرعی اصلاحات کی گئیں، دیہات میں غریبوں کو 5 مرلہ سکیم کے تحت گھر بنانے کے لئے اراضی دی۔ لیکن پیپلز پارٹی کی کچھ سیاسی کج رویوں اور پیپلز پارٹی کے تنظیمی فقدان نے رجعت پسند طاقتوں کو اس کے خلاف برسرپیکار کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ طاقتیں جو قدرتی طور پر پیپلز پارٹی کی حلیف ہو سکتی تھیں وہ بھی مخالف صفوں میں چلی گئیں۔ یا غیر جانبدار ہونے پر مجبور ہو گئیں۔ ان حالات میں 1977ء میں جمہوریت کے نام پر رجعت پسند تحریک وجود میں آئی جس کی پشت پناہی امریکی سامراج کر رہا تھا۔

راولپنڈی کے بازاروں میں بھٹو شہید نے ایک کاغذ کے سفید پرزے کو لہراتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ اسے ایک سفید ہاتھی روندنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سفید ہاتھی کے ایک مہابت ہنری کسنجر نے کچھ عرصہ پہلے دھمکی دی تھی کہ اگر ایٹمی طاقت پیدا کرنے سے پاکستان باز نہ آیا تو اس کے نتائج بہت برے ہوں گے۔

یہ سفید ہاتھی اسی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ جنہوں نے مغل شہزادوں کے بریدہ سر

بہادر شاہ ظفر کو تحفہ کے طور پر پیش کئے تھے- یہ سفید ہاتھی اسی نسل سے تعلق رکھتا تھا' جس نے کلکتہ پر یلغار کر کے اندھی لوٹ مچائی تھی اور سراج الدولہ کا چراغ گل کیا تھا- ٹیپو سلطان کو شہید کیا تھا- اسی سفید ہاتھی کے پیش روؤں نے افریقہ کے دس کروڑ بے بس انسانوں کا شکار کیا اور 5 کروڑ کو غلام بنا کر امریکی جدید تہذیب کی بنیاد رکھی-

اور آج یہ ہاتھی پسماندہ دنیا کی لوٹ مار کی رسہ کشی میں بینڈھی والا ہاتھی کا کردار ادا کر رہا ہے اور تمام استحصال کا منبع اور محافظ بنا ہوا ہے- اس ہاتھی نے بھٹو شہید کو پاؤں تلے روند دیا اور پاکستان کی لوٹ کھسوٹ کو دوچند کر دیا-

بین الاقوامی کارپوریشنوں' بنکوں اور امریکی سامراج کے تحت چلنے والے اداروں نے 1980ء سے 1988ء تک 74 بلین ڈالر پاکستان سے باہر منتقل کئے- ان میں سے تیس بلین ڈالر کے قریب وہ رقم تھی جو قرض کے طور پر ملی تھی اور تقریباً پونے 52 بلین ڈالر کی رقم پاکستان کی برآمدات اور بیرون ملک پاکستانی ملازمین کی بھیجی ہوئی رقم پر مشتمل تھی- یہ تو وہ رقم تھی جو سرکاری اور قانونی ذرائع سے باہر منتقل کی گئی- اس کے علاوہ نجانے کتنا اور سرمایہ غیر قانونی اور ناجائز طریقوں سے باہر منتقل کیا گیا-

1970-74ء اور 1977-78ء کے درمیان ہر سال 3445 ملین ڈالر سالانہ سرمایہ پاکستان سے باہر منتقل ہوا- لیکن ضیاء کی آمریت کے دور میں اس رقم میں بے انداز اضافہ ہو گیا- حتیٰ کہ 1980-86ء تک 10 بلین اور بانوے ملین ڈالر تک پہنچ گیا-

1979-80ء کے دوران پاکستان کے قرضوں میں 4364 بلین ڈالر کا اضافہ ہو گیا- 1986-87ء میں پاکستان کو 1389 ملین ڈالر قرضہ ملا- اس میں سے 1101 ملین ڈالر قرضے اور سود کی ادائیگی پر صرف کرنا پڑی- یعنی 78 فی صدی-

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے تراشے ہوئے راستے پر چل کر جو نتائج نکلتے ہیں- وہ پاکستانی معیشت کے لئے نہایت ہی خوفناک ہیں- پاکستان سٹیٹ بنک کی رپورٹ کے مطابق 1979-80ء اور 1982-83ء کے چار سالوں کے دوران پاکستان نے 1.62 میٹرک ٹن کپاس 1447 ملین ڈالر کے عوض برآمد کی- اس کے بعد ہم نے اپنے روپے کی قیمت کم کر دی اور کپاس کی پیداوار بڑھا دی اور 1983-84ء اور 1987-88ء کے دوران 55 فی صدی زائد کپاس پیدا کی- لیکن برآمدات کی قیمت 35 فی صدی کم ہو گئی-

درآمدات کی مد میں اس کے بالکل الٹ ہوا۔ 80-1979ء اور 83-1982ء کے درمیان ادویات، ٹرانسپورٹ اور مشینری کی درآمدات کا بل 5531 ملین ڈالر سے بڑھ کر 6861 ملین ڈالر تک پہنچ گیا۔

1977ء کے مارشل لاء سے پہلے چار سالوں میں پاکستان میں لگائے ہوئے سرمائے کا منافع اوسطاً" 182 ملین ڈالر ملک سے باہر چلا گیا۔ لیکن یہ رقم 87-1983ء میں بڑھ کر 892 ملین ڈالر تک پہنچ گئی۔ (ہفت روزہ دوست)

اس وقت ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں ادویات، چائے، سگریٹ کی پیداوار کا تقریباً اسی نوے فیصدی بیرونی سرمایہ دار کمپنیوں کے قبضے میں ہے۔ مشروبات کی پیداوار کا 95 فیصدی بیرونی ملکیت میں ہے اور ہر سال پاکستان کی منڈی کے دروازے بین الاقوامی کمپنیوں کی مصنوعات کی درآمد کے لئے مزید کھول دینے کی شرط عائد کر دی جاتی ہے اور پاکستان کی مارکیٹوں میں بدیشی سامان تعیش کی ریل پیل نظر آتی ہے۔ پبلک سیکٹر کی صنعتوں کو نجی شعبے میں دینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ بلکہ اسے قرض دینے کے ساتھ ساتھ مشروط کر دیا جاتا ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کے اندر عوام کی بہبود اور خدمات پر خرچ ہونے والی رقوم میں کمی کے لئے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ کھاد، بجلی، گیس، پانی اور تیل کی قیمتوں میں اضافہ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ سب سڈیز ختم کرنے کے لئے کہا جاتا ہے اور اس طرح مہنگائی بڑھا کر عوام کے خون کا آخری قطرہ تک کشید کر لیا جاتا ہے۔

پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ اس کی تمام تر صنعتی ترقی، محتاج صنعتی ترقی کے زمرے میں آتی ہے۔ سوائے ان چند صنعتوں کے جو سوشلسٹ ممالک کی مدد سے وجود میں آئی ہیں۔ ضیاء الحق کے گیارہ سالہ مارشل لاء دور میں بائیس کی بجائے سینکڑوں ارب پتی گھرانے وجود میں آ گئے ہیں۔ منشیات کے درجنوں ارب پتی تاجروں اور سمگلروں اور جعلسازوں نے جنم لیا ہے اور ان میں سے بیشتر اسمبلیوں میں طاقت ور گروپوں کے "دادا" بنے ہوئے ہیں اور حکومت کی تمام مشینری کو مفلوج کئے ہوئے ہیں۔ رشوت قدم قدم پر مورچے جمائے بیٹھی ہے۔

ایسے غلامانہ اور محتاج تعلقات کے بل بوتے پر پاکستان کے علاقے کو افغانستان میں خانہ

جنگی جاری رکھنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اور پاکستان کی سرزمین سے صرف ہتھیار ہی افغانستان میں سپلائی نہیں کئے جاتے بلکہ پاکستانی عوام کو جھوٹے اور جعلی پراپیگنڈے کے ذریعے افغانستان میں نام نہاد جہاد کے لئے لڑنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ امریکی سامراج کے بین الاقوامی مفادات کے حصول میں آسانی ہو اور پاکستان مشروط قرضوں اور نابرابری کے تعلقات میں بندھا رہے اور اپنی تجارت اور خارجہ پالیسی کو آزاد راہوں پر مرتب نہ کر سکے۔

نئی جمہوری حکومت نے اندرونی رجعت پسندوں کی قدم قدم پر کھڑی کی ہوئی رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے مسند اقتدار حاصل کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جمہوریت کو مضبوط کرنے کے لئے بے شمار اقدامات کئے ہیں۔ بین الاقوامی اور ملک کے اندر بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر' امریکی سامراج بھی جس نے جمہوریت کو ذبح کرنے اور ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار تک پہنچانے میں رجعتی طاقتوں کا ساتھ دیا تھا' آج جمہوریت کی بحالی کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے مفادات کے حصول کے لئے بیک وقت کئی گھوڑوں پر سوار رہتا ہے اور کسی وقت بھی پینترا بدل سکتا ہے۔

بھٹو کے جانشینوں کا فرض ہے کہ وہ بھٹو کے ان الفاظ کو کبھی نہ بھلائیں جو اس نے راولپنڈی کے بازاروں میں سفید ہاتھی کے متعلق کہے تھے اور وہ ان الفاظ کو بھی اپنے سامنے رکھیں' جو بھٹو نے آج سے ترپن سال پہلے کہے تھے کہ "ہزایکسی لینسی اس لئے خوبصورت ہیں کہ ان کی پرورش ہمارے ملک کے خون سے ہوئی ہے۔"

ملک کی ترقی اور جمہوریت کا راستہ نہایت ہی پرپیچ اور دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرتا ہے اور ان راستوں کے ہر موڑ پر جمہوریت کے مخالف اور عوام کے دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں اور قدم قدم پر جھوٹ اور افترا کی مائنز دبائے ہوئے ہیں اور ہر غلط چال پر انہیں استعمال کر رہے ہیں۔

بھٹو کے جانشینوں کو جان لینا چاہئے کہ ملک کی ٹھوس ترقی کے لئے مشروط قرضوں سے گلو خلاصی ضروری ہے۔ آزاد خارجہ پالیسی' بین الاقوامی امن اور تمام ہمسایوں سے برابری کی سطح پر دوستی' ترقی کے لئے اولین اقدامات ہیں۔ جاگیرداری نظام کا خاتمہ' سمگلر مافیا کے خلاف یلغار' جعلسازوں اور رشوت خوروں کا قلع قمع' جمہوریت کے پودے کی نشوونما کے لئے آب حیات ہے۔ پبلک سیکٹر کی صنعتوں کو محنت کشوں کے تعاون سے منافع بخش بنانا چاہئے۔ عالمی

مالیاتی فنڈ کی تجاویز پر عمل کرتے ہوئے نجی شعبہ کے حوالے نہیں کرنا چاہئے۔ نجی شعبہ میں صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرنا چاہئے۔ گھریلو صنعتوں کی پوری امداد کرنی چاہئے اور چھوٹے سرمایہ داروں کو پورا تحفظ دینا چاہئے۔

محنت کشوں اور دیہات کے غریبوں کی مفلسی اور جہالت کے خاتمہ کے لئے مربوط سکیموں پر عمل کرنا چاہئے۔ تعلیم اور صحت کے لئے وافر فنڈ مہیا کرنا چاہئے۔

ان تمام کاموں کے لئے سامراجی اداروں سے قرضوں میں چھوٹ کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ یہ صدیوں سے جاری استحصال کا معمولی سا معاوضہ ہو گا۔ بین الاقوامی سطح پر باہمی مفادات پر مبنی تیسری دنیا کے مطالبات کی حمایت کرنی چاہئے۔ قیام امن کے لئے جدوجہد میں حصہ لینا چاہئے اور باہمی مصالحت سے مسائل کے حل کے لئے اقدامات کرنے چاہئیں۔

چونکہ ہماری معیشت کو اس نہج پر استوار کیا گیا ہے کہ ہم سامراجی مشروط قرضے لینے پر مجبور ہیں اور ان کے بغیر ترقی کرنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ اس لئے ایسے حالات میں جو قرضے حاصل کئے جاتے ہیں ان کا صحیح استعمال ضروری ہے۔ نوکر شاہی اور بڑے بڑے سرمایہ دار ان قرضوں سے ناجائز فائدے حاصل کرتے ہیں اور ان کا بوجھ عوام کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان قرضوں کا استعمال اس طرح کیا جائے کہ جلد از جلد ہماری معیشت ان سے گلو خلاصی حاصل کر سکے۔ ان کے ناجائز استعمال کی فوراً روک تھام ضروری ہے۔

لیکن ان تمام مسائل کے حل کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے اندر تمام جمہوری طاقتوں کو متحد کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد اور ایثار و قربانی سے کام لیا جائے اور اپنی صفوں کو شعور کی بنیادوں پر متحد اور منظم کرنا چاہئے۔

آج کے حالات میں تیسری دنیا کی معاشی اور سماجی تحریک آزادی کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنے کے لئے یہی ایک راستہ ہے۔

ضمیمہ

پینٹاگان کا نیا عالمی نظام

گذشتہ صفحات میں نئے عالمی نظام کے حوالے سے ہم نے امریکی بالادستی کے بارے میں جو بحث کی ہے' اس کا ثبوت پینٹاگان کے نئے عالمی نظام کے منصوبے سے مل سکتا ہے۔ یہ منصوبہ امریکہ کو واحد سپر پاور کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اقتصادی اعتبار سے مسلسل زوال کی طرف بڑھتے ہوئے "عظیم امریکی مملکت" اپنی چیرہ دستیوں کے نئے جال کے ساتھ موجود ہے۔ منصوبے کی تفصیلات امریکی اخبار ہیرالڈ ٹریبیون میں شائع ہوئی ہیں۔ قاری کی سہولت کے لئے ہم اس رپورٹ کو من و عن شائع کر رہے ہیں۔

پاکستان میں ڈالر کی یلغار

اپنے ہاتھ میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ لئے ہوئے پاکستان کا ہردلعزیز اور عظیم دانشور وزیراعظم 1977ء میں راولپنڈی کے بازاروں میں چیخ چیخ کر انکشاف کر رہا تھا کہ ایک سفید ہاتھی اس کا پیچھا کر رہا ہے اور اسے اپنے پاؤں تلے روندنا چاہتا ہے۔ یہ سفید ہاتھی آخرکار دائیں بازو کی تمام ان قوتوں کی مدد اور اعانت سے اسے روندنے میں کامیاب ہو گیا۔ جو بعد میں مارشل لاء کے سیاہ ترین دور میں ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں عوام کو کچلنے اور پاکستان کے آئین کو ختم کرنے کے لئے ہتھیار بن گئیں۔ یہی قوتیں آج سامراجی جھکڑ کے خلاف گلہ پھاڑ کر چلا رہی ہیں۔ جس نے شیطانی رفتار کے ساتھ اپنے پاؤں جمانے کے لئے ہمارے ساحلوں پر حملہ کر دیا ہے۔ وزیراعظم اور تمام بڑے بڑے لوگ اور بوجھ بجھکڑ دانشور اس اعلان کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں کہ امریکی سرمایہ داروں نے بجلی کے شعبے میں پاکستان میں 4 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کے لئے سمجھوتے پر دستخط کر دیئے ہیں۔ یہ اقدام پاکستان کی معیشت کو سنبھالہ دینے کے لئے بہت ضروری تھا۔ انہوں نے اس قدر سرمایہ کاری کے لئے پاکستان کے مغربی ساحل، کراچی کے اردگرد کے علاقہ کو منتخب کیا ہے۔ شہید بھٹو کی عظیم دختر اپنی منفرد کامیابی کے شادیانے بجا رہی ہے اور اعلان کر رہی ہے کہ ان کی کامیاب معاشی پالیسیوں اور جمہوریت کی ترقی نے سفید ہاتھی کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ اور حکومت کے نمائندوں اور ان کے حواریوں کے چہرے امریکی سامراج کی مہربان نگاہوں کی وجہ سے دمک رہے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کے تمام مسائل---- بھوک، بے روزگاری، تعلیم اور تمام سماجی برائیوں کے علاج کے لئے انہیں امرت دھارا مل گیا ہے اور اب چند دنوں کی بات ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور پاکستان ایک چنگھاڑتے ہوئے شیر کی طرح اکیسویں صدی میں داخل ہو گا۔ لیکن یہ محض اک خواب ہے، نہایت ہی دلکش اور سہانا خواب۔ یہ خوش فہمی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ پہلے ہی امریکی اجارہ داروں نے پاکستان کی سٹاک ایکسچینج مارکیٹ میں 400 ملین روپیہ لگایا جس سے حصص کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ اس کے بعد انہوں

نے وہی حصص چند ماہ کے اندر 1000 ملین روپے میں فروخت کر دیئے اور چپکے سے چھ سو ملین روپے منافع جیب میں ڈال کر بمعہ اصل زر کے ملک سے باہر لے گئے اور پاکستان کے سرمائے کی منڈی کو بری طرح تہی دامن کر گئے۔

امریکی سامراج کے سرمائے کا جن جنات کی پرانی کہانیوں کی طرح وارد ہوا ہے جو دادی اماں بچوں کو سلاتے وقت سنایا کرتی تھیں۔ جو کچھ یوں ہوتی تھیں۔ ایک آدم خور جن ہر سال ایک گاؤں میں آدمی کھانے آتا تھا۔ جن کے آنے سے پہلے ہلکی ہلکی ہوا آتی تھی۔ پھر پھوار پڑتی' اس کے بعد زبردست ہوا کے جھونکے آتے اور آندھی کے ساتھ طوفان آتا اور پھر مانوں مانوں کرتا ہوا آدم بو' آدم بو پکارتا جن وارد ہوتا اور گاؤں کے لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے اسے ایک آدمی کھانے کے لئے پیش کر دیتے۔ امریکی سرمائے نے بھی بالکل وہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ پہلے اس نے نج کاری کی لہریں بھیجی ہیں پھر آزاد مارکیٹ کی برکتیں گنوائی ہیں' پھر ایٹمی تجربہ نہ کرنے کا مژدہ سنایا ہے اور پھر خوبصورت و حسین جمیل الفاظ میں انسانی حقوق اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے راگ الاپا ہے وہ پاکستان کے افق پر زور دار دھماکے کے ساتھ ہائے منافع' ہائے منافع' پکارتا ہوا نازل ہو گیا ہے اور پاکستان کے حکمرانوں نے اپنی عمریں لمبی کرنے کے لئے پاکستانی عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح اس کے منافعے کی بھوک مٹانے کے لئے اس کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

پاکستان میں یک لخت اس قدر کثیر رقم کی سرمایہ کاری کرنے کے پس پردہ امریکی سامراج کا نصب العین کیا ہے؟ وہ چاہتا کیا ہے؟ ایسے حالات میں عنایات کی یہ بارش کیوں ہے؟ حالانکہ ابھی چند روز پہلے وہ پاکستان کو تمام دیئے جانے والے قرضے پائپ لائن میں ہی روکے ہوئے تھا۔ اور مزید قرضے دینے کو تیار ہی نہ تھا۔ کیا یہ پاکستان کے پس ماندہ' غریب اور ان پڑھ اور جاہل عوام' جن کا بال بال تو توہمات میں جکڑا ہوا ہے اور جنہیں پچھلے 47 سال سے چودہ سو سال پہلے اسلام کی عظیم کامیابیوں کی روشنی میں ناقابل حصول نصب العین کی خوشخبریوں کی امیدوں پر پالا پوسا جا رہا ہے' کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرنے میں مدد دے گا؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ سامراج' سامراج ہی ہے۔ وہ کل بھی سامراج تھا اور آج بھی سامراج ہے اور کل بھی سامراج ہی رہے گا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس نے اس برصغیر میں نزول کے بعد کئی بار اپنا رنگ بدلا ہے۔ یہ پہلے پہل ایسٹ انڈیا اور دوسری کمپنیوں کے روپ میں برصغیر میں وارد ہوا۔ اور اس نے ہندوستان کے مغربی اور جنوبی

ساحل پر سورت، کالی کٹ اور مدراس کے مقامات پر اپنے تجارتی اڈے تعمیر کئے۔ اس کی آمد کے موقعہ پر سامراجی ملکوں کے درمیان تجارتی مراعات اور مقامی رجواڑوں اور نوابوں کی خوشنودی کے حصول کے لئے بہت سخت کشمکش ہوئی۔ کئی رجواڑوں نے اپنی حکمرانی کو بچانے کے لئے ان سے تعاون شروع کر دیا۔ اور دوسروں نے ان کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے ان کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ ٹیپو سلطان نے ان کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں نے سراج الدولہ کی ایک لاکھ فوج کو چھ صد مقامی سپاہیوں کی مدد اور غدار سپہ سالاروں کی غداری نے شکست سے دوچار کر دیا۔ اور اس طرح ہندوستان میں برطانوی سامراج کے داخلے کے لئے دروازے کھول دیئے۔ برطانوی سامراج نے اس کامیاب جدوجہد کے ساتھ ساتھ دوسری سامراجی طاقتوں کو بھی نیچا دکھا دیا اور برصغیر پر چھا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے 1830ء اور 1850ء کے درمیان پنجاب سندھ اور سرحد کو بھی سر کر لیا۔ 1857ء میں عوام کی عظیم بغاوت پھوٹ پڑی۔ محب وطن سپہ سالاروں نے کمزور اور ناتواں بہادر شاہ ظفر کو جو اس وقت خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار کے طور پر دلی پر حکمران تھا، اس بغاوت کا رہنما بنانے کی کوشش کی۔ جو کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ اور اس نے انگریز سے سمجھوتہ کر لیا۔ خیر سگالی کے طور پر برطانوی جرنیل نے بہادر شاہ ظفر کو تحائف بھیجے۔ جب ان تحائف سے رومال اٹھایا گیا تو طشتری میں شاہی خاندان کے شہزادوں کے بریدہ سر سجے ہوئے تھے اور پھر بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں اس نے دلی کا تخت چھن جانے کے غم میں اپنا مشہور نوحہ---- میں نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں۔ تحریر کیا۔

اس طرح اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے بعد برطانوی سامراج نے ملک میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے اور ہندوستان کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لینے کے لئے ترقی کی سکیمیں رائج کیں۔ اس نے ملک کی ترقی اس نہج پر کی کہ ان کے دور حکومت میں ہندوستان میں جس میں ان دنوں ہر شے کی فراوانی ضرب المثل تھی، کئی قحط رونما ہوئے۔ جن میں سے آخری قحط دوسری جنگ عظیم کے دوران 1943ء میں بنگال میں پڑا۔ جہاں تیس لاکھ کے لگ بھگ انسان بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کی آغوش میں چلے گئے اور بنگال میں ہر طرف انسانی ڈھانچوں کے انبار لگ گئے۔ اسی کے علاوہ ہزاروں عورتیں اور بچے بازاروں میں بک گئے۔

سامراجیوں نے ہندوستان میں نہروں اور ریلوے کا جال بچھایا جس کے متعلق ہم یہ نہ جانتے ہوئے کہ ہم نے ان کی کیا قیمت ادا کی' احسان مندی اور ممنونیت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ریلوے اور نہریں انسانی جسم میں شریانوں کی مانند نظر آتی ہیں لیکن یہ جسم کو توانائی بخشنے کے لئے اور خون کو حرکت میں لانے کے لئے نہیں بلکہ ہمارے ملک کے وسائل کو ملک سے باہر لے جانے کے لئے استعمال ہوئیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ملک جو کبھی سونے کی چڑیا کہلاتا تھا' انگریز کی واپسی کے موقعہ پر گنجے کوے کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ انہوں نے بنک' ڈیم' بندرگاہیں' ریلوے سٹیشن' ہسپتال' یونیورسٹیاں اور عدالتوں کی عالیشان عمارتیں بھی تعمیر کیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ذہنی غلاموں' خوشامدیوں' مصاحبوں' رائے بہادروں' نواب صاحبوں' لینڈ لارڈوں' وڈیروں' خانوں اور چاپلوس پنڈتوں اور عالموں کی بھی پرورش کی۔ جنہوں نے برطانوی سامراج کے ظلم و جور کی طرف عوام کی نظریں بند کئے رکھیں اور ظالم اور استحصال کرنے والوں کی مدح سرائی کرتے رہے۔

جب یہ عمل جاری تھا تو ایک عظیم سماجی فلسفی اور سیاستدان نے یہ پیش گوئی کی کہ برطانیہ کی فتح ہندوستان میں بیک وقت دوہرے عمل کی حامل ہے۔ ایک طرف نہایت ہی بے دردی سے عوام کی دولت کو لوٹا جا رہا ہے اور ہندوستان کے وسائل برطانیہ میں منتقل کئے جا رہے ہیں اور دوسری طرف پس ماندہ' ساکت' جامد اور گلی سڑی سماج جو کہ ماضی کے نظریاتی بندھنوں اور توہمات میں جکڑی ہوئی ہے۔ کو ملیا میٹ کیا جا رہا ہے جو آہستہ آہستہ ترقی پسند' جدید طاقتوں کو اپنا تاریخی کردار ادا کرنے کے لئے جنم دے رہا ہے اور اس طرح خیالات اور پیداوار کے میدان میں پرانے دقیانوسی ڈھانچے کو ختم کر رہا ہے۔

آج پھر وہی عمل دوہرایا جا رہا ہے۔ لیکن ایک اونچی سطح پر۔

سامراج جو کہ آج ہزار گنا جدید پیداواری قوتوں اور ہتھیاروں سے لیس ہے اس کا آج بھی اولین مقصد وہی ہے یعنی پس ماندہ ملکوں کی لوٹ اور استحصال' ان دنوں وہ زبردستی تلوار کی نوک کے بل بوتے پر ہمارے سینوں پر سوار مہلک ہتھیاروں سے ہماری گردنوں کو نشانہ بنائے ہوا تھا۔ وہ اس وقت نہایت ہی ظالمانہ اور بہیمانہ استحصالی پالیسیوں کو اپنائے ہوئے تھا اور جو کوئی ذرا بھی سر اٹھانے کی جرات کرتا تھا اس کے عتاب کا شکار ہو جاتا۔ اس کی لوٹ کھسوٹ صاف نظر آتی تھی لیکن اس تمام ظلم و جور اور لوٹ کھسوٹ کے باوجود اس کے پیدا کردہ نظام کے بطن سے نئی طاقتیں جنم لے کر پرورش پا رہی تھیں۔ آج وہ ہمارے ساتھ

شانہ بشانہ دوستوں کی طرح کھڑا نہایت ہوشیاری اور عیاری سے ہماری جیبوں پر ڈاکہ ڈال رہا ہے اور مختلف سرنجوں سے ہمارا خون نچوڑ رہا ہے۔

ان دونوں پہلوؤں پر صدیوں کے سامراجی غلبہ کے حوالے سے مزید روشنی ڈالنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ برطانوی نژاد ہندوستانی دانشور رجنی بام دت کی تحقیق کے مطابق 1750ء سے 1810ء تک کا درمیانی ساٹھ سال کا عرصہ برطانوی سرمایہ داری نظام کی ترقی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عرصہ میں برطانیہ نے ہندوستان سے 5 صد ملین سے ایک ہزار ملین پونڈ منتقل کئے۔ اس میں وہ منافعے شامل نہیں جو غیر مساوی تجارت سے حاصل کرتے رہے۔ لیکن دوسری طرف برطانوی ہندوستان میں فی کس آمدنی 1850ء اور 1900ء کے درمیان 2/3 حصہ کم ہو گئی۔

1957ء میں لارڈ کلائیو کے زیر کمان جب کلکتہ پر قبضہ کیا گیا جو ان دنوں دولت سے مالا مال شہر تھا۔ تو لارڈ کلائیو نے اپنی ڈائریوں کے مطابق جو حقائق دیئے ہیں وہ رونگھٹے کھڑے کر دینے والے ہیں۔ عالمی ادب میں لوٹ مار کے متعلق اس سے بڑھ کر گھناؤنی تحریر نہیں ہو گی۔

مشہور برطانوی ماہر اقتصادیات لارڈ کینز نے نہایت سبق آموز حساب کتاب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ خزانے جو لارڈ کلائیو نے کلکتہ کی پامالی کے وقت لوٹے اگر بنک آف انگلینڈ میں جمع کر دیئے جاتے تو وہ بیسویں صدی تک برطانیہ کی کل دولت کے برابر ہو جاتے۔ لارڈ کینز کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ مغربی سامراج کی نشوونما نو آبادیات کے لوگوں کی بے پناہ ظالمانہ لوٹ کھسوٹ کی مرہون منت ہے۔

ہندوستان نے جو ٹیکس 1863ء میں برطانوی حکومت کو ادا کئے ان کی سالانہ مالیت 65 ملین پونڈ تھی۔ یعنی کہ برطانیہ کی قومی آمدنی کا تقریباً 22 فیصدی۔ اسی صدی کے آغاز میں لارڈ کرزن نے کہا کہ برطانیہ میں جو دولت خرچ کی جاتی ہے اس میں سے ہر پانچواں پونڈ ہندوستان سے آتا ہے۔ حتیٰ کہ 1947ء تک ہندوستان برطانوی سرکار کو سالانہ 135 ملین پونڈ خراج ادا کرتا رہا ہے۔ 1870ء تک برطانیہ دنیا کا سب سے بڑا صنعتی ترقی یافتہ ملک بن گیا تھا۔ اور وہ دنیا بھر کا نصف کوئلہ' نصف سے زیادہ لوہا اور تقریباً 40 فیصدی فولاد پیدا کر رہا تھا۔ تقریباً نصف کے قریب ٹیکسٹائل کی مصنوعات برطانوی فیکٹریوں میں بنتی تھیں اور دنیا کی

کل مصنوعات کا 1/3 حصہ برطانیہ پیدا کر رہا تھا۔

آج کے جدید سامراجیوں نے اپنے بنیادی نصب العین کو خیرباد نہیں کہا۔ جو کہ زیادہ سے زیادہ منافے کمانے کے لئے وسیع سے وسیع مارکیٹوں پر قابض ہوتا ہے۔ اسی نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے نئے جدید سے جدید طریقے ایجاد کر لئے ہیں انہی مفادات کے حصول کے لئے ان کی سوویت یونین کو برباد اور بدنام کرنے کی ستر سالہ جدوجہد وقتی طور پر رنگ لائی ہے اور انہیں دنیا کی معیشت کا بادشاہ بنا دیا ہے۔

ان کے استحصالی حربوں میں سرفہرست ان کے مشروط سودی قرضے ہیں۔ وہ جن ملکوں کو یہ قرض دیتے ہیں انہیں ان قرضوں کا 80 فیصدی قرض دینے والے ملک میں ہی خرچ کرنا ہوتا ہے۔ یہ قرضے نہایت ہی طاقتور بین الاقوامی تنظیموں---- بین الاقوامی مالیاتی فنڈ---- عالمی بنک---- کے ذریعے دیئے جاتے ہیں۔

اگر ایک دفعہ یہ قرضے کسی ملک کی معیشت میں داخل ہو جائیں تو پھر ہیروئن کی طرح معیشت کو قرضوں کا عادی بنا دیتے ہیں اور قرضہ لینے والے ان کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کا قرضہ 1940ء اور 1980ء کی تین دہائیوں کے دوران سو گنا بڑھ گیا ہے۔ حتیٰ کہ 1981ء میں 10 لاکھ ملین ڈالر کے برابر ہو گیا۔ اکثر ممالک میں ان دس سالوں میں دو تین گنا سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔ 1985ء میں ان ممالک کے قرضے ان کی سالانہ کل اندرونی پیداوار کے 1/3 حصہ کے برابر ہو گئے۔ اور اس سال ان کی درآمدات کی قیمت تقریباً ڈیڑھ گنا زیادہ ہو گئی۔ چونکہ ان ملکوں کو اپنی آمدنی کا 1/3 یا نصف حصہ قرضوں کی ادائیگی میں صرف کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے بیرونی قرضوں میں کمی نہیں ہو سکتی۔ یہ امر نہایت ہی ناقابل برداشت ہے کہ ان ملکوں کی قرضوں کی ادائیگی میں ان کی کل برآمدات کا 40 فیصد خرچ ہو جاتا ہے۔ پاکستان پہلے ہی 830 بلین روپوں کا مقروض ہے اور اس کے سالانہ بجٹ کا زیادہ حصہ ان قرضوں کی ادائیگی میں خرچ ہو جاتا ہے۔ 1993-94ء میں بیرونی قرضوں کی ادائیگی کے لئے پاکستان کو اپنے دفاعی بجٹ سے بھی زیادہ خرچ کرنا پڑا ہے۔

سامراجی طاقتوں کے ہاتھ میں غیر مساوی بنیادوں پر تجارت بھی لوٹ مار کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ وہ ترقی پذیر ملکوں کو اپنی مصنوعات نہایت ہی مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔ لیکن

ان کا خام مال یا نیم پکی مصنوعات مقابلتاً" سستی خریدتے ہیں۔ وہ ترقی پذیر ممالک کو قرضوں کی لاٹھی کے ذریعے اپنی مصنوعات کی درآمد کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور کراتے ہیں لیکن اس کے برعکس انہوں نے ان ممالک کی مصنوعات کی اپنے ملک میں درآمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں پاکستان کی کپڑے کی مصنوعات امریکہ کو اپنے کوٹے سے زیادہ برامد نہیں کی جا سکتیں۔

سرمائے کی برآمد بھی سامراجی حکومتوں' عالمی بنکوں' بین الاقوامی سرمائے کی کمپنیوں کے ہاتھ میں ترقی پذیر ممالک کے استحصال کے لئے بہت بڑا ہتھیار ہے۔ لیکن اس کے لئے دوستانہ فضا' امن و امان' سرمائے کے تحفظ کی گارنٹی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ پیداوار یقینی ہو سکے اور منافع ملک سے باہر لے جانے کی سہولت مل سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ بیرونی سرمایہ ترقی پذیر ممالک میں ایک حد تک مثبت کردار بھی ادا کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کچھ تھوڑا بہت روزگار مہیا کرتا ہے۔ دوسرے پرانے تہذیبی اور جامد معاشی ڈھانچے کو مسمار کرتا ہے۔ توہمات کو کمزور کرتا ہے۔ روشن خیالی اور سائنسی نقطہ نظر کو فروغ بخشتا ہے۔ اور آبادی کے کچھ حصہ کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ یہ چند بڑے گھرانوں کو جنم بھی دیتا ہے جو بیرونی سرمائے کے ساتھ حصہ داری کرتے ہیں۔ جیسا کہ بجلی پیدا کرنے والی کمپنیاں کر رہی ہیں۔ پاکستان میں وہ زرداری اور وقار وغیرہ کو حصہ دار بنا رہی ہیں ان اقدامات سے ان کے سرمائے کو محفوظ رکھنے اور منافعوں کو بیرون ملک لے جانے کے لئے مدد ملے گی۔ یہ سرمایہ لگنے سے بہت سی خود رو چھوٹی چھوٹی کمپنیاں ان بڑی کمپنیوں کو ضروری سامان وغیرہ مہیا کرنے کے لئے وجود میں آ جاتی ہیں اور اسی طرح سے درمیانہ طبقہ کے اوپر والے حصہ کے کچھ لوگ اور امیر ہو جاتے ہیں جو اس نظام کی پائیداری کے لئے ضروری ہوتا ہے لیکن بین الاقوامی کمپنیوں کا واحد مقصد ترقی پذیر ممالک کے سستے مزدوروں اور سستے خام مال کا حصول ہی اولین مقصد ہوتا ہے۔ ان کے حصول سے وہ اپنی منڈی کو وسیع کرتے ہیں' منافعوں کو بڑھاتے ہیں جن کی گارنٹی سرمایہ حاصل کرنے والے ممالک فراہم کرتے ہیں۔

آج دنیا بھر میں تقریباً گیارہ ہزار کثیرالاقوامی کمپنیاں موجود ہیں جن کی 90 ہزار کے قریب برانچیں ہر چار سو پھیلی ہوئی ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کی کل پیداوار کا 40 فیصدی حصہ ان کمپنیوں کے قبضہ میں ہے اور یہ کمپنیاں ان کی تجارت کے تقریباً نصف حصہ پر کنٹرول کرتی

ہیں- یہ کمپنیاں ترقی یافتہ ممالک کی جدید ٹیکنالوجی کے 80 فیصد حصہ پر بھی قابض ہیں- کثیرالاقوامی کمپنیوں نے ترقی پذیر ممالک کے استحصال کو نئی سطح پر لا کھڑا کیا ہے-

ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ہر سال تقریباً دو ہزار 5 صد ملین ڈالر سرمایہ لگایا جاتا ہے- لیکن ہر سال یہ کمپنیاں ان ممالک سے تین ہزار ملین ڈالر ترقی یافتہ ممالک کو منتقل کر لیتی ہیں-

1970-80ء کی دہائی میں ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں نے ترقی پذیر ممالک میں 10 ہزار ملین ڈالر سرمایہ لگایا اور اس عرصہ میں ایک لاکھ تیس ہزار ملین ڈالر ان ممالک سے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کو منتقل کر لیا- 1980-90ء کی دہائی میں بھی یہی پوزیشن قائم رہی-

سرد جنگ کے دوران امریکی سرمایہ داروں کے سرمائے کے لئے جنگی ساز و سامان پیدا کرنے کی صنعت چونکہ بہت منافع بخش تھی اس لئے ان کا زیادہ سرمایہ اسی صنعت میں ہی لگا ہوا تھا- کیونکہ اسی صنعت میں زیادہ منافع کے علاوہ مقابلہ کم اور تحفظ زیادہ تھا- حکومت کی سرپرستی میں پرائیویٹ امریکی کمپنیوں کو لامحدود منافع حاصل کرنے کی سہولتیں میسر تھیں- لیکن سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی حالات یکسر بدل گئے ہیں اور امریکی کمپنیوں کو آج یہ سہولتیں میسر نہیں رہیں- کیونکہ ہتھیاروں کی صنعت میں سرمایہ سکڑ رہا ہے چنانچہ یہ کمپنیاں اپنے وافر سرمائے کے لئے نئی نئی منڈیاں تلاش کر رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج پاکستان جیسے ملک میں بھی سرمایہ لگانے کے لئے پر تول رہی ہیں- حالانکہ پاکستان کا بال بال پہلے ہی بیرونی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے- اور وہ اپنی گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالا دینے کے لئے پکار رہا ہے- اس کے پاس اس قدر ذرائع نہیں ہیں کہ وہ اپنی مفلوج معیشت کو آزادانہ طور پر تندرست کر سکے-

یقیناً امریکی سرمائے کی پاکستان میں یلغار سامراجی ممالک اور بین الاقوامی کمپنیوں کے درمیان سرمایہ لگانے کی باہمی جدوجہد شروع کر دے گی- ان ممالک میں سرفہرست امریکہ' جاپان' جرمنی اور برطانیہ ہیں- امریکہ اور جاپان کے درمیان پہلے ہی تجارت میں جاپانی بالادستی کے خلاف اندرون خانہ جنگ جاری ہے- لیکن جاپان کی کمزوری یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ امریکہ سے معاشی طور پر بہت مضبوط ہو رہا ہے لیکن اس کے پاس اپنی اسی معاشی طاقت کی حفاظت کے لئے فوجی طاقت نہیں ہے- امریکہ اس کی فوجی طاقت کی مخالفت کرتے ہوئے بھی مجبور ہے کہ وہ جاپان کو فوج بنانے کے لئے اکسائے تاکہ اس کی فوج اقوام متحدہ کے

جھنڈے تلے پس ماندہ ممالک میں پولیس مین کا کام کر سکے۔ چنانچہ جاپان نے بغیر کسی شور شرابے کے اپنی فوج بڑھانی شروع کر دی ہے حالانکہ جاپانی عوام کا ایک حصہ اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلی بار جاپانی افسروں کی کمان میں اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے روندا میں جاپانی فوج بھیجی گئی ہے۔ موجودہ صورت حال میں امریکی عوام امریکی فوج کو اپنے ملک سے باہر بھیجنے کے سخت مخالف ہیں۔ اس لئے امریکہ کو جاپان کی اس نئی فوج کی ضرورت ہے۔ جرمنی بھی تمام پابندیوں کے باوجود نئی فوج کی بھرتی کر رہا ہے تاکہ اس کی معیشت کو بھی سہارا مل سکے۔

امریکی پاکستان کے مغربی ساحل پر یکایک وارد نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ پچھلے کئی سالوں سے نہایت ہوشیاری سے کراچی اور بلوچستان کے اردگرد کے ساحل پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے منصوبے بناتے رہے ہیں اور پہلے سے اپنا کام کر رہے ہیں اور انہیں بے نظیر حکومت کے اندر مختلف گروہوں کی حمایت حاصل ہے۔

کراچی اور بلوچستان کے ساحل ایک طرف ڈیگو گارشیا جزیرے کے قریب ہے۔ یہ جزیرہ امریکہ نے اپنا فوجی ساز و سامان جمع کرنے اور تیز رفتار فوج رکھنے کے لئے برطانیہ سے خریدا تھا۔ دوسری طرف یہ مشرق وسطی' ایران' سنٹرل ایشیا' روس اور چین اور ایران کے بھی قریب ہونے کی وجہ سے سٹریٹجک پوزیشن رکھتا ہے۔ امریکی فوجی ضروریات کے لئے کراچی اور بلوچستان کے ساحل پر ان کے لئے ٹرانزٹ اڈہ کا قیام ضروری ہے۔ تاکہ اگر ضرورت پڑے تو آسانی سے فوج اور جنگی ساز و سامان روس' سنٹرل ایشیا' ایران' چین اور حتیٰ کہ ہندوستان میں لے جایا جا سکے۔

جس طرح بڑابیر کے اڈے پر بڑے سے بڑا پاکستانی بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا اسی طرح ہمارے ان ساحلی علاقوں میں واقع اڈوں پر بھی داخلے پر پابندی عائد کر دی جائے گی۔

آج پاکستانی عوام کے ذہنوں میں جو سہانے خواب سموئے جا رہے ہیں کہ امریکی سرمائے کے آنے سے من و سلویٰ اتر آئے گا وہ محض اک خواب ہی رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کارخانے بھی پیداوار کرنے کے لئے لگائے جائیں گے وہ پاکستانی معیشت کو ترقی ضرور دیں گے لیکن مستقبل قریب میں وہ پاکستان کو درپیش مسائل کو حل نہ کر سکیں گے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان ایک بار پھر ایک بڑی سامراجی طاقت کے ہاتھ میں محض غلام بن کر رہ جائے گی۔

امریکی معیشت کو خود ایک بہت بڑے بحران کا سامنا ہے۔

بل کلنٹن نے انتخابی مہم کے دوران عوام کو مزید سہولتیں دینے کے لئے جو بلند بانگ وعدے کئے تھے وہ نہ صرف ابھی تک تشنہ ہیں بلکہ انہیں جو سماجی سہولتیں پہلے سے حاصل تھیں ان میں بھی کمی کی جا رہی ہے۔ جس سے امریکی عوام میں بے چینی برابر بڑھ رہی ہے اور جگہ جگہ ہڑتالیں اور مظاہرے ہو رہے ہیں۔ عوام کی امیدیں بری طرح مجروح ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود امریکی معیشت اور ان کی حکومتی پالیسیوں کی ضرورت ہے کہ ان حالات میں امریکی سرمایہ پاکستان جیسے ممالک میں لگایا جائے جہاں سستی لیبر اور سستا خام مال میسر ہے تاکہ ان کے اپنے بحران پر قابو پایا جا سکے اور کثیرالاقوامی کمپنیوں کی منافع کی گارنٹی مل سکے۔

امریکی کمپنیوں کے ساتھ معاہدوں پر دستخط ہونے کے ساتھ ہی ایک سرمایہ دار مسٹر گارڈن ایوا جو کہ کنسالیڈیٹڈ ایگز یکٹیو پاور ایشیا آف ہانگ کانگ سے تعلق رکھتا ہے نے بھی پاکستان میں سندھ میں دریافت ہونے والے کوئلہ کے ذریعے بجلی پیدا کرنے کے کارخانے کراچی کے ساحل کے قریب لگانے کا معاہدہ کر لیا ہے۔ ہانگ کانگ 1997ء میں چینی حکومت کی تحویل میں جانے والا ہے۔ اس لئے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں ان کا سرمایہ ڈوب ہی نہ جائے ہانگ کانگ سے کثیرالاقوامی کمپنیاں اپنا سرمایہ نکال کر محفوظ جگہوں پر لگانے کے لئے مجبور ہیں۔ اس کمپنی نے جو معاہدہ پاکستان کے ساتھ کیا ہے اس کی رو سے 18 فیصدی منافع کی گارنٹی دی گئی ہے اور یہ منافع اسے ملک سے باہر لے جانے کا بھی اختیار ہو گا۔ اس کے علاوہ دو اور سرمایہ داروں نے 13 صد کلو واٹ کوئلہ کے ذریعے بجلی پیدا کرنے کے لئے کارخانہ قائم کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔

ان معاہدوں کے پیش نظر یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ منصوبے پایہ تکمیل تک پہنچنے کے بعد پاکستان کی بجلی کی پیداوار دوگنی ہو جائے گی اور اس طرح وہ پاکستان کی ضروریات سے بھی زیادہ ہو گی اور پاکستان بجلی برآمد کرنے کے بھی قابل ہو جائے گا۔ یہ نہایت سہانے خواب کی مانند ہے ابھی تو صرف میمورنڈم آف انڈر سٹینڈنگ پر ہی دستخط ہوئے ہیں۔ سندھ میں کوئلہ نکالنے کا عمل کب شروع ہو گا اور کب وہ کوئلہ کراچی کے ساحل پر پہنچے گا۔ اس کا کسی کو کچھ پتہ نہیں۔

اس کے علاوہ پیپلز پارٹی کے ایک ہمدرد دانشور مسٹر احمد بشیر نے روزنامہ فرنٹیر پوسٹ

میں لکھتے ہوئے یہ تخمینہ لگایا ہے کہ پاکستان میں بجلی بہت مہنگی ہو جائے گی۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ 70 کے قریب امریکی سرمایہ دار پچھلے چھیالیس سالوں میں کہاں تھے۔ اس عرصہ میں انہوں نے پاکستان میں کیوں سرمایہ نہیں لگایا اور اس سارے عرصہ میں پاکستان میں ان کا سرمایہ 450 ملین ڈالر سے نہیں بڑھ پایا۔ آج وہ کیونکر پاکستان میں 4 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے کے لئے بیتاب ہیں۔ دراصل امریکہ میں بجلی کے شعبہ میں منافع کی شرح 8 فیصدی کے قریب ہے جبکہ پاکستان میں سرمایہ لگانے سے انہیں پچاس فیصد منافع حاصل ہو گا اور گارنٹی کے ساتھ اس پر کوئی ٹیکس بھی ادا نہیں کرنا ہو گا۔ پیپلز پارٹی کے ایک سابق وزیر خزانہ اور ترقی پسند دانشور ڈاکٹر مبشر حسن کا کہنا ہے کہ یہ معاہدے پاکستان اور امریکہ دونوں کے ساتھ فراڈ پر مبنی ہیں۔ ان سے ایک بلین چالیس کروڑ ڈالر کی رشوت انڈر ان واسینگ کے ذریعے حاصل کی جائے گی۔ اور یہ معاہدے دونوں ممالک کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ احمد بشیر نے قوم کو انتباہ کیا ہے کہ بجلی کی قیمت فی یونٹ 5 روپے ہو جائے گی جو صارفین کی قوت برداشت سے باہر ہے۔ اگر یہ بات درست ثابت ہو تو نہ صرف عام افراد کو اس سے نقصان عظیم ہو گا۔

بلکہ ہماری صنعتی مصنوعات بھی بہت مہنگی ہو جائیں گی اور ہماری برآمدات میں کمی واقع ہو گی جس سے پاکستانی معیشت کو سخت نقصان ہو گا۔

ان معاہدوں کی ابھی سیاہی بھی خشک نہیں ہونے پائی کہ بجلی کی قیمت میں سولہ فیصد اضافہ کا مژدہ سنایا گیا۔

بجلی کے پیدا ہونے تک کتنے فیصدی اور کتنی بار قیمتیں بڑھائی جائیں گی۔

یہ امر بھی حیران کن ہے کہ نواز شریف اور اس کے حواری جو کل تک بے نظیر حکومت پر اس زاویہ سے حملے کر رہے تھے کہ بے نظیر حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے بیرونی سرمایہ دار پاکستان میں سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں اور ہچکچا رہے ہیں۔ لیکن بے نظیر حکومت نے جب بیرونی سرمایہ داروں سے پاکستان میں سرمایہ لگانے کے لئے معاہدے کئے ہیں تو وہ اب طعنے دے رہے ہیں کہ بے نظیر نے پاکستانی معیشت کو بیرونی کمپنیوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ شاید انہیں اس بات کا غم ہے کہ یہ فروختگی تو ان کے ذریعے ہونی چاہئے تھی جو بے نظیر نے چھاپہ مار کر پہل قدمی حاصل کر لی ہے۔

حکمرانوں کی اس کامیابی پر شادیانے بجانے اور حزب اختلاف کی بے نظیر حکومت کو

ہٹانے کے لئے ہلہ گلہ کی تحریک کے شور شرابے میں ملک کے اصل مسائل باہمی الزامات کے سمندر میں ڈوب کر رہ گئے ہیں۔

بے نظیر نے نہایت طمطراق سے کہا ہے کہ ان معاہدوں کے نتیجے میں پاکستان اکیسویں صدی میں ایشیا کے ٹائیگر کے طور پر داخل ہو گا۔

ایشیا کے پہلے ٹائیگروں کی مدح سرائی میں جو سر الاپے جاتے ہیں ان میں اس بات کو بھلا دیا جاتا ہے کہ جاپان' کوریا' ہانگ کانگ' وغیرہ وہ ممالک ہیں جن میں دوسری جنگ عظیم کے بعد قومی بجٹ کا بہت ہی قلیل حصہ فوج اور فوجی ساز و سامان پر خرچ ہوتا رہا ہے اور ان ملکوں میں امریکی فوجیں براجمان ہیں اور امریکہ ان ملکوں کے دفاع کو اپنا دفاع سمجھتا ہے۔ لیکن پاکستان کے بجٹ کا تقریباً نصف حصہ دفاع پر خرچ ہو رہا ہے۔ اسی لئے معاشی میدان میں ٹائیگر بننے کے لئے اس کے پاس وافر وسائل ہی نہ ہیں۔ اگر دفاعی ضروریات کی یہی صورت حال رہے اور مسائل حل نہ کئے جائیں تو اس قدر ڈالروں کی شکل میں اندرون ملک سرمایہ لگانے کے باوجود اس قدر تیزی سے ترقی کے راستے پر گامزن ہونا آسان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ حکمران طبقے جس طرح ملکی اور غیر ملکی وسائل لوٹ رہے ہیں اور جس طرح ہر شعبے میں رشوت اور کرپشن نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں وہ دیمک کی طرح اس سرمائے کو بھی چاٹ جائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے پاس پن بجلی پیدا کرنے کے لئے کوئی وسائل نہیں ہیں۔ تاکہ ہم بجلی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم ملک کے اندر سے سرمایہ کاری کے لئے سرمایہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اور کیا ہم اس قدر پس ماندہ ہیں کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہی نہیں ہیں۔

ہمارا دو ٹوک جواب یہ ہے کہ ہمارے پاس اس قدر وسائل موجود ہیں کہ ہم اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بجلی پیدا کر سکیں۔ لیکن افسوسناک بات ہے کہ ہمارے سیاسی رہنماؤں اور ہماری سول اور فوجی نوکر شاہی ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کے مطابق روز افزوں ضروریات کے لئے طویل عرصہ کے لئے منصوبہ بندی کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہی ہیں۔ یہ رہنما ملک کے اندر نسلی' مذہبی اور قومی مسائل اس کثیرالاقوامی ریاست میں ٹھیک انداز سے حل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ وہ کبھی سر جوڑ کر ان مسائل کو حل کرنے کے لئے نہیں بیٹھے۔ 1973ء کے آئین میں ان مسائل کو حل کرنے کے لئے جو چند ایک اقدامات

کئے گئے تھے انہیں بھی ضیاء الحق کی مارشل لاء حکومت نے تار تار کر دیا ہے اور اب کسی کی جرات ہی نہیں پڑتی کہ وہ ان مسائل سے آنکھیں دوچار کر سکیں۔ وہ محض اپنی حکومتوں کو بچانے کے لئے ڈنگ ٹپاؤ' پالیسی اختیار کئے رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کالا باغ اور بھاشا ڈیم جیسے منصوبے کھٹائی میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کی تعمیر کے لئے کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ حالانکہ ان کے سروے اور منصوبہ بندی پر کروڑوں روپیہ خرچ ہو چکا ہے اور ان کے اخراجات ابتدائی تخمینوں سے کئی گنا بڑھ چکے ہیں۔ نسلی اور قومی کدورتیں اور نفرتیں ہمیشہ راستے میں حائل رہی ہیں اور اب تو وہ مزید بڑھ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ہم موجودہ صورت حال سے دوچار ہونے پر مجبور ہیں جہاں لوڈ شیڈنگ ایک معمول بن چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں دوسرے ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں بھی بجلی کی فی کس کھپت بہت کم ہے۔ حالانکہ اس کی سطح بھی بہت نیچی ہے۔

کالا باغ ڈیم کا بنایا جانا ناگزیر ہے۔ پنجاب کے وسطی اضلاع کے لئے نہیں جیسا کہ اس منصوبے کو رد کرنے کے لئے پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ نہ صرف بجلی کی پیداوار بڑھانے بلکہ سرائیکی علاقہ کی بے آب گیا اور وہ بنجر اراضی جنوبی پنجاب اور چولستان کو آباد کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ان مسائل کو اونچی سطح پر سنجیدگی سے حل کرنے کے بجائے مشکلات کے پیش نظر انہیں جوں کا توں چھوڑ دیا گیا ہے۔۔ یہ عجیب مضحکہ خیز صورت حال ہے کہ پیپلز پارٹی جو اس وقت حکمران جماعت ہے اور جسے ہردلعزیزی حاصل ہے۔ کے دو "صوبائی وزراء شب و روز کالا باغ ڈیم بنانے کے متعلق خلاف بیان داغتے رہتے ہیں اور ایک مرکزی وزیر ڈیم بنانے کے حق میں کبھی کبھار بھڑک مار دیتے ہیں اور ملک کی نہایت ہی کامیاب وزیراعظم اس بارے میں مکمل خاموشی سادھے ہوئے ہے اور غیر ملکی دوروں میں ہی لگی ہوئی ہیں۔ شاید وہ اپنی وزارت کو بچانے کے لئے اسی میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہیں۔ ان کا فرض یہ ہے کہ اس قدر اہم معاملہ میں مداخلت کر کے افہام و تفہیم کے ذریعے پہلے ہی اپنی پارٹی کے اندر یکجہتی پیدا کریں اور پھر نواز شریف اور حزب اختلاف کی پارٹیوں کی میٹنگ بلا کر ملک کے بہترین مفاد کے مطابق ایسا فیصلہ کروائیں کہ فیڈریشن کے مختلف یونٹوں میں سے کسی کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشکل اور گنجلک مسائل کو حل کرنے کے لئے وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہیں۔

امریکہ اور ہانگ کانگ کے سرمایہ داروں کے ساتھ بجلی پیدا کرنے کے لئے معاہدے کر کے وزیراعظم نے بظاہر اس مسئلے کو طاق نسیاں پر رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے جو یقیناً نقصان دہ ثابت ہو گا۔ انہیں اس بات کا فخر ہے کہ انہوں نے قلم کی ایک ہی جنبش سے بجلی پیدا کرنے جیسے اہم مسئلہ کو حل کر لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیراعظم کو اس بات سے تعلق نہیں کہ اس حل سے عوام کی پہلے سے جھکی ہوئی کمر پر کس قدر زیادہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے' یقیناً اگر ایک طرف بجلی کی پیداوار بڑھے گی تو دوسری طرف مہنگی بجلی کی وجہ سے ہماری مصنوعات اور بھی مہنگی ہو جائیں گی اور دوسرے ملکوں سے مقابلہ نہ کر سکیں گی۔

دوسرے ہماری نہروں اور ندی نالوں پر چھوٹے چھوٹے ڈیم بنانے اور بجلی پیدا کرنے کے متعلق کبھی کوئی منصوبہ بندی کی ہی نہیں گئی اور نہ ممکنات کو دریافت کرنے کے لئے کوئی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں اس اقدام سے ہمارے عوام کے بجلی کے بہت سے مسائل بہت حد تک حل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان اقدامات کے لئے سرمائے کے وسائل کہاں سے میسر آئیں گے؟

موجودہ حالات میں اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ پاکستان کے پاس اپنی معیشت کو پائیدار بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے سب وسائل موجود ہیں۔ لیکن سیاسی رہنما اور نوکر شاہی ان وسائل کو بری طرح ضائع کرتے رہے ہیں۔ پچھلے دو سال میں کم از کم پیپلز پارٹی اور نواز لیگ کی باہمی کشمکش کی وجہ سے ایک بات تو اچھی ہوئی ہے۔ تمام کالی بھیڑیں اب عوام کی نظروں کے سامنے ننگی کھڑی ہیں۔ تمام وہ لوگ جو لوٹ مار کرتے رہے ہیں---- تمام وہ لوگ جو عوام سے لوٹی ہوئی دولت کے بل بوتے پر پھلتے پھولتے رہے ہیں---- تمام وہ لوگ جنہوں نے عوام کا روپیہ ہڑپ اور غصب کیا ہے۔ تمام وہ لوگ جنہوں نے دن دہاڑے بنک لوٹے ہیں' غبن کئے ہیں' قرضے لے کر واپس نہیں کئے اور معاف کروائے ہیں' بالکل ننگی حالت میں عوام کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور اب چھپانے سے بھی ان کے گھناؤنے چہرے عوام سے اوجھل نہیں ہو سکتے۔ لوگوں نے انہیں بالکل ننگی حالت میں دیکھ لیا ہے۔ ان کی عوام دشمنی اور ملک دشمنی ان کے سامنے ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ وقفے وقفے سے چند بلند بانگ بیانات داغے جاتے ہیں اور پھر وعدہ فردا پر ٹال دیا جاتا ہے۔ سخت قوانین بنا کر انہیں گرفتار نہیں کیا جاتا۔ ان کی جائدادیں ضبط نہیں کی جاتیں۔ مالیہ کے طور پر ہڑپ کئے ہوئے قرضے وصول نہیں کئے جاتے عوام جنہیں شروع شروع میں کچھ امید

ہوئی تھی کہ ان سے لوٹی ہوئی دولت واپس لی جائے گی اب آہستہ آہستہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے جا رہے ہیں اور اپنے آپ کو بے یار و مددگار سمجھنے لگے ہیں۔

بہت بڑے بڑے اجارہ دار سرمایہ دار ایسے ہیں جنہوں نے قرضے لے کر معاف کروائے ہیں لیکن آج بھی وہ فیکٹریوں' کارخانوں' بڑی بڑی بلڈنگوں اور کاروں کے مالک ہیں اور پاکستان کے طول و عرض میں رہنمائی کا روپ دھارے دندناتے پھر رہے ہیں حالانکہ ان کی جگہ جیل میں ہے۔

اور وہ لوگ بھی جنہوں نے بنکوں کو لوٹا ہے لیکن ان کے خلاف بھی سرمایہ کو واپس لینے کے لئے اقدامات نہیں کئے جاتے ہیں ایسے لوگوں نے قوانین اپنی حفاظت کے لئے بنا رکھے ہیں وہ جھٹ ہائی کورٹ کی آڑ لے لیتے ہیں اور حکم امتناعی حاصل کر لیتے ہیں۔ حکمران ایسے قوانین کو دیدہ دانستہ بدلنے کو تیار نہیں۔ کیونکہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ سب لوٹ مار کرتے ہیں خواہ حکومت کے اندر ہیں یا باہر۔ انہوں نے ملک کی تعمیر کی بجائے لوٹ مار کو ہی اپنا پیشہ بنا رکھا ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے کواپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعے عوام کو بے دریغ لوٹا ہے۔ لیکن ان سے روپیہ واپس لینے کے لئے بھی کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ بلکہ خبریں یہ آتی ہیں کہ یار لوگ اس کو بھی مزید لوٹ کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں اور مزید منافع کما رہے ہیں۔ اور ان سے روپے کی وصولی کے لئے سکیمیں اخبارات کی زینت تو بنتی رہتی ہیں لیکن لٹے ہوئے عوام کو کچھ نہیں دیا جاتا اور وہ صرف حاکمان وقت کے سامنے فریاد کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

عجیب بات ہے کہ وزیراعظم کواپریٹوز کے نادہندگان سے روپیہ واپس کروانے کے لئے بڑے جلسے جلوس نکالتی ہیں اور وہ بھی ایسے گھرانے سے جس نے کواپریٹوز کا سب سے زیادہ روپیہ ہڑپ کیا ہے اور اس وقت سب سے بڑا نادہندہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ آج بھی وزیراعظم کا دست راست ہے اور بے حد عزت و توقیر کا مالک ہے اور آج کل بیرونی کمپنیوں کے ساتھ مل کر بجلی پیدا کرنے کے لئے لگائے جانے والے کارخانوں میں حصہ دار بنایا جا رہا ہے۔

کیا اس ملک میں ایسی کوئی انگلی نہیں جو لٹیروں اور رہزنوں کے اس گروہ کے سرغنوں کے خلاف اٹھ سکے۔ جو عوام کو دھوکا بھی دیتے ہیں' لوٹتے بھی ہیں' ان کا مال غیر قانونی طور

پر ہڑپ بھی کرتے ہیں اور پھر مسند حکومت پر بھی براجمان رہتے ہیں۔ حزب اختلاف میں ہوں تو عوام کے جلوس نکالتے ہیں، نعرے لگواتے ہیں اور مزید ہردلعزیزی حاصل کرتے ہیں عوام پر ظلم بھی کرتے ہیں اور ان کی دوستی کا دم بھی بھرتے ہیں۔ ایسے رہنماؤں نے الفاظ کے معنی ہی بدل کے رکھ دیئے ہیں۔

اگر ایسے لٹیروں سے تمام لوٹی ہوئی دولت واپس چھین لی جائے تو یقیناً ملک کے تمام اندرونی اور بیرونی قرضے بھی ادا ہو سکتے ہیں اور ملک کی صنعتی ترقی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں کیا جاتا اور جو کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سامراجی ملکوں سے مزید قرضے لینے کے لئے کوشش کی جاتی ہے اور ان کا سرمایہ پاکستان کے عوام کو مزید لوٹنے کے لئے پاکستان کی ترقی کے نام پر لگایا جاتا ہے اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جاتی ہے۔

آج کے ہندوستان میں عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بنک کی مالیاتی پالیسیوں کے خلاف وسیع پیمانے پر جدوجہد جاری ہے اور نرسیما راؤ کی حکومت کی ان عوام اور ملک دشمن پالیسیوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے دس لاکھ کے قریب سیاسی کارکنوں نے گرفتاری پیش کی ہے اور یہ جدوجہد روزانہ اپنی صفوں میں عوام کے نئے نئے حلقوں کو شامل کر رہی ہے اور ملک کے کونے کونے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ تاریخ کے اس اہم موڑ پر پاکستان میں بائیں بازو کی کوئی ترقی پسند اپوزیشن نہیں ہے جو اس صورت حال کو چیلنج کر سکے اور ڈالروں کی شیریں تہ کے نیچے چھپے ہوئے زہریلے خطرہ کو ننگا کر سکے۔

پاکستان میں بائیں بازو کی پارٹیاں اپنی غلط پالیسیوں، خود غرضیوں اور بددیانت رہنماؤں کی وجہ سے سامراجیوں کی ریشہ دوانیوں اور اندرون ملک سرمایہ داری کے ایجنٹوں کے ہتھکنڈوں کی بدولت ہونے والے سوویت یونین کے خاتمے سے بہت پہلے ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں اور ان کے کارکنوں کو پیپلز پارٹی کے زبردست گرجدار نعروں نے نگل لیا تھا اور ہر جتن اور طریقہ کار اور جوڑ توڑ جو انہیں اس کی لپیٹ سے بچانے کے لئے اختیار کیا گیا ناکامی سے دوچار ہو گیا اور پیپلز پارٹی کے مدقوق لمس سے انہیں نہ بچا سکا۔ وہ اس وقت چھوٹے چھوٹے گروپوں اور افراد میں بٹے ہوئے نئے سامراج کے اگلے مورچوں میں رنگ رنگیلے جمہوری لبادوں میں دولت کی فراوانی تلے دبے ہوئے اور ہمالیہ جیسے بلند وقار و توقیر کے ساتھ پرانے عیسائی مبلغوں کی طرح جو مذہب کو پھیلانے کے لئے [illegible] اور نرم لہجے میں بائبل کا

سبق دینے میں جٹے رہتے تھے، مشغول نظر آتے ہیں۔

مشرق کی عظیم دختر، جسے اپنے عظیم باپ کا عالیشان وقار ورثہ میں ملا تھا اور جسے اس کی اپنی دوغلی پالیسیوں اور سفید ہاتھی نے پاؤں تلے روند دیا کہ اپنے تجربات کے ذریعے موجودہ دور کے عملی سیاسیات کے کامیاب فلسفے کو اپنا لیا ہے اور وہ اس کے ذریعے اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ پاکستان پر حکومت کرنے کے لئے دو طاقتوں کی خوشنودی حاصل کرنی ضروری ہے اور وہ ہیں امریکہ اور فوج۔ چنانچہ اس نے بہت پاپڑ بیل کر اور محنت کر کے امریکی سامراج اور فوج کی خوشنودی حاصل کر لی ہے۔

اور اب اس کی نظر میں کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے ہوئے جنہیں عوام کہا جاتا ہے صرف استحصال کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں اور اقتدار کی چوٹی تک پہنچنے کے لئے محض ان کے کندھوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ پراپیگنڈہ جدید ذرائع استعمال کر کے انہیں آسانی سے بیوقوف بنایا جاتا ہے اور اگر ان کی طرف چند ٹکڑے پھینک دیئے جائیں تو وہ چھینا جھپٹی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس دنیاوی نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے اردگرد ٹھگوں کو اکٹھا کر رکھا ہے اور انہیں عوام کے مزید استحصال میں ساجھے دار بنانے کے لئے بجلی کے تعمیر ہونے والے نئے کارخانوں میں حصہ دار بنایا جا رہا ہے۔ جو کراچی کے گرد و نواح میں بنائے جا رہے ہیں اور اسے جدید سامراجیوں کا اکیسویں صدی کا ہانگ کانگ بنایا جا رہا ہے۔

اب صرف وہی طاقتیں امریکی سامراج کی مخالفت کے لئے رہ گئی ہیں جو ابھی کل تک کلاشنکوفیں ہاتھوں میں تھامے ہیروئن اور ہتھیاروں کی تجارت سے ملنے والے ڈالروں کو سنبھالے افغانستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں امریکہ کے سب سے بڑے حریف سوویت یونین کو نیچا دکھلانے کے لئے اندرونی اور بیرونی طاقتوں کے زیر دست تعاون اور اتحاد سے بیسویں صدی کا عظیم کارنامہ انجام دے رہے تھے۔

نئے ابھرتے ہوئے پاکستانی سرمایہ دار، جو ابھی تک کھلی لوٹ مار کے ذریعے اپنی نشوونما کر رہے تھے وہ بھی اپنی نحیف آواز امریکی سامراج کے خلاف اٹھا رہے ہیں وہ یہ سمجھ چکے ہیں کہ آخرکار امریکہ نے پاکستان میں اپنے استحصالی مفادات کے حصول کے لئے فی الحال بے نظیر سے تعاون کیا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ امریکی امداد کے بغیر پاکستان کی نئی سرمایہ داری کی ترقی اور نشوونما نہیں ہو سکتی۔

لیکن ہمارے حکمران اور دانشور اس سرطان زدہ نئی صورت حال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں جیسا کہ انہیں زندگی بھر کا نصب العین حاصل ہو گیا ہو۔ اور سرمائے کی دیوی کے سامنے ہاتھ باندھے اس کی پوجا کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کا کوئی سہارا نہیں۔ وہ دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکے ہیں اور ہماری سرزمین پر بیرونی سرمائے کا وارد ہونا ان حالات میں محض اللہ کی دین ہے۔ پہلے ہی ہمارا انگ انگ بیرونی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اب بیرونی سرمائے نے ہماری پاک سرزمین پر قدم رکھ ہی دیئے ہیں تاکہ ہمیں اسی دلدل سے نکالا جا سکے جس میں ہم بری طرح پھنس چکے ہیں تو حرج ہی کیا ہے؟ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ ہماری تمام زندگی بیرونی قرضوں کے ساتھ گذری ہے اب تو کوئی ایسی آواز بھی نہیں جو اس قہر کے خلاف اٹھ سکے۔ وہ حکمران جو کچھ کر سکتے ہیں اور وہ دانشور جو کچھ کرنے کی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں سبھی سرمائے کی زبردست چمک کے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور بیک آواز اس کی مدح سرائی میں لگے ہوئے ہیں خدا ہم پر رحم کرے اور امن عافیت سے ہمارا دامن بھرے۔ ہم کر ہی کیا سکتے ہیں سوائے اس کے خدا کے حضور میں سر بسجود ہوں۔

نج کاری کیوں؟

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سامراجی تنظیموں' سرمائے کے عالمی فنڈ' عالمی بنک اور دیگر اداروں نے پس ماندگی غربت' جہالت ناخواندگی وغیرہ کا تیر بہدف علاج نج کاری (پرائیویٹائزیشن) کو قرار دیا ہے اور جن ملکوں میں اپنے سرمائے کے زور پر انہوں نے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں وہاں اپنے اثر و رسوخ اور دباؤ کے ذریعے کمزور اور پس ماندہ حکومتوں کو پبلک سیکٹر میں لگی ہوئی صنعتوں کی نج کاری کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور بعض اوقات مزید قرضے نہ دینے کی دھمکی دے کر اپنے تجویز کنندہ راستے پر ملکی معیشت کو استوار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بھاری مینڈیٹ سے منتخب ہونے والی نواز شریف کی حکومت پر بھی پبلک سیکٹر کی صنعتوں کی نج کاری کے لئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ پاکستان حکومت پچھلے چالیس برس میں لئے گئے سامراجی اداروں کے قرضوں کے بوجھ کی وجہ سے لاچار ہے اور بخوشی ان کے احکامات پر عملدرآمد کرنے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ اور اپنی گرتی ہوئی ساکھ اور تہ و بالا شدہ معیشت کو سہارا دینے کے لئے اندھا دھند طریقے سے نج کاری کے راستہ پر چل پڑی ہے۔ نواز شریف کی پہلی حکومت کے دوران بھی کافی صنعتوں پر نج کاری کا کلہاڑا چلایا گیا تھا۔ جن سے 4 ارب روپے وصول ہوئے تھے۔

23 مئی 1997ء کو وزیراعظم نواز شریف نے پرائیویٹائزیشن کمشن کو ہدایت کی کہ وہ نج کاری کے عمل کو تیز کر دے اور حکم دیا کہ پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن کمپنی لمیٹڈ (پی ٹی سی ایل) پاکستان سٹیٹ آئیل (پی ایس او) اور آئیل اینڈ گیس ڈیویلپمنٹ کارپوریشن (او جی ڈی سی) سوئی ناردرن گیس پائپ لائینز لمیٹڈ (ایس این پی ایل) سوئی سدرن گیس کمپنی (ایس ایس جی سی) کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (کے ایس ایس سی) پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن (پی این ایس سی) نیشنل ٹینکرز کمپنی (این ٹی سی) پاکستان ریلویز' ایریا الیکٹرک سٹی بورڈز (اے ای بی ایس) ہیوی میکینیکل کمپلکس (ایچ ایم سی) تمام بنک' فنانشل ادارے اور کئی

دوسرے صنعتی یونٹ ایک سال کے اندر اندر پرائیویٹائز کر دیئے جائیں۔" اس سے پہلے مرکزی سیکرٹری شاہد جاوید برکی نے کہا کہ عالمی بنک کی تجویز کے مطابق ریلوے کے سکولوں، ہسپتالوں اور پولیس کو 9 ماہ کے اندر اندر دوسرے اداروں کے سپرد کر دیا جائے گا اور سٹیل شاپ، کیرج شاپ، لوکو شاپ اور دوسری شاپیں دو سال کے اندر اندر پرائیویٹائز کر دی جائیں۔ میو گارڈنز اور ریلوے کی وافر زمین بیچ کر مزدوروں کی پنشنوں کا بندوبست کیا جائے گا اور بے روزگار ہونے والے مزدوروں کو معاوضہ دیا جائے گا۔

اس وسیع پیمانے پر نج کاری کا یہ بھیانک اعلان محنت کشوں کی روٹی روزگار پر براہ راست حملہ ہے اور گھر پھونک تماشا دیکھنے والی بات ہے۔ اتنے بڑے اہم اقدام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ اثاثے بیچنے سے جو رقم حاصل ہو گی اس سے پاکستان کے قرضے اتارے جائیں گے۔

یہ نج کاری کیا ہے؟ قرضہ دینے والے سامراجی اداروں کی طرف سے اس سلسلہ میں اس قدر دباؤ کیوں ڈالا جا رہا ہے؟ نج کاری کے فوری اور دیرپا اثرات کیا مرتب ہوں گے۔ ان سوالات پر غور کرنا ضروری ہے۔ نج کاری دراصل بے روک ٹوک اور بے لگام سرمایہ داری نظام کا دوسرا نام ہے۔ نج کاری کوئی نئی دریافت نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی امرت دھارا ہے جس سے ہر مرض کو شفا ہو سکتی ہے۔

دراصل جب سرمایہ داری نظام کی شروعات ہوئیں تو وہ نجی سرمایہ داری نظام سے ہی ہوئی تھیں اور ایک طویل عرصہ تک سماج کی ترقی صرف اسی نظام کے بل بوتے پر ہوتی رہی۔ اس نظام کے اندرونی تضادات کی وجہ سے ہر آٹھ دس سال بعد سرمایہ دار ملکوں کی معیشت سخت بحرانوں سے دوچار ہوتی رہی۔ لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد روس میں سوشلسٹ انقلاب برپا ہوا تو پیداوار اور اس کی تقسیم کے نئے طریقے اختیار کئے جانے لگے۔ جن سے بیشتر ذرائع پیداوار ریاست کی تحویل میں آ گئے اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے پیداوار اور اس کی تقسیم کی جانے لگی اور سویت روس میں تعلیم اور علاج مفت مہیا ہونے لگا۔ 1930ء تک ملک سے بے روزگاری بالکل ختم کر دی گئی اور ہر خاندان کو مکان مہیا کرنا ریاست کا فرض قرار دیا گیا۔ یہ سب اصلاحات صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے اور بڑے بڑے جاگیرداروں کی زمین کسانوں میں تقسیم کرتے اور پھر مشترکہ فارم بنانے سے وجود میں

آئیں۔

اس کے برعکس سرمایہ داری نظام والے ممالک 31-1929ء میں سخت بحرانوں میں پھنس کے رہ گئے۔ لاتعداد کارخانے بند ہو گئے۔ کروڑوں محنت کش بے روزگار ہو گئے۔ منڈیاں تیار مال سے بھر گئیں اور اسے خریدنے والا کوئی نہ رہا اس بحران نے بے شمار سرمایہ داروں کو دیوالیہ کر دیا لوگ بے سرو سامان ہو گئے اور بھوک اور بے روزگاری نے ان کی زندگی اجیرن کر دی لیکن اس کے برعکس سویت یونین کا نظام ایسے بحران سے قطعاً" دوچار نہیں ہوا۔ اس بحران کا علاج ایک برطانوی اکانومسٹ لارڈ کینز نے یہ ڈھونڈا کہ پیداوار اور ملازمتیں بڑھانے اور منڈی کو وسیع کرنے کے لئے ریاست خود آگے بڑھے اور اپنی نگرانی میں تعمیرو ترقی کے منصوبے بنا کر ان پر ریاستی سرمایہ لگائے تاکہ بے روزگاروں کو روزگار مل سکے اور وہ اپنی اجرتوں سے منڈیوں سے سامان خرید سکیں تاکہ بند کارخانے چل سکیں اور ان کا تیار کردہ مال بک سکے۔ یہ طریقہ کار آزمائش پر پورا اترا اور صنعتی ترقی کو سہارا مل گیا اور آہستہ آہستہ معاشی بحران کم ہونے لگا۔ فاشسٹ اور نازی حکومتوں نے اپنے بحرانوں پر قابو پانے کے لئے اور منڈیوں کے حصول کے لئے ان ملکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جو پہلے سے پسماندہ ممالک کی منڈیوں پر قابض تھے۔ جنگ کے دوران فاشسٹ درندوں کو شکست دینے اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے دوسرے سامراجی ملکوں نے اپنے طور پر اسلحہ اور دوسرا ضروری سامان پیدا کرنے کے لئے حکومت کی ملکیت میں کارخانے لگائے یا نجی سرمایہ داروں کو سرمائے کی مدد اور دوسری بے شمار سہولتوں سے نوازا۔

سویت یونین جو خود بھی پسماندہ ملک تھا اور ابھی تک ترقی کے ابتدائی مراحل میں تھا نے منصوبہ بندی کے ذریعے پیداوار بڑھانے' بے روزگاری کو ختم کرنے اور ملکی آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے منفرد کردار ادا کیا۔ ہٹلری فوجوں کے سامنے یورپ کے ممالک نہ ٹھہر سکے حتیٰ کہ فرانس پر بھی جرمن فوجوں نے قبضہ کر لیا لیکن سویت یونین نے نہایت بے جگری سے منصوبہ بندی کے تحت اتحادیوں سے مل کر فاشسٹ فوجوں کا مقابلہ کیا اور ان کو شکست فاش دی۔ اس جنگ میں سویت یونین کے دو کروڑ اشخاص ہلاک ہوئے 70 ہزار فیکٹریاں تباہ ہوئیں اور لاکھوں مکانات زمین بوس ہو گئے۔ سماج کے سبھی تانے بانے تہس نہس ہو گئے۔ لیکن سویت یونین نے اپنی منصوبہ بندی کے تحت 1953ء تک نہ صرف اپنی

تباہ شدہ معیشت بحال کر لی بلکہ 52-1950ء میں ایٹم بم بنا کر سب سے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک امریکہ کا ہم پلہ بن گیا۔ پچھلی عالمی جنگوں میں امریکہ نہ صرف محفوظ رہا بلکہ جنگوں کے دوران پرامن ماحول میں پیداوار بڑھانے کے لئے اس کی سائنس اور پیداواری ذرائع نے بے انداز ترقی کی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد پس ماندہ نو آزاد ممالک اور خود سرمایہ دار ممالک میں سویت یونین کے محنت کشوں کی جدوجہد اور معاشی منصوبہ بندی سے مرعوب ہو کر پبلک سیکٹر میں بے شمار صنعتوں اور اداروں کو ترقی دی اور بہت سی پہلے سے موجود صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ سویت یونین میں اس منصوبہ بندی کی معیشت میں جو رعائتیں اور سہولتیں (روزگار کی ضمانت' مفت علاج' مفت تعلیم اور مکان کے حصول وغیرہ) محنت کشوں نے حاصل کی تھیں مغربی سرمایہ دار ملکوں اور نو آزاد پس ماندہ ممالک کے حکمرانوں نے سویت یونین کی اس معاشی منصوبہ بندی سے متاثر ہو کر پبلک سیکٹر میں نئی صنعتیں قائم کیں اور ان ملکوں کی ترقی کے لئے منصوبہ بندی پر مبنی معیشت کو اپنی پالیسی بنا لیا۔

امریکی سامراج اور اس کے حواری مغربی سرمایہ دار حکومتیں اور جاپان اسی حقیقت سے بہت خائف تھے کہ سویت سوشلسٹ نظام کے تحت محنت کشوں کو جو سہولتیں میسر آئی ہیں وہ سرمایہ دار ملکوں میں محنت کشوں کے لئے ایک نمونہ بن گئی ہیں۔ باوجودیکہ دوسری جنگ عظیم میں وہ سویت یونین کے اتحادی تھے لیکن اندرون خانہ ان کی یہ پالیسی رہی کہ ہٹلری فاشسٹ فوجوں کے ساتھ اس کی جنگ طویل ہو تاکہ وہ جنگی تباہی سے نڈھال ہو جائے اور پھر اٹھنے کے قابل نہ رہے لیکن اپنی اس حکمت عملی میں وہ فیل ہو گئے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سویت یونین سے انسپائر ہو کر محکوم ملکوں کی تحریک آزادی کامیابیوں سے ہمکنار ہونے لگی اور پبلک سیکٹر میں صنعتوں کا قیام نو آزاد ممالک کی پالیسیوں کا حصہ بن گیا ان میں سے اکثر ملکوں نے ترقی کا غیر سرمایہ دارانہ راستہ اختیار کر لیا۔ ویت نام کی جنگ نے امریکی سامراج پر یہ آشکار کر دیا کہ جنگی میدان میں اسے شکست نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ سویت یونین کے اس نظام کو جس نے نو آزاد ممالک کو انسپائر کیا تھا کو ختم کرنے کے لئے اربوں ڈالر مختلف شعبوں میں خرچ کئے جانے لگے اور اس طرح دوسری جنگ عظیم میں تباہی سے دوچار ہونے والے ملک کو امریکی سامراج نے اسلحہ سازی کی دوڑ میں شامل ہونے پر مجبور کر

دیا اور شازوار جیسے پروگرام بنا کر سویت یونین کی معیشت کو کمزور کرنے لگا اور دوسری طرف سویت یونین کے اندر حکمرانوں کی کمزوریوں، ساکت و جامد پالیسیوں اور روز افزوں کرپشن اور غیر ہردلعزیز افسر شاہی کے نظام سے فائدہ اٹھا کر معاشی میدان میں تعاون کے نام پر اس کی معیشت اور سویت کمیونسٹ پارٹی کی صفوں میں کمال ہوشیاری کے ساتھ اپنے ایجنٹ پیدا کر کے اور افغانستان میں پاکستان کے آمر مطلق ضیاء الحق کے تعاون اور پاکستان کی سرزمین پر بنیاد پرستوں کو تربیت دے کر اور کلاشنکوف اور ہیروئن کی ناجائز تجارت کے ذریعے آخر وہ اپنی دیرینہ حکمت عملی میں کامیاب ہو گیا اور سویت یونین کا نظام اپنے اندر ترقی کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں نہ کرنے کی پالیسی پر کار بند رہ کر زمین بوس ہو گیا اور سویت یونین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ امریکہ ساری دنیا میں تنہا سپرپاور کے طور پر دندنانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں میں سویت یونین کی مثال سامنے رکھتے ہوئے محنت کشوں نے اپنی جدوجہد سے جو رعائتیں اور حقوق حاصل کئے تھے اور "ویل فیر" ریاستیں بنائی تھیں ان میں ان معاشی سماجی رعایتوں کو واپس لینا شروع کر دیا۔ ہر طرف نج کاری کی ڈفلی بجنے لگی۔ برطانیہ کی ٹوری وزیراعظم ماگریٹ تھیچر نے پہل قدمی کر کے محنت کشوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے بنائے گئے قوانین کو بدل دیا۔ اور ان سے بے شمار رعائتیں چھین لیں۔ پہلے چند برس میں اسے بڑی کامیابیاں ہوئیں۔ لیکن حالیہ انتخابات میں جس پیمانے پر ٹوری پارٹی کو شکست ہوئی ہے اس سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ پالیسیاں دم توڑ گئی ہیں فرانس کے نئے انتخابات میں دائیں بازو کو شکست فاش ہوئی اور سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے اتحاد کو عظیم کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ان حالات سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہوا کا رخ تبدیل ہو رہا ہے اور نج کاری کی پالیسیوں کو مشکلات کا سامنا ہے یہی حال دوسرے ملکوں میں ہو رہا ہے۔ اب چین اور روس کے مشترکہ اعلان نے امریکی یونی پولر عالمی نظام کی جگہ ملٹی پولر نظام کی طرح ڈال کر ان امریکی پالیسیوں کو چیلنج کر دیا ہے۔

ہر دور میں عالمی سرمایہ داری نظام نے اپنے آپ کو قائم رکھنے اور مزید ترقی کے لئے نئے نئے راستے نکالے ہیں اور اس نظام میں ایسی لچک پیدا کی ہے کہ یہ نظام کسی نہ کسی طرح اپنے پنپنے اور نہ صرف زندہ رہنے بلکہ مضبوط کرنے کے لئے نئے راستے اختیار کر لیتا

ہے۔

دنیا بھر کے عوام کی جدوجہد نے پرانے طرز کے عالمی سامراجی نظام کو شکست دے دی ہے اور اب سامراج اپنے ہتھیاروں اور طاقت کے بل بوتے پر پسماندہ ملکوں کو براہ راست اپنے قبضہ میں نہیں رکھ سکتا۔ پسماندہ ممالک پر سامراجی طاقتوں کا براہ راست قبضہ ان ملکوں کی دولت، خام مال اور سستی محنت حاصل کرنا تھا اور آج بھی وہ نئے حالات میں اپنے نہایت ہی ترقی یافتہ ذرائع پیداوار اور تکنیکی ترقی اپنے سرمائے کے اداروں عالمی فنڈ اور عالمی بنک اور اس قسم کی دوسری تنظیموں کے ذریعے وہ کچھ حاصل کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ جسے وہ پہلے حاصل کرتے تھے۔ اپنی تجارتی شرائط اور سرمائے کے بل بوتے پر انہوں نے پسماندہ ترقی پذیر ممالک کو اپنی غیر مرئی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ ان کے بین الاقوامی سرمائے کو دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی خام مال اور سستی محنت نظر آتی ہے وہ ان پر عقابوں کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں۔ مشرقی وسطیٰ کا تیل ہو یا افریقہ میں پیدا ہونے والا خام مال ہندوستان اور پاکستان کی سستی محنت ہو یا سنٹرل ایشیا کی معدنیات وہ اپنی گرفت میں لینے کے لئے بے تاب رہتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے منافوں میں سو گنا اضافہ کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ جن ملکوں کا وہ استحصال کرتے ہیں ان کو بھی تھوڑی بہت ترقی کرنے کے لئے قرض دیتے رہتے ہیں تاکہ ان میں نیا خون پیدا ہو جو ان کی بڑھتی ہوئی پیاس اور ہوس ذر بجھاتا رہے۔

اس نئے نظام کو قائم کرنے کے لئے وہ الیکٹرانک ذرائع کو خوب خوب استعمال کر رہے ہیں اور خیالات کی دنیا میں اپنے مفاد کے لئے نئے نظریات پیش کر کے پڑھے لکھے لوگوں کو اپنے چمکدار جال میں پھنسا رہے ہیں۔ سویت یونین کے زوال کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے فلاسفروں کے ذریعے یہ پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ اب دنیا میں نظریاتی جنگ ختم ہو گئی ہے اور دنیا میں نظریات کے مجسمے تہس نہس ہو رہے ہیں۔ سب نظریات باطل ثابت ہو گئے ہیں۔ طبقاتی جدوجہد کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اب تو محض سرمایہ دارانہ طریقہ سے پیداوار بڑھانا اور لوگوں کو یہ سکھانا ضروری ہے کہ موجودہ نظام ہی انسانی ترقی کی معراج ہے اور یہی تاریخ کا آخر ہے۔ اس نظام کے اندر رہ کر ہی ترقی کی جا سکتی ہے اور نج کاری اس نظام کی بنیاد ہے۔ لہٰذا ہر طرف نج کاری کا طوطی بول رہا ہے۔ مساوات اور دولت کی مساویانہ تقسیم

محض ایک واہمہ ہے۔ انسان بنیادی طور پر خود غرضی کا پتلا ہے۔ خود غرضی اس کی سرشت میں ہے اور یہ اس کی گھٹی میں شامل ہے۔ لہٰذا اسے ختم کرنے کا آدرش محض ہوائی بات ہے۔ دنیا کے رہنماؤں نے بار بار اس آدرش کو اپنانے کی کوشش کی لیکن آخر دنیا پھر خود غرضی کے محور کی طرف چلی جاتی ہے۔ باہمی چھینا جھپٹی اور لوٹ مار ہی انسانی ترقی کو آگے کی طرف لے جاتی ہے۔ اس نظام کو ختم کرنے کی جدوجہد کو اپنانے کی بجائے اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہی بہتر ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ داری نظام میں پرانی طرز کا مزدور ناپیدا ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح وہ مزدور جسے سوشلسٹ انقلاب کا ہراول دستہ کہا جاتا ہے سرے سے ہی ناپیدا ہو رہا ہے اور اس کی جگہ تعلیم یافتہ' ہنرمند اور سفید پوش کاریگر اور ٹیکنیشن لے رہے ہیں۔ اس لئے مزدور انقلاب کی بات کرنا محض ایک واہمہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں پیداواری عمل انتہائی ترقی یافتہ ایجادات کی بنیادوں پر استوار ہو رہا ہے زیادہ سے زیادہ محنت کش فالتو ہوتے جا رہے ہیں۔ بے روزگاری بڑھتی جا رہی ہے اور ٹیکنیکل سٹاف کی مراعات بھی کم ہوتی جا رہی ہیں اور وہ بھی بے روزگاری کے عمیق گڑھے میں دھکیلے جا رہے ہیں اور محنت کشوں کی صفوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں سفید پوش ٹیکنیکل سٹاف بھی اپنے مفادات کے حصول کے لئے جدوجہد کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ امریکہ میں ایسا سٹاف بے شمار شعبوں میں ہڑتالوں کے ذریعے اپنے مطالبات منوا چکا ہے۔ امریکہ میں ان حالات میں زیادہ سے زیادہ بوجھ سیاہ فام افریقن امریکیوں اور ہسپانوی مزدوروں پر ڈالا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ حلقے بھی منظم ہو رہے ہیں۔ ان روز افزوں ہڑتالوں اور جدوجہد نے ایک بار پھر اے ایف ایل اور سی آئی او (امریکہ کی دو بڑی مرکزی ٹریڈ یونینیں) کو حرکت میں آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ تنظیمیں بیس پچیس سال پہلے متحد ہونے کے بعد سے خاموشی سے دفتری کاموں میں لگی ہوئی تھیں اور نظریاتی طور پر سمجھتی تھیں کہ اس دور میں ٹریڈ یونین کا کام صرف خط و کتابت اور محضر ناموں کو پیش کرنے تک محدود رہے گا لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا گو وہ ابھی تک پورے زور شور سے جدوجہد کے راستہ پر نہیں چل رہیں لیکن ایک طویل خوابیدگی سے بیدار ہونا اور اپنی پرانی لیڈرشپ کو انتخاب کے ذریعے بدل دینا اس بات کی

دلالت کرتا ہے کہ ان کا مفروضہ نقش بر آب اور عارضی ثابت ہوا ہے۔ فرانس اور اٹلی میں ایسے سفید پوش ٹیکنیکل سٹاف کی وسیع پیمانے پر ہڑتالیں بھی اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ یہ نظریہ باطل ہے۔ ہندوستان میں ایوی ایشن کے پائلٹوں نے اور دوسرے ٹیکنیکل سٹاف کی کامیاب طویل ہڑتال سے بھی یہی سبق اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ہڑتال اس وقت تک ختم نہیں ہوئی جب تک ان کے مطالبات پورے نہیں کئے گئے۔ پچھلے نصف عشرہ میں پاکستان کے اندر بھی سفید پوش ملازمین نے مہنگائی کے خلاف تنخواہیں بڑھانے کے لئے مال روڈ لاہور پر ننگے پیٹ بڑی جی دار ہڑتالیں کیں اور جلوس نکالے۔

امریکی سامراج کی کامیاب حکمت عملی اور سویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی بدلتے ہوئے حالات میں ساکت و جامد پالیسی اور شخصی حاکمیت کے غلط انداز کی وجہ سے سویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد وسیع پیمانے پر نج کاری کی پالیسیوں نے روسی عوام کو بھوک اور بے روزگاری کے کھڈ میں پھینک دیا ہے۔ اکتوبر 1917ء کے انقلاب کی کامیابی نے جو سہولتیں اور مراعات' مفت تعلیم و علاج' مکانات کے حصول کے سلسلہ میں فراہم کی تھیں اور غلاظتوں سے پاک زندگی مہیا کی تھی وہ یک لخت ختم ہو گئی ہیں اور سرمایہ داری نظام کی تمام بدعتیں' بے روزگاری' فحاشی' چوری' ڈاکے' منشیات کا عام استعمال' بلیک مافیا اور قبضہ گروپوں کا سماجی زندگی پر قبضہ اور آمدنیوں اور سہولتوں میں بے انتہا تفاوت نے پھر سے روسی عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے اور نج کاری کی برکتوں کے جو قصیدے گائے گئے تھے وہ دم توڑ چکے ہیں اور عوام اپنے رہنماؤں کی غداری کی وجہ سے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان پر حقیقت کا انکشاف ہو رہا ہے۔ روسی کارکنوں کی وہ بڑی بڑی یونینیں جنہوں نے یلسٹن کی لفاظی سے مرعوب ہو کر اس کی پالیسیوں کو لبیک کہا تھا اور اس کے حق میں ہڑتالیں اور مظاہرے کئے تھے اب اس کے برعکس کئی کئی ماہ کی بقایا تنخواہوں کے حصول اور بے روزگاری کے خلاف اور کھوئی ہوئی سہولتوں کے خلاف جدوجہد کرتی نظر آتی ہیں۔

پاکستان میں نج کاری کی پالیسی نہ حل ہونے والے تضادات کا شکار ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہمہ گیر بحران کی وجہ سے ایک طرف تو چار ہزار کے قریب نجی شعبے میں فیکٹریاں اور کارخانے بند پڑے ہیں اور لاکھوں محنت کش بے روزگاری کا شکار ہیں اور بے روزگار

مزدور خود کشی پر مجبور ہو رہے ہیں۔ بچوں کو ذبح کرنے کے سوا کوئی راستہ انہیں نظر نہیں آتا۔ جسم فروشی اک نئی صنعت کا روپ دھار چکی ہے اور سماجی ناہمواری اور بے روزگاری تشدد اور لوٹ مار کو جنم دے رہی ہے۔ اور دوسری طرف عالمی سرمایہ داری کے اداروں عالمی بنک اور مالیاتی فنڈ کے دباؤ اور دھونس کی وجہ سے پاکستان میں پبلک سیکٹر میں لگی ہوئی صنعتوں کی بڑے پیمانے پر نج کاری کی جا رہی ہے۔ اس دباؤ کے علاوہ پاکستان کی مختلف حکومتیں قرضوں کی قسطیں ادا کرنے کے لئے بھی نج کاری کر کے ہی اپنا بوجھ ہلکا کرنے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں شروع سے ہی پبلک سیکٹر میں لگائی گئی صنعتوں کو نجی سرمایہ داروں کو نوازنے کے لئے بیچا جاتا رہا ہے۔ پی آئی ڈی سی کی لگائی ہوئی صنعتیں جب اپنے خرچ وغیرہ اتار لیتی تھیں اور منافع دینے لگی تھیں تو انہیں نجی سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا۔ نواز شریف کی پچھلی حکومت 92-1990ء کے دوران بھی پبلک سیکٹر کی صنعتوں کو بیچ کر چار ارب روپے کے قریب حاصل کیا گیا۔ صنعتیں اونے پونے حساب سے نجی سرمایہ داروں کو بیچ دی گئیں۔ منشا گروپ کو جو میاں صاحب کے بہت قریب ہیں' سیمنٹ کے کارخانے جو منافع پر چل رہے تھے تخمیناً" آدھی قیمت پر بیچ دیئے گئے۔ ان صنعتوں کو بیچتے وقت صاحبان اقتدار نے بڑے پیمانے پر دھاندلی کی اور خفیہ طریقے سے اپنے بنک بیلنس بنا لئے۔ ان میں کچھ لوگ جیلوں میں ہیں لیکن ملک و قوم کو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ رقم تو انہوں نے ہضم کر لی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جاتیں اور انہیں پبلک کے سامنے بطور عوام دشمن پیش کر کے عبرت کا سامان مہیا کیا جاتا۔

اب وزیراعظم نواز شریف نے اعلان کیا ہے کہ اوپر بیان کی گئی بڑی بڑی صنعتوں کی ایک سال کے اندر اندر نج کاری کر دی جائے۔ اور اس طرح جو رقم حاصل ہو اس سے قرض اتارا جائے۔ اتنی قلیل مدت میں اس قدر بڑے اداروں کی نج کاری آسان کام نہ ہے۔ عجلت میں نہ تو ان کی قیمت کے صحیح تخمینے لگائے جا سکتے ہیں اور نہ ہی صحیح گاہک میسر آ سکتے ہیں۔ البتہ بین الملکی کمپنیوں کے ساتھ ساجھے داری کر کے ان تمام صنعتوں کی نج کاری کی جا سکتی ہے۔ لیکن بیرونی سرمائے کو اس طرح ملک کے اندر کھینچ لانا بھی آسان کام نہ ہے۔ بین الملکی کمپنیاں سب سے پہلے ملک کے اندر امن و امان کی صورت حال دیکھتی

ہیں۔ وہ تبھی اپنا سرمایہ لگاتی ہیں جب فضا سازگار ہو۔ ہر طرف امن و امان ہو اور انہیں اپنے سرمائے کے ضائع ہو جانے کا کوئی خطرہ درپیش نہ ہو لیکن بدقسمتی سے پاکستان کے اندر اس وقت جس قسم کے سماجی حالات موجود ہیں وہ بیرونی سرمائے کے لئے مقناطیسی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لئے نج کاری کے لئے پیش کئے جانے والی صنعتوں سے اتنی رقم حاصل نہیں ہو سکے گی کہ جتنی ان سے توقع کی جا رہی ہے۔ نجی سرمایہ داروں کے پاس بھی اتنی رقوم نہ ہیں جو ان صنعتوں کے خریدنے میں لگائی جائیں اور جن کے پاس ہیں وہ کالا دھن ہے۔ جسے وہ موجودہ حالات میں ننگا نہیں کریں گے۔ وہ سرمایہ تبھی لگائیں گے اگر انہیں یقین دہانی کرائی جائے کہ ان کی اس بارے میں پکڑ دھکڑ نہیں ہو گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بجٹ کے اعلان کے ساتھ کالے دھن کو سفید کرنے کے لئے بھی کوئی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ بہرحال حالات سنگین ہیں۔ وسیع پیمانے پر کی جانے والی نج کاری کی پالیسی بھی ہمارے روز افزوں قرضے اتارنے میں ناکام رہے گی۔ وقفے وقفے سے پاکستانی روپے کی قیمت کم کرنے سے اس پالیسی کی ناکامی کے لئے خود بخود حالات پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ پبلک سیکٹر سے نج کاری میں لائے جانے والے کارخانے نج کاری کے ہوتے ہی اپنی پوری صلاحیتوں کے مطابق کام کرنے لگیں گے اور پیداوار بڑھ جائے گی۔ پاکستان میں پہلے ہی چار ہزار کے قریب نجی ملکیت کے کارخانے بند پڑے ہیں اور جو چل رہے ہیں وہ بھی بحرانی کیفیت سے دوچار ہیں۔ اس لئے یہ سوچنا عبث ہے کہ نج کاری کی یہ پالیسی پاکستان کے مسائل کا کوئی حل ہے۔ البتہ ان کی نج کاری سے حکومت کو کچھ وقت کے لئے سہارا ضرور مل جائے گا لیکن یہ سہارا مستقل ثابت نہیں ہو گا ایک طرف تو حکومت گھر بار پھونک کر قرضے اتارنے کا ارادہ رکھتی ہے لیکن ساتھ ہی مزید قرضے لئے جا رہی ہے اور روپے کی قیمت متواتر کم کئے جا رہی ہے جس سے قرضے خود بخود بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

پاکستان میں نجی صنعتیں پنپنے کے لئے ماحول سازگار نہ ہے۔ اس وقت پاکستانی سماج ایک خوفناک گراوٹ کے گڑھے میں اوندھی پڑی ہے۔ رشوت کا بازار ہر طرف گرم ہے۔ بلیک کا بول بالا ہے اور ہر کام دو نمبر کا چل رہا ہے حتیٰ کہ ملک کے اندر گندم کی کمی کی وجہ سے قحط کی سی صورت حال پیدا ہونی شروع ہوئی تو سمگلنگ اور بلیک کرنے والوں نے خوب خوب منافع کمایا اور اپنا سرمایہ دو گنا کر لیا۔ انہیں عوام کی مشکلات سے کوئی سروکار نہیں تھا

وہ تو صرف منافع کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

ان سب حالات کو درست کرنے کے لئے بڑے طمطراق سے احتساب کا نعرہ لگایا گیا تھا لیکن احتساب کے جال سے بڑی مچھلیاں تو پہلے ہی نکل گئی تھیں اور اب جو احتساب کا قانون بنایا گیا ہے وہ صرف 1990ء سے نافذ ہو گا۔ گویا کہ 1990ء سے پہلے کی لوٹ مار کو تحفظ حاصل ہو جائے گا۔

پبلک سیکٹر کی نج کاری کا سب سے بڑا جواز یہ بتایا ہے کہ اس کے بغیر قرضے اتارے نہیں جا سکتے۔ عجیب ماجرا ہے کہ جب حکومت کے علم میں ہے کہ کن لوگوں نے قرضوں کا ناجائز استعمال کیا اور قرضوں سے آدھی رقمیں تو پہلے ہی اور ان واسنگ کر کے بیرونی بنکوں میں جمع کروا لیں اور کچھ نے پرانی مشینری لا کر نصب کر دی اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد کارخانے کے فیل ہونے کا چرچا کر دیا اور قرضہ معاف کروا لیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بڑے لوگوں سے جنہوں نے ملک و قوم کا روپیہ اس طرح کھایا ہے ان سے وصول کیوں نہیں کیا جاتا۔ قرضے معاف کروانے والے اب بھی کارخانوں اور زمینوں اور پلازوں کے مالک ہیں۔ اب بھی نہایت قیمتی کوٹھیوں میں براجمان ہیں اور قیمتی گاڑیاں اور ہوائی جہاز تک رکھے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قرضے کیوں معاف کئے جاتے ہیں۔ کیوں ان کی جائیدادیں ضبط کر کے قرضے وصول نہیں کئے جاتے اور جن بڑے لوگوں نے (جن میں نواز شریف خاندان، چوہدری برادران اور ضیاء الحق کا کنبہ بھی شامل ہے) اربوں روپے بینکوں سے قرضے لے رکھے ہیں اور نادہندہ ہو گئے ہیں اور ایسے قرضوں کی معقول ضمانت بھی نہیں دی ان سے وصولی کرنے کے سخت قوانین کیوں نہیں بنائے جاتے اور پبلک سیکٹر جو عوام کی دولت ہے اس کے پیچھے ہی کیوں ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔

بڑی بڑی صنعتوں اور اداروں کی نج کاری کے اعلانات سن کر محنت کشوں میں بے چینی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ حکومت کی نج کاری کی پالیسی سے ان پر کیا اثر پڑے گا۔ کیا ان کے حالات زندگی بہتر ہو جائیں گے؟ کیا نج کاری کا عمل واقعی ان کی خوشحالی پر منتج ہو گا؟

جہاں تک مزدور طبقے کا تعلق ہے نج کاری کا فوری اثر یہ ہو گا کہ ہزاروں مزدور پہلے ہی مرحلے پر بے روزگار ہو جائیں گے اور موجودہ حالات میں جبکہ بیروزگاری پہلے ہی ہر

طرف منہ پھاڑے کھڑی ہے مزدوروں کو ریاستی عمل سے مزید بے روزگاری سے دوچار کرنا ملک و قوم کے لئے مجموعی طور پر ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ پہلے بھی بے روزگاری کی وجہ سے بے شمار محنت کش خودکشی کا راستہ اختیار کر چکے ہیں۔ بے بسی کے عالم میں بچوں کو ذبح کر کے دریاؤں میں پھینک چکے ہیں۔ پھانسی کے پھندوں میں لٹک چکے ہیں۔ کچھ کلاشنکوفوں کا سہارا لے کر سماج میں افراتفری اور لوٹ مار اور مار دھاڑ پر اتر آئے ہیں۔ لاقانونیت ہر گلی محلے میں پھیل رہی ہے اور انتظامیہ کی کوئی تدبیر اس کے علاج کے لئے کارگر نہیں ہو رہی۔

جو مزدور بے روزگاری سے بچ جائیں گے ان کی بے شمار سہولتیں جو انہوں نے ٹریڈ یونین کی جدوجہد کے ذریعے حاصل کی تھیں ایک ایک کر کے واپس لے لی جائیں گی اور پنشن وغیرہ کی سہولتیں چھن جائیں گی۔ ان کی زندگی مزید عدم تحفظ سے دوچار ہو جائے گی۔ ٹریڈ یونین کے حقوق بھی چھینے جائیں گے اور ٹریڈ یونین قوانین میں جو رعائتیں یا حقوق مزدوروں کو دیئے گئے ہیں واپس لے لئے جائیں گے۔ نج کاری کے ذریعے خریدنے والے سرمایہ دار اگر مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے وعدے بھی کریں پھر بھی ان کے حقوق کے خلاف سب سے پہلے تلوار چلائیں گے اور حکومت جس میں سرمایہ داروں کی اکثریت ہے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں پرانے قوانین کے ہوتے ہوئے بھی ان کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ مزدوروں کی تنظیموں کو مختلف حربوں سے نہایت ہی ہوشیاری اور چالاکی سے کمزور کرتے رہیں گے اور منظم سیمیناروں کے ذریعے انہیں محض خط و کتابت تک محدود ٹریڈ یونین کا فلسفہ سکھائیں گے۔ لیکن ایسی کمپنیاں جدید ترین مشینری کے ذریعے پیداوار کریں گے اور ان میں کم سے کم مزدور کھپائے جائیں گے اور بے روزگاری کے مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ کر دیا جائے گا۔

انہی وجوہات کی بنا پر محنت کش طبقے نج کاری کے خلاف پرچم اٹھائے ہوئے ہیں لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان کی ٹریڈ یونین بہت کمزور ہیں اور کوئی مضبوط سیاسی پارٹی ان کی پشت پناہی کرنے والی نہیں ہے۔ ٹریڈ یونین تحریک میں بھی بہت گراوٹ آ چکی ہے۔ وہ پرچم تو ضرور بلند کرتے ہیں اور مطالبات کے لئے نعرے بھی بھرپور لگاتے ہیں لیکن ان کی کشتی کنارے نہیں لگتی کیونکہ ان کے اکثر رہنما بددیانت اور خودغرض اور جو دیانتدار ہیں وہ ان

گھمبیر حالات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بین الاقوامی سامراج کی حکمت عملی اور پراپیگنڈہ اس قدر ہمہ گیر اور تیز ہے کہ اس نے ان کے خیالات اور نظریات کو ماؤف کر دیا ہے۔ پچھلے تلخ تجربات کی وجہ سے ان کی سوچ اور نظریات مضمحل ہو چکے ہیں وہ کچھ کرنے کی خواہش تو ضرور کرتے ہیں لیکن اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر ہیں۔ ٹریڈ یونین کی صفوں میں آجکل جو رہنما نظر آتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر فعال اور گرجدار آواز میں بات وہ کرتے ہیں جنہوں نے یونین بازی کو پیشہ بنا رکھا ہے۔ ٹریڈ یونین سے ہی ان کی روزی اور روزگار چلتا ہے۔ لہٰذا وہ کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی مزدوروں کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس سے یہ امید رکھتے ہیں کہ اس جدوجہد سے وہ کیا کما سکتے ہیں۔ بعض اوقات وہ سرمایہ داروں یا حکومت سے مل بھی جاتے ہیں اور مزدوروں کے مفادات کا سودا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

دوسرے وہ ٹریڈ یونین لیڈر ہیں جو کسی سیاسی پارٹی یا گروپ کے پروردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اس سیاست کو نبھانے کے لئے جلسے جلوسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور پارٹی کی پالیسی کے مطابق کام کرتے رہتے ہیں۔

تیسرے ایسے لیڈر ہیں جنہیں لاکھوں روپے کی ماہوار مقررہ آمدنی ہو جاتی ہے۔ وہ بائیس گریڈ کے افسروں کے برابر کی تنخواہ اور دوسری سہولتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اس آمدنی کو حلال کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں۔ ایسے رہنما بھی ہر وقت سمجھوتہ بازی کی راہ اختیار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں کیونکہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر وہ کچھ نہ کریں تو سرپھرے عناصر یونین کو ان کے ہاتھوں سے چھین لینے کے لئے تیار بیٹھے ہیں اور وہ کسی بھی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے اور ان کی بربادی کا موجب بنیں گے۔

چنانچہ جب سے پاکستان میں نج کاری کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی شروعات ہوئی ہیں حکومت اس پالیسی کو قدم بہ قدم کامیاب کرنے میں سرخرو ہوئی ہے۔ سب سے پہلے جی ٹی روڈ لاہور پر کیمیکل اور دوسری صنعتوں کی نج کاری شروع کی گئی مزدوروں نے کچھ عرصہ بھرپور جدوجہد کی۔ جلسے کئے جلوس نکالے۔ اشتہار چھاپے لیکن آخرکار ان کی جدوجہد گولڈن شیک ہینڈ پر منتج ہوئی۔

پی آئی اے کی یونین بے نظیر کی دوسری بار حکومت قائم ہونے سے پہلے نج کاری کے خلاف بہت سرگرم رہی ہے۔ لیکن جونہی پیپلز پارٹی کی حکومت دوبارہ برسر اقتدار آئی ساری سرگرمیوں کو بغیر کسی اعلان کے خیر باد کہہ دیا گیا۔

پھر کوٹ ادو پاور سٹیشن کی نج کاری کے لئے اقدامات کئے گئے۔ کوٹ ادو پاور سٹیشن کے محنت کشوں نے تقریباً چھ ماہ تک نج کاری کے خلاف زبردست جدوجہد کی اور پاور سٹیشن کو کافی عرصہ تک اپنے قبضہ میں رکھا۔ لیکن ہائیڈرو الیکٹرک یونین کے رہنماؤں کی مداخلت سے گولڈن شیک ہینڈ ہو گیا۔ ہائیڈرو الیکٹرک یونین کے رہنما پاکستان بھر کے مزدوروں کی مختلف ٹریڈ یونین فیڈریشنوں کو ایک کنفیڈریشن میں متحد کر کے نج کاری کے خلاف بڑے بڑے جلسے اور جلوس منظم کر رہے ہیں۔ اور نج کاری کے خلاف جدوجہد میں ہر قسم کی قربانیاں دینے کا اکثر اعلان کرتے رہتے ہیں۔ عام محنت کشوں کو امید تھی کہ وہ کوٹ ادو پاور سٹیشن کو نج کاری سے بچانے کے لئے کوئی بڑا ایکشن کریں گے جو ان کی تند و تیز جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کر دے گا۔ محنت کشوں کی صفوں میں یہ بھی سوچا جاتا تھا کہ یہ یونین اس قدر مضبوط اور منظم ہے کہ اگر وہ دو گھنٹے کے لئے بھی بجلی بند کر دے تو شاید کوٹ ادو کے مزدوروں کا مطالبہ پورا ہو جاتا۔ اور مقامی تحریک ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل اختیار کر لیتی جو پاکستان کے موجودہ حالات میں ایک بہت بڑا اقدام ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور رہنماؤں نے گولڈن شیک ہینڈ کے ذریعے کوٹ ادو پاور سٹیشن کی نج کاری کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔

یہ عجب ماجرا ہے کہ کنفیڈریشن کے پلیٹ فارم سے جو رہنما وقتاً" فوقتاً" آواز اٹھاتے رہتے ہیں وہ سب کے سب نج کاری کرنے والی کمیٹیوں کے ممبر بن جاتے ہیں اور نج کاری آسان طریقے سے عمل میں لانے کے لئے انتظامیہ اور حکومت کی مدد کرتے نظر آتے ہیں۔

ان کے اس رویہ سے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں کہ آیا نج کاری کے خلاف ساری جدوجہد کا منتہائے مقصود یہی ہوتا ہے کہ وہ آخر میں نج کاری کمیٹیوں کے ممبر بن کر نج کاری کروانے میں مددگار بن جائیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر جلسے جلوسوں اور پریس کانفرنسوں کے ذریعے نج کاری کے خلاف بلند بانگ دعوے کیوں کرتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک طرف تو انتظامیہ اور حکومت پر دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ نج کاری کے وقت مزدوروں کے مفادات کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جائے۔ دوسرے وہ مزدوروں میں اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے

اس قدر تند و تیز تقریریں کرتے ہیں تاکہ ان کا بھرم قائم رہے اور نج کاری کے بعد بھی وہ ان اداروں کی یونینوں کے رہنما بنے رہیں۔

پاکستان میں 1948ء سے ہی ٹریڈ یونین کے کچھ رہنما امریکی سامراج کی سرد جنگ میں حکمت عملی کا آلہ کار بنے رہے ہیں۔ امریکی سامراج نے جب ورلڈ فیڈریشن آف ٹریڈ یونین جو 1945ء میں قائم ہوئی اور دنیا بھر کے مزدوروں کی واحد تنظیم تھی کو تقسیم کرنے کے لئے ورلڈ کنفیڈریشن آف فری ٹریڈ یونینز بنائی تو انہوں نے پاکستان میں اس پالیسی کو عملی جامہ پہنایا۔ امریکی سامراج نے ایسے رہنماؤں اور ان کی تنظیموں کو بہت نوازا اور ان کی روپے پیسے سے بڑی مدد کی اور انہیں پریس اور ٹائپ رائٹر وغیرہ مفت فراہم کئے گئے۔ اس کے برعکس پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے کارکنوں اور رہنماؤں کو جیلوں اور شاہی قلعہ میں بند کیا گیا اور 1954ء میں غیر قانونی قرار دے دیا۔ چنانچہ ورلڈ کنفیڈریشن آف فری ٹریڈ یونینز پاکستان بھر میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ان رہنماؤں کو سامراجی قوتوں اور پاکستان حکومت کی ہمدردیاں اور تعاون ہمیشہ حاصل رہا اور وہ حکومت اور افسران سے مل کر ٹریڈ یونین کو چلاتے رہے اور عظیم الشان دفاتر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ آج کے حالات میں جبکہ ترقی پسند ٹریڈ یونین ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور ان کے اکا دکا رہنما زندہ رہنے کے لئے ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ محنت کش طبقے ایسی یونینوں کو ہی مرکزی رہنما یا نہ کردار ادا کرنے کے لئے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور موجودہ گئے گزرے حالات میں ان کے زیر سایہ اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ نہ ہونے سے تو کچھ ہونا بہتر ہے۔

تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے معاشرے میں چھٹے اور ساتویں عشرے میں سوشلسٹ بلاک کے اثرات کی وجہ سے صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کے حق میں ہوا چل رہی تھی۔ اور اسی تحریک کو قدم قدم پر کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ آج جبکہ امریکی سامراج اور اس کی حواری طاقتیں بے پناہ وسائل اور ریشہ دوائیوں اور سویت یونین کی کٹر پن کی شکار لیڈرشپ کی غلطیوں کی وجہ سے کامیاب ہو گئی ہیں اور امریکی سامراج یونی پولر (ایک مرکزی) ورلڈ کا دعویٰ کر رہی ہے اور موجود نہایت ہی ترقی یافتہ سرمایہ داری نظام اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری جو کہ قومی حکومتوں کے سٹرکچر کو کمزور کر کے ملٹی نیشنل کمپنیوں

کا بول بولا کر رہی ہیں پرانی طرز کی ٹریڈ یونین کے پنپنے اور نشوونما پانے کے حالات آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

سوشلزم کی شکست و ریخت اور سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی ہر طرف این جی اوز میدان عمل میں اتر آئی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو تعلیمی میدان میں کام کرتی ہیں۔ کچھ انسانی حقوق کی حفاظت کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں اور کچھ محنت کشوں کو ٹریڈ یونین کے متعلق تعلیم دینے کے لئے کام کر رہی ہیں۔ ایسی تنظیمیں تعلیم حاصل کرنے والے محنت کش طالب علموں کو باقاعدہ روزانہ اجرت دیتے ہیں۔ پوش ہوٹلوں میں قیام اور طعام کا بندوبست کرتی ہیں اور اس طرح تعلیمی سیمیناروں کا بندوبست کرتی ہیں۔ جہاں تک تعلیم دینے کا تعلق ہے یقیناً اچھی بات ہے۔ محدود ایشوز پر انسانی حقوق کا جھنڈا اٹھانا بھی اچھا ہے لیکن پوش ہوٹلوں میں باقاعدہ اجرت دے کر طلباء کی ٹریڈ یونین مسائل کے متعلق تربیت کرنا چونکا دینے والا عمل ہے۔ ایسی تربیت ٹریڈ یونین کی صفوں میں لڑاکو کارکن پیدا کرنے کی بجائے۔ محض خط و کتابت اور چھوٹے موٹے وفود کے ذریعے مسائل کا حل ڈھونڈنے کا راستہ دکھاتے ہیں اور جلسہ، جلوس اور ہڑتالی جدوجہد کے خلاف ذہن ہموار کرتی ہیں اور موجودہ نظام جس میں اس قدر سہولتیں میسر آ سکتی ہیں ان کے حصول کے راستے پر لگا دیتی ہیں اور محنت کشوں کو جدوجہد کے راستہ سے دور لے جانے کا موجب بنتی ہیں۔ آج کی سماج آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک دمک کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ یہ تنظیمیں بیرونی سرمائے سے بیرون ملک تفریحی سیر سپاٹے کا بندوبست کرتی ہیں اور ان کاموں پر لاکھوں روپیہ صرف کرتی ہیں۔ ہمارے علم میں ہے کہ بھٹہ مزدوروں کی ایک چھوٹی سی یونین کے ایک کمرہ کے دفتر کو دو سال چلانے کے لئے کینیڈا کی ایک تنظیم نے ساٹھ لاکھ روپیہ ایک این جی او کو مہیا کیا۔ کئی سال گزر چکے ہیں لیکن اس روپیہ میں سے آج تک اس دفتر پر ایک روپیہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ یوں اچھے بھلے ترقی پسند نوجوانوں کو کرپشن کے راستے پر لگا دیا جاتا ہے۔ قربانی اور ایثار کی بجائے ظاہری نام و نمو کارکنوں کا طرہ امتیاز بن جاتا ہے جس طرح موجودہ دور میں سمگلر، ڈاکو، چور، جعل ساز ہیروئن فروش اور بلیک کرنے والے روپے پیسے کے بل بوتے پر عوام کے لیڈر بن جاتے ہیں ایسے ہی اس قماش کے ٹریڈ یونین لیڈر مزدوروں کو روپے اور ارزاں سہولتوں کی پیشکش کر کے لیڈری سنبھال لیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے تھیلے میں جعل سازی سے

حاصل کئے ہوئے بیرون ملک جانے کے دعوت نامے محفوظ رکھتے ہیں اور بگڑے تگڑے کارکنوں کو انہیں استعمال کرنے کا لالچ دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے بال بچوں کو سیر سپاٹا کرواتے ہیں حالانکہ ان کا ٹریڈ یونین تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اخبارات میں ان کے بیانات بطور بڑے مزدور رہنماؤں کے چھاپے جاتے ہیں ترقی پسند رسائل میں وہ اپنے قصیدے چھپواتے ہیں۔ اس طرح حقیقی ٹریڈ یونین تحریک کو بیرونی طاقتوں کے مہیا کئے ہوئے وسائل کے بل بوتے پر پنپنے نہیں دیتے اور خود کامیابی پر کامیابی حاصل کرتے ہیں اور دیانتدار کارکنوں اور رہنماؤں جنہوں نے زندگی بھر ٹریڈ یونین تحریک میں قربانیاں دیں اور جیلوں اور قلعوں میں مقید رہے کے خلاف من گھڑت جھوٹی کہانیاں بنا کر ان کے امیج کو داغدار کرتے ہیں۔

ان مفت کے بیرونی وسائل کی وجہ سے وہ عیاشی کی دوڑ میں لگ جاتے ہیں اور شراب اور دوسرے لوازمات کے رسیا بن جاتے ہیں اور ترقی پسندی کے نام پر بدیشی مہمانوں کو بھی ایسی عیاشی مہیا کرنے میں عین اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ جھوٹ بولنا اور جعلسازی کرنا اور پھر ان کو چھپانا ان کے کریکٹر کا حصہ بن جاتا ہے۔ وہ ترقی کے زینے پر بڑی تیزی سے چڑھتے ہیں لیکن جلد یا بدیر جونہی ان کی حقیقت کا کارکنوں کو پتہ چلتا ہے تو وہ اپنا جعلی اثر و رسوخ کھو بیٹھتے ہیں۔

لیکن ایسے حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے۔ معاشی اور سماجی بحران نے پاکستان کو اپنے پنجوں میں یوں دبوچ رکھا ہے اور محنت کش طبقوں کی حالت بجائے بہتر ہونے کے دن بدن گراوٹ کی طرف جا رہی ہے اور ان کی محرومیاں برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ یقیناً یہ حالات دیانتدار اور قربانی کرنے والے مخلص رہنماؤں اور کارکنوں کو اپنی صفوں کے اندر سے جنم دیں گے اور بہروپیوں کو مزدوروں کے سامنے ننگا کر دیں گے۔ ان کی عارضی اور سطحی کامیابیاں اور جاہ و جلال زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان نامساعد حالات سے دیانتدار اور عوام دوست کارکن مایوس نہ ہوں اور ایسے فصلی بٹیروں کی یلغار کے سامنے سینہ سپر رہیں اور دھیرے دھیرے اپنی تنظیم جاری رکھیں۔ وہ دن دور نہیں کہ وہ کامیابیوں سے ہمکنار ہوں گے۔

گو موجودہ حالات میں سامراجی پالیسیوں کے تحت سرمایہ دار حکومت کی نج کاری کی

ظالمانہ پالیسی کو شکست دینا بہت مشکل ہے۔ اور محنت کشوں کی صفیں ٹھوس بنیادوں پر منظم نہیں ہیں اور ان کے خیالات شکست خوردگی' مایوسی اور دنیاوی نمو میں کھوئے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی نج کاری کے خلاف جدوجہد کی پالیسی کو اختیار کرنا ہو گا۔ اور جس قدر ہو سکے مزدوروں کے مفادات کی حفاظت میں سینہ سپر ہونا ہو گا تاکہ مستقبل میں محنت کشوں کو معلوم ہو کہ ان کے حقیقی ساتھی کون ہیں۔

پی آر ٹی سی نج کاری کو کامیاب کرنے کے لئے تو 9 اور 10 جون کے درمیان ان کے مظاہرہ کرتے ہوئے رہنماؤں اور مزدوروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ پی آر ٹی سی کی یونین کئی دن سے پنجاب اسمبلی کے سامنے بھوک ہڑتالی کیمپ لگائے ہوئے تھی۔ پولیس نے ان کے کیمپ کو اکھاڑ پھینکا اور لاٹھی چارج کیا۔ اس یونین کے رہنما جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے۔ جماعت اسلامی ان کی جدوجہد کی حمایت کر رہی تھی حکومت نے کئی دنوں سے روزناموں میں پی آر ٹی سی کی ناگفتہ بہ حالت کے متعلق اشتہار دینے شروع کئے جن پر لاکھوں روپیہ لگا دیا۔ لیکن حکومت نے یہ نہیں بتایا کہ پبلک ٹرانسپورٹ کا یہ ادارہ اس قدر تباہ کیسے ہو گیا۔ انہوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ ٹرانسپورٹ کے وزیر اور بڑے بڑے افسر جو بڑی بڑی تنخواہیں لیتے رہے انہوں نے اسی ادارے کو تباہ کرنے میں کیا کردار ادا کیا اور کس طرح انہوں نے اپنے بنگلے تعمیر کئے' بنک بیلنس بنائے۔ اسی سلسلہ میں کوئی تفتیش نہیں کی گئی اور نہ ہی عوام کو اس سے آگاہ کیا گیا۔

اب ریلوے کے عظیم ادارے کی نج کاری کے لئے مختلف کمیٹیاں بنا دی گئی ہیں لیکن ارباب اقتدار نے یہ نہیں بتایا کہ اس ادارے نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں کس طرح مستعدی سے کام لیا۔ کس طرح لاکھوں مہاجروں کو پاکستان کے کونے کونے میں پہنچایا۔ کس طرح ہندوستان کے ساتھ تین جنگوں کے دوران نہایت احسن طریقے سے کام کیا۔ ریلوے انتظامیہ کے اندر بڑے بڑے سفید ہاتھی کس نے پالے۔ ریلوے کے مختلف سیکرٹریوں نے کس طرح لوٹا' افسر شاہی نے من مانیاں کرتے ہوئے کیسے بے شمار ملازمین نجی کاموں پر لگائے۔ لوکل پرچیز میں کس طرح بے انداز غبن کئے۔ بڑے آدمیوں کے لئے کیسے گھوڑے لے جانے والی بوگیاں بنائیں۔ ریلوے افسروں نے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ قائم رکھنے کے لئے سیلونوں کو کیونکر استعمال کیا برانچ لائنوں پر کس کی ملی بھگت سے بلا ٹکٹ سفر کرنے کی

اجازت دی گئی۔ کراچی لاہور راولپنڈی وغیرہ بڑے اسٹیشنوں پر لگے بندوں ٹکٹوں کو بلیک کرنے کی کس نے اجازت دی۔ ورکشاپوں میں جدید مشینری کیوں نہ استعمال کی گئی اور آہستہ آہستہ خام مال فراہم کرنا بند کیوں کر دیا اور بجائے ریلوے ورکشاپوں میں کام کروانے کے ٹھیکیداروں سے سامان باہر سے کیوں منگوایا جاتا رہا۔ ریلوے کی زمینوں پر ریلوے افسروں نے مکانات تعمیر کروا کر کس قدر رقمیں بٹوریں۔ کیرج شاپس کو دوسرے ملکوں کے لئے بوگیاں بنانے کے لئے کیوں استعمال نہ کیا گیا اور ریلوے ورکشاپوں کو انجن اور دوسرے پرزے نجی صنعتوں کو مہیا کرنے کے لئے کیوں نہ بنائے گئے۔ آخر نوکر شاہی کے سفید ہاتھی ان سارے سالوں میں کیا کرتے رہے ہیں؟ کیا وہ ریلوے کے استحصال سے محض اپنی کوٹھیاں بنانے میں لگے رہے ہیں بچوں کی شادیاں دھوم دھام سے کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ ان کا احتساب کیوں نہیں کیا گیا؟ نج کاری کر کے سارا نزلہ محنت کشوں پر کیوں گرایا جا رہا ہے۔

ریلوے ورکرز یونین نے بارہا تعاون کا ہاتھ ان افسرون کی طرف بڑھایا اور یقین دلایا کہ وہ باہمی' ڈسپلن اور قربانی سے اس عظیم ادارے کو بہت بہتر طریقے سے چلانے میں مدد کر سکتے ہیں اور عوام کو بہت سہولتیں فراہم کر سکتے ہیں لیکن ہر بار ریلوے کے بڑے افسروں نے نہایت رعونت سے یونین کی اس پیشکش کو ہمیشہ ٹھکرا دیا اور یہ رویہ اختیار کیا جیسے ریلوے کا یہ ادارہ ان کے باپ دادا کی ملکیت ہو یا انہیں جہیز میں ملا ہو۔

ریلوے ورکرز یونین اس مزدور دشمن اور پاکستان دشمن پالیسی کے خلاف بھرپور جدوجہد کرنے کے لئے تیاری کر رہی ہے اور جو طاقتیں اس جدوجہد کو سابو تاژ کرنے کے لئے ریلوے مزدوروں کی صفوں میں انتشار پھیلانے کے لئے خفیہ کارروائیاں کر رہی ہیں انہیں یقیناً شکست دیں گی۔

محنت کشوں کی پارٹی بناؤ

دنیا بھر میں نج کاری کی یلغار محنت کشوں سے وہ تمام سہولتیں چھین رہی ہے جو انہوں نے پچھلے پچاس سال میں اپنی جدوجہد کے ذریعے حاصل کی تھیں۔

پاکستان میں بھی حکمران طبقے' خواہ وہ نواز شریف کے روپ میں ہوں یا بے نظیر اور زرداری کے روپ میں نج کاری کی اس پالیسی پر گامزن رہیں گے۔ بے نظیر نے اپنی حکومت

کے تین سالوں کے دوران باوجود بار بار وعدے دہرانے کے اپنی لیبر پالیسی کا اعلان تک نہ کیا اور پھر لیبر پالیسی پر میمن کی رپورٹ کو طاق نسیاں پر رکھ دیا۔

نواز شریف تو مزدوروں کے حق میں کوئی لیبر پالیسی دے ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی اپنی صنعتوں کے مفادات ہمیشہ اس کی سوچ پر حاوی رہتے ہیں۔

مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی اب کسی طور بھی محنت کشوں کے مسائل حل نہیں کر سکتیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ محنت کش طبقے بجائے ان کے پیچھے بھاگنے کے اپنی پارٹی بنائیں۔ بار بار آزمائے ہوؤں کو پھر آزمانے کی کوشش نہ کریں۔ ان کی اتنی بڑی اکثریت ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ کسانوں کے ساتھ اپنے اتحاد کو مضبوط کریں اور لٹیرے اور لالچی کارکنوں کی بجائے دیانتدار اور قربانیاں دینے والے ایسے کارکن پیدا کریں جو غلاظتوں' جھوٹ' فریب' دھوکہ بازی' جعل سازی' لوٹ اور استحصال میں گھری سماج کو ظالموں' لٹیروں' سمگلروں' جعلسازوں کے پنجوں سے آزاد کروا کر ایک نئی سماج جو مساوات' دیانتداری' باہمی اخوت و محبت اور بھائی چارے پر مبنی ہو کی تعمیر کے لئے بھرپور جدوجہد کریں۔

محب وطن' مخلص اور دیانتدار سیاسی کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ سب مل کر ایسی پارٹی تشکیل دیں۔